زندگی کے عام فقہی مسائل

جلد سوم

ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی

ترتیب

پیش لفظ ۷

فقہی مسائل

۱- اگر مسجد کا قبلہ صحیح رخ سے تھوڑا ہٹا ہوا ہو ۹
۲- امام کا محراب مسجد میں کھڑا ہونا ۱۰
۳- مساجد میں بچوں کی حاضری ۱۱
۴- چاند تارے والی چٹائیوں پر نماز ۱۶
۵- نماز میں سجدۂ تلاوت ۱۷
۶- فرض نمازوں کے بعد اجتماعی دعا ۱۸
۷- کیا دعاؤں میں پیغمبر کا وسیلہ اختیار کرنا جائز نہیں؟ ۲۱
۸- اردو زبان میں خطبۂ جمعہ ۲۵
۹- اردو خطبہ منبر سے دیا جائے یا نیچے سے؟ ۲۶
۱۰- نمازِ جمعہ کے چند مسائل ۲۷
۱۱- نمازِ عید میں خواتین کی شرکت ۲۹
۱۲- عید الاضحیٰ میں خوشی کا پہلو ۳۳
۱۳- عبادات اور دینی امور میں لاؤڈ اسپیکر کا استعمال ۳۳
۱۴- حالتِ سفر میں جمع بین الصلاتین ۳۵
۱۵- تدفین کے بعد قبر پر تلاوتِ قرآن ۳۶
۱۶- والدین کی وفات کے بعد ان کے لیے دعائے مغفرت ۳۷

۱۷-	زکوٰۃ کی مقدار	۳۹
۱۸-	تبلیغ دین کے کام میں زکوٰۃ کا استعمال	۴۰
۱۹-	ریاستی مظالم کا شکار لوگوں کو چھڑانے کے لیے زکوٰۃ کا استعمال	۴۵
۲۰-	سفرِ حج کے لیے جمع کی گئی رقم پر زکوٰۃ	۴۷
۲۱-	زمین پر زکوٰۃ	۴۸
۲۲-	زکوٰۃ کے چند مسائل	۴۹
۲۳-	روزہ کے چند مسائل	۵۸
۲۴-	سفر میں روزہ	۶۰
۲۵-	اعتکاف کے آداب	۶۲
۲۶-	کیا عید کی نماز اگلے دن پڑھی جاسکتی ہے؟	۶۵
۲۷-	اگر امام دوسرا خطبہ بھول جائے	۶۶
۲۸-	عید کی زائد تکبیرات چھوٹ جائیں تو نماز دہرانا ضروری نہیں	۶۷
۲۹-	عید کی نماز ایک مسجد میں دو مرتبہ پڑھی جاسکتی ہے	۶۸
۳۰-	اگر عید اور جمعہ ایک ہی دن جمع ہو جائیں	۶۸
۳۱-	یوم عاشورا کا روزہ	۷۰
۳۲-	محرم کے بغیر عورت کا سفرِ حج	۷۳
۳۳-	کیا عورت دورانِ عدّت حج کے لیے جاسکتی ہے؟	۷۷
۳۴-	مسجدِ نبوی میں چالیس نمازیں ادا کرنے کی فضیلت؟	۷۸
۳۵-	کیا ایک قربانی گھر کے تمام افراد کے لیے کافی ہے؟	۷۹
۳۶-	حاملہ جانور کی قربانی	۸۲
۳۷-	غیر مسلم کو آبِ زمزم اور کھجور دینا	۸۲
۳۸-	کیا قربانی کا گوشت غیر مسلم کو دیا جاسکتا ہے؟	۸۳
۳۹-	خطبۂ نکاح میں پڑھی جانے والی آیتیں؟	۸۴
۴۰-	ولیمہ کیسا ہو؟	۸۵

۴۱- عورت کا حقِ مہر ۸۶
۴۲- ام المومنین حضرت خدیجہؓ کا مہر ۸۷
۴۳- مہر فاطمی کی حیثیت ۸۸
۴۴- نکاحِ ثانی کے لیے پہلی بیوی کی اجازت یا اطلاع ۹۰
۴۵- شادی کے بعد بیوی کی کفالت ۹۳
۴۶- بیوی کی کمائی میں شوہر کا حصہ ۹۴
۴۷- انفاق کے لیے شوہر کی اجازت ۹۷
۴۸- عقیقہ کی دعا ۱۰۲
۴۹- عقیقے کا وقت ۱۰۲
۵۰- لڑکی کی پیدائش اور سماجی رویّہ ۱۰۳
۵۱- کیا تعلیم جاری رکھنے کے مقصد سے اسقاط کروایا جا سکتا ہے؟ ۱۰۹
۵۲- جنسی خواہش کی تکمیل کا جائز طریقہ ۱۱۱
۵۳- ٹیسٹ ٹیوب تکنیک کے ذریعے استقرار حمل ۱۱۴
۵۴- اگر شوہر جنسی تعلق پر قادر نہ ہو ۱۱۶
۵۵- طلاق واقع ہونے کے لیے عورت کا سننا ضروری نہیں ۱۱۷
۵۶- پوجا پاٹ میں استعمال ہونے والی چیزوں کی تجارت ۱۱۸
۵۷- مشترکہ رہائش اور مشترکہ کاروبار کا مسئلہ ۱۱۹
۵۸- زندگی میں وراثت کی تقسیم ۱۲۰
۵۹- مکان وجائیداد کی وصیت اور تقسیمِ میراث ۱۲۱
۶۰- تقسیم میراث کی اہمیت ۱۲۳
۶۱- میراث کے چند مسائل ۱۲۵
۶۲- میراث کی عدم تقسیم سے پیدا ہونے والے مسائل ۱۳۰
۶۳- کیا قرض کی واپسی اضافہ کے ساتھ جائز ہے؟ ۱۳۲
۶۴- مردوں اور عورتوں کے مشترکہ دینی اجتماعات ۱۳۳

۶۵- لباس کے حدود و قیود ۱۳۸
۶۶- مصافحہ کا مسنون طریقہ ۱۴۰
۶۷- بینک لون سے بنوائے گئے مکان کی افتتاحی پارٹی ۱۴۱
۶۸- موبائل فون میں قرآنی آیات کی ریکارڈنگ یا رِنگ ٹون ۱۴۲
۶۹- محرمات سے علاج ۱۴۳
۷۰- کیا منگل کو آپریشن کروانا پسندیدہ نہیں؟ ۱۴۸
۷۱- قرآن کی قسم کھانا ۱۴۹
۷۲- غیر مسلموں کو قرآن پاک دینے کا مسئلہ ۱۵۰

علمی مسائل

۷۳- سورۂ فاتحہ میں آیتوں کی تعداد؟ ۱۵۲
۷۴- کیا غور و تدبّر کا تعلق دل سے ہے؟ ۱۵۳
۷۵- بعثتِ انبیاء کا مقصد ۱۵۹
۷۶- ایک آیت کا مفہوم ۱۶۲
۷۷- رسول اکرم ﷺ کی تشریعی حیثیت ۱۶۵
۷۸- اسماء حسنیٰ ۱۷۶
۷۹- ایک حدیث کا صحیح مفہوم ۱۸۰
۸۰- ایک حدیث کی تحقیق ۱۸۲
۸۱- فاقہ کشی کے دوران پیٹ پر پتھر باندھنے کی روایت ۱۸۳
۸۲- فضیلت رمضان پر مروی ایک حدیث کی تحقیق ۱۸۵
۸۳- ظہور مہدی کی حقیقت ۱۸۶
۸۴- خودنمائی اور خودستائی کا مظاہرہ ۱۹۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

’زندگی کے عام فقہی مسائل‘ کی تیسری جلد پیش خدمت ہے۔ یہ وہ سوالات وجوابات ہیں جو ماہ نامہ زندگی نوئی دہلی کے ’رسائل ومسائل‘ کالم میں شائع ہوتے رہے ہیں۔

اس موقع پر مجھے مرحوم ڈاکٹر فضل الرحمٰن فریدی شدت سے یاد آرہے ہیں۔ موصوف نے ماہ نامہ زندگی نو کی ادارت کے زمانہ میں قارئین کے چند فقہی سوالات مجھے جواب لکھنے کے لیے دیے۔ ان جوابات کو قارئین نے پسندیدگی کی نظر سے دیکھا۔ پھر تو انھوں نے یہ کالم میرے ہی حوالے کردیا۔ اُس وقت اندازہ نہیں تھا کہ اس سلسلے کو کتنی مقبولیت حاصل ہوگی اور قارئین کی جانب سے کس قدر تحسین وتوصیف کا اظہار ہوگا۔

میری کوشش رہی ہے کہ فقہی سوالات کے جواب میں صرف جائز یا ناجائز بتادینے پر اکتفا نہ کیا جائے، بلکہ مسئلہ کو بہ حیثیت مجموعی سمجھنے کی کوشش کی جائے اور قرآن وسنت سے دلائل فراہم کیے جائیں۔ جو مسائل اختلافی ہیں ان میں تمام فقہائے کرام کی آراء دلائل کے ساتھ نقل کردی جائیں۔ اس سے قارئین کے ذہنی افق میں کشادگی پیدا ہوگی اور وہ مسئلہ کو اچھی طرح سمجھ کر اس پر عمل کرنے پر آمادہ ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مجھے اپنے دین کی خدمت کی توفیق عطا فرمائے اور اخلاص کی دولت سے نوازے۔ آمین

۱۴؍شوال ۱۴۳۴ھ — محمد رضی الاسلام ندوی

۲۲؍اگست ۲۰۱۳ء — سکریٹری تصنیفی اکیڈمی جماعت اسلامی ہند

فقہی مسائل

اگر مسجد کا قبلہ صحیح رخ سے تھوڑا ہٹا ہوا ہو

سوال: ہمارے محلے میں سب سے قدیم مسجد ہے، جس کی کئی بار تعمیر نو بھی ہوئی ہے۔ چند روز قبل جدید قبلہ نما سے یہ معلوم ہوا کہ مسجد میں جو قبلہ پہلے طے تھا، قبلہ اس سے ۳۰ ڈگری دائیں ہے۔ اب گزارش یہ ہے کہ آیندہ ہمیں صفیں پرانی طرح بنانے کی اجازت ہے، یا نئے قبلے کی طرف رجوع کرنا ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اگر ۳۰ ڈگری تک قبلہ صحیح رخ سے ہٹا ہوا ہو تو کوئی حرج نہیں، مسجد کے قبلے کی طرف ہی رخ کر کے نماز پڑھتے رہنا درست ہے۔ گزارش ہے کہ اس معاملے میں اولین فرصت میں ہماری رہ نمائی فرمائیں۔

جواب: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

> فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ط وَ حَيْثُ مَا كُنْتُمْ
> فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ط (البقرۃ: ۱۴۴)
>
> ''مسجد حرام کی طرف رخ پھیر دو۔ اب جہاں کہیں تم ہو، اُسی کی طرف منہ کر کے نماز پڑھا کرو۔''

اس سے معلوم ہوا کہ نماز کے لیے قبلہ رُو ہونا ضروری ہے۔ اگر متعین طور سے قبلے کا علم نہ ہو تو مختلف قرائن سے جاننے کی کوشش کی جائے گی اور صحیح معلوم ہو جانے کے بعد اسی سمت رخ کرنا ضروری ہوگا۔

آپ نے جس مسجد کا تذکرہ کیا ہے، اس کی کئی بار تعمیر ہو چکی ہے۔ ظاہر ہے، ہر تعمیر کے موقعے پر درست قبلہ متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہوگی۔ انسان بقدر استطاعت مکلّف ہے۔ اس لیے اس میں اب تک پڑھی گئی تمام نمازیں درست ہیں۔ اب جدید قبلہ نما سے اگر قطعی طور پر معلوم ہو گیا ہے کہ صحیح قبلہ مسجد کے قدیم قبلے سے ۳۰ ڈگری دائیں طرف ہے تو ادائے نماز کے لیے قبلہ درست کرنا ضروری ہے۔ مسجد کو منہدم کرنا ضروری نہیں، بل کہ صفوں کا رخ درست کر لینا کافی ہوگا۔ البتہ مسجد میں معمولی ترمیم کر کے رخ درست کر لیا جائے تو بہتر ہے۔

امام کا محرابِ مسجد میں کھڑا ہونا

سوال: ہمارے محلے کی مسجد میں اس بات پر تنازعہ ہو گیا کہ امام صاحب دورانِ امامت محرابِ مسجد میں کھڑے ہوں یا اس سے باہر؟ بعض لوگوں نے کہا کہ محراب میں امام کا کھڑا ہونا مکروہ ہے، اس لیے کہ اس میں اہل کتاب کی مشابہت ہے، جب کہ بعض دوسروں کا کہنا ہے کہ ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ بہ راہ کرم واضح فرمائیں، اس سلسلے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟

جواب: آج کل مسجدوں میں جس طرح محراب بنائے جاتے ہیں، اس کا رواج صدرِ اول میں نہیں تھا۔ چنانچہ مسجد نبوی میں بھی رسول اللہ ﷺ اور خلفائے راشدین کے دور میں محراب نہیں تھا۔ سب سے پہلے اس کی تعمیر حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے ۹۱ھ میں کی، جب وہ اموی خلیفہ ولید بن عبد الملک کی طرف سے مدینہ کے گورنر تھے۔

محرابِ مسجد میں امام کے کھڑے ہونے کے سلسلے میں فقہاء کا اختلاف ہے۔ شوافع، مالکیہ (مشہور قول کے مطابق) اور بعض حنفیہ کا قول ہے کہ فرض نماز کے لیے امام کا محراب میں کھڑا ہونا جائز ہے۔ حنابلہ اور بعض احناف اسے مکروہ قرار دیتے ہیں۔ جب کہ بعض فقہائے احناف کہتے ہیں کہ امام کو محراب ہی میں کھڑا ہونا چاہیے۔ محراب کے علاوہ اس کا اور کہیں کھڑا ہونا مکروہ ہے۔ امام احمدؒ سے ایک قول یہ مروی ہے کہ امام کا محراب ہی میں کھڑا ہونا مستحب ہے۔

امام ابو حنیفہؒ کے شاگرد امام محمدؒ نے الجامع الصغیر میں امام کے محراب میں کھڑے ہونے کو مکروہ لکھا ہے۔ انھوں نے اس مسئلے کی کوئی تفصیل نہیں بیان کی ہے، اسی لیے بعد کے فقہاء میں اس کی تفصیلات میں اختلاف ہو گیا ہے۔

جو حضرات اسے مکروہ قرار دیتے ہیں وہ اس کے مختلف اسباب بیان کرتے ہیں۔ مثلاً بعض حضرات کہتے ہیں کہ محراب میں رہنے سے امام مقتدیوں سے الگ تھلگ سا ہو جاتا ہے، نیز اس میں اہل کتاب کے عمل سے بھی مشابہت پائی جاتی ہے۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ اس صورت میں مسجد میں دائیں اور بائیں جانب رہنے والے مقتدی امام کے حال سے واقف نہیں رہ پاتے۔ گویا اگر امام محراب میں رہتے ہوئے مقتدیوں سے الگ تھلگ نہ معلوم دے اور مقتدی اس کے حال سے واقف رہیں تو محراب میں کھڑے ہو کر امامت کرنے میں کوئی کراہت نہیں ہے۔[۱]

مساجد میں بچوں کی حاضری

سوال: مساجد میں پنج وقتہ نمازوں کی ادائی کے لیے بڑوں کے علاوہ بچے بھی آتے ہیں۔ ماہ رمضان المبارک میں ان کی تعداد خاصی بڑھ جاتی ہے۔ یہ بچے ہر عمر کے ہوتے ہیں۔ کچھ بڑے تو کچھ بہت چھوٹے ہوتے ہیں۔ دوران نماز بعض بچے شرارت کرتے ہیں، ان کے درمیان دھکا مکی، دوڑ بھاگ اور باہم گفتگو ہوتی رہتی ہے، جس کی بنا پر مسجد کے پرسکون ماحول میں خلل واقع ہوتا ہے۔ نماز ختم ہونے کے بعد بعض لوگوں کی طرف سے بچوں پر ڈانٹ پھٹکار پڑتی ہے اور بسا اوقات ان کی پٹائی بھی کر دی جاتی ہے۔ اس رویے سے اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں ان بچوں کے دلوں میں نماز اور مسجد سے دوری نہ پیدا ہو جائے۔ ایک چیز یہ بھی دیکھنے میں آتی ہے کہ بچے پچھلی صفوں میں کھڑے ہوتے ہیں، نماز شروع ہونے کے بعد جو بڑے لوگ آتے ہیں وہ انھیں کھینچ کر اور پیچھے کر دیتے ہیں۔ کچھ لوگ چھوٹے بچوں کو بڑوں کی صفوں میں اپنے ساتھ کھڑا کر لیتے ہیں۔ بہ راہ کرم واضح فرمائیں کہ مساجد میں بچوں کی حاضری کے سلسلے میں شریعت کیا رہ نمائی کرتی ہے؟ بچوں کو مساجد میں لانا بہتر ہے یا نہ لانا؟ کیا مسجد میں شرارت کرنے والے بچوں کے ساتھ ڈانٹ ڈپٹ کا رویہ مناسب ہے؟ مسجد میں انھیں کہاں کھڑا کرنا چاہیے؟

جواب: مساجد اسلامی معاشرے کا نشانِ امتیاز ہیں۔ اسلام نے زندگی کے مختلف امور و معاملات کو اجتماعی طور سے انجام دینے کا جو حکم دیا ہے، مساجد میں نماز باجماعت کی صورت میں

---

(۱) اس موضوع پر تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجیے الموسوعة الفقهية الكويت بہ عنوان 'محراب'، ۳۶/ ۱۹۳-۱۹۷

اس کا عملی مظاہرہ ہوتا ہے۔ مساجد اللہ تعالیٰ کی عبادت کے مخصوص مقامات ہیں، اس لیے وہاں کے ماحول کو پرسکون اور روح پرور بنائے رکھنا ضروری ہے۔ اسی بنا پر وہاں ایسے کام کرنے کی ممانعت کی گئی ہے جن سے سکون میں خلل آئے، شور وشغب ہو، لوگ اکٹھا ہوکر اِدھر اُدھر کی باتیں کریں اور نماز پڑھنے والے ڈسٹرب ہوں۔ اسی مصلحت سے مسجد میں خرید وفروخت کے کام ممنوع ہیں۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

اِذَا رَأیتُم مَنْ یَّبِیعُ أَوْ یَبْتَاعُ فِی الْمَسْجِدِ فَقُوْلُوا لاَ أَرْبَحَ اللّٰهُ تِجَارَتَكَ(۱)

”جب تم مسجد میں کسی شخص کو خرید وفروخت کرتے دیکھو تو کہو: اللہ تعالیٰ تمھارے کاروبار میں نفع نہ کرے۔“

اسی طرح مسجد میں گم شدہ چیزوں کا اعلان کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا:

مَنْ سَمِعَ رَجُلاً یَنْشُدُ ضَالَّةً فِی الْمَسْجِدِ فَلْیَقُلْ لَارَدَّهَا اللّٰهُ عَلَیْكَ فَاِنَّ الْمَسَاجِدَ لَمْ تُبْنَ لِهٰذَا(۲)

”جو شخص سنے کہ کوئی آدمی مسجد میں اپنی کسی گم شدہ چیز کا اعلان کر رہا ہے وہ کہے: ”اللہ کرے وہ چیز تمھیں واپس نہ ملے“، کیوں کہ مسجدیں اس مقصد کے لیے نہیں بنائی گئی ہیں۔“

ایک مرتبہ ایک شخص کا اونٹ کھو گیا۔ اس نے مسجد میں اس کا اعلان کردیا۔ آں حضرت ﷺ نے اسے ایسا کرنے سے منع کیا اور فرمایا:

اِنَّمَا بُنِیَتِ الْمَسَاجِدُ لِمَا بُنِیَتْ لَهُ(۳)

”مسجدیں تو مخصوص کام (عبادت الٰہی) کے لیے بنائی گئی ہیں۔“

---

(۱) جامع ترمذی، کتاب البیوع، باب النهی عن البیع فی المسجد، ۱۳۲۱

(۲) صحیح مسلم، کتاب المساجد، باب النهی عن نشد الضالة فی المسجد، ۵۶۸۔ اسے ابوداؤد، ابن ماجہ، ابن خزیمہ، بیہقی اور ابوعوانہ نے بھی روایت کیا ہے۔

(۳) سنن ابن ماجه، کتاب المساجد، باب النهی عن انشاد السوال فی المسجد، ۷۶۵

اس بنا پر ہر ایسے کام سے بچنا چاہیے جس سے نمازیوں کے سکون وانہماک میں خلل آئے، ان کا ذہن بٹے اور مسجد کا ماحول متاثر ہو۔

دوسری جانب احادیث میں بچوں کی ابتدائے عمر ہی سے دینی تربیت پر زور دیا گیا ہے۔ نماز کی فرضیت اگرچہ بلوغ کے بعد ہے، لیکن اللہ کے رسول ﷺ نے تاکید فرمائی ہے کہ اس سے قبل ہی ان میں نماز کا شوق پیدا کیا جائے اور ان سے نماز پڑھوائی جائے۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

مُرُوا أَوْلَادَكُمْ بِالصَّلٰوةِ وَ هُمْ أَبْنَاءُ سَبْعِ سِنِيْنَ وَاضْرِبُوْهُمْ عَلَيْهَا وَ هُمْ اَبْنَاءُ عَشْرِ سِنِيْنَ (۱)

”بچے سات سال کے ہو جائیں تو انھیں نماز کا حکم دو اور دس سال کے ہو جائیں (اور نماز نہ پڑھیں) تو انھیں مارو۔“

رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے کہ آپؐ نے مختلف مواقع پر نماز پڑھی تو اپنے ساتھ بچوں کو شریک کیا۔ حضرت انسؓ، جن کی عمر ہجرت نبویؐ کے وقت دس سال تھی، بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک مرتبہ میرے گھر پر نماز پڑھی تو میں اور ایک دوسرا لڑکا آپؐ کے پیچھے کھڑے ہوئے اور ہم نے آپؐ کے ساتھ نماز پڑھی (۲)

بچوں کی دینی تربیت کے لیے ضروری ہے کہ انھیں قرآن کریم کی سورتیں یاد کرائی جائیں، نماز کے اوراد وکلمات حفظ کرائے جائیں، نماز پڑھنے کا طریقہ سکھایا جائے۔ گھر پر نماز پڑھی جائے تو انھیں شریکِ نماز کیا جائے اور انھیں اپنے ساتھ مسجد بھی لے جایا جائے، تاکہ وہ ابتدائے عمر ہی سے مسجد کے آداب سے واقف ہوں اور باجماعت نماز ادا کرنے کی انھیں ترغیب ہو۔ عہد نبویؐ میں ہر عمر کے بچے مسجد نبویؐ میں جایا کرتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کے نواسوں حضرت حسینؓ اور حضرت حسنؓ کی عمریں آپؐ کی وفات کے وقت سات آٹھ سال تھیں۔ متعدد

---

(۱) سنن ابی داؤد، کتاب الصلاۃ، باب متی یؤمر الغلام بالصلاۃ: ۴۹۵، سنن ترمذی: ۴۰۷

(۲) بخاری، کتاب الاذان، باب وضوء الصبیان: ۸۶۰۔ یہ حدیث مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور مسند احمد میں بھی مروی ہے۔

روایات میں صراحت ہے کہ وہ نمازوں کے اوقات میں مسجد نبویؐ میں جایا کرتے تھے اور بسا اوقات ان کی وجہ سے بہ ظاہر آپ کی نماز میں خلل واقع ہوتا تھا، لیکن کبھی آپؐ نے ان کی سرزنش نہیں فرمائی اور انھیں مسجد میں آنے سے نہیں روکا۔

حضرت ابو قتادہؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ''میں نماز کے لیے کھڑا ہوتا ہوں تو چاہتا ہوں کہ نماز لمبی کروں، پھر کسی بچے کے رونے کی آواز سنتا ہوں تو اس ڈر سے نماز مختصر کر دیتا ہوں کہ کہیں لمبی نماز اس کی ماں کے لیے تکلیف کا باعث نہ بن جائے۔'' (۱)

اوپر جو کچھ تحریر کیا گیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ مسجد کے ماحول کو پرسکون بنائے رکھنے کا اہتمام کرنا چاہیے اور اگرچہ بچوں کے مسجد میں آنے کی وجہ سے کچھ خلل واقع ہوتا ہے اور نمازیوں کا انہماک متاثر ہوتا ہے، لیکن زیادہ بڑی مصلحت کی بنا پر اس خلل کو گوارا کرنا چاہیے۔ وہ مصلحت یہ ہے کہ ان کے اندر نماز کی ترغیب پیدا کی جائے اور انھیں اس کا عادی بنایا جائے۔

بعض حضرات بچوں کو مسجد میں لانے سے روکنے کے لیے ایک حدیث پیش کرتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا ہے:

جَنِّبُوا مَسَاجِدَكُمْ صِبْيَانَكُمْ (۲)

''اپنی مسجدوں سے اپنے بچوں کو دور رکھو۔''

لیکن یہ حدیث صحیح نہیں ہے۔ زوائد میں ہے کہ ''اس روایت کی سند ضعیف ہے۔ اس میں ایک راوی حارث بن نبہان ہے، جس کے ضعف پر ناقدین حدیث کا اتفاق ہے۔'' عصر حاضر کے مشہور محدث علامہ محمد ناصر الدین البانیؒ نے بھی اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے۔

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد نبویؐ میں نماز باجماعت میں پہلے مردوں کی صفیں ہوتی تھیں، پھر بچوں کی۔ حضرت ابو مالک اشعریؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ مردوں کو آگے کھڑا کرتے تھے اور ان کے پیچھے بچوں کو۔ (۳)

---

(۱) بخاری، کتاب الاذان، باب الایجاز فی الصلاۃ و اکمالھا ۷۰۹، مسلم: ۴۷۰

(۲) سنن ابن ماجہ، باب ما یکرہ فی المساجد، ۷۵۰

(۳) سنن ابی داؤد، کتاب الصلاۃ، باب مقام الصبیان من الصف، ۶۷۷۔ اس روایت کو اس کے ایک راوی شہر بن خوشب کی وجہ سے ضعیف قرار دیا گیا ہے۔ ملاحظہ کیجیے ضعیف سنن ابی داؤد، للالبانی، روایت نمبر ۵۵۳

بعض مواقع پر آپؐ نے نماز پڑھی اور وہاں صرف بچے ہوئے تو اگر ایک بچہ تھا تو آپؐ نے اسے اپنی دائیں جانب کھڑا کر لیا اور اگر دو بچے ہوئے تو انھیں اپنے پیچھے کھڑا کیا۔ اس سے یہ استنباط کیا جا سکتا ہے کہ بچوں کی صفیں مردوں کے پیچھے بنائی جانی چاہئیں، البتہ وقت ضرورت انھیں بڑوں کے ساتھ بھی، درمیان میں یا کنارے کھڑا کیا جا سکتا ہے۔ علامہ البانیؒ سنن ابی داؤد کی درج بالا روایت نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

> ''بچوں کو مردوں کے پیچھے کھڑا کرنے کی کوئی دلیل اس حدیث کے علاوہ مجھے نہیں ملی، اور یہ حدیث ناقابل حجت ہے، اس لیے میں اس میں کوئی حرج نہیں سمجھتا کہ بچے مردوں کے ساتھ کھڑے ہوں، جب کہ صف میں وسعت بھی ہو۔'' (۱)

بچوں کے، بڑوں کے ساتھ کھڑے ہونے کا ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ ان میں سنجیدگی آئے گی اور وہ شرارتیں کم کریں گے۔ مناسب یہ ہے کہ جماعت کھڑی ہونے کے وقت بڑوں کے پیچھے بچوں کی صف بنائی جائے۔ پھر نماز شروع ہونے کے بعد جو بڑے لوگ جماعت میں شامل ہوں وہ بچوں کو کھینچ کر پیچھے نہ کریں، بلکہ ان ہی کی صف میں شامل ہو جائیں۔

مسجد میں شرارت کرنے والے بچوں کے ساتھ ڈانٹ پھٹکار کرنے یا ان کی پٹائی کرنے کا رویہ مناسب نہیں ہے۔ آج کے دور میں دین سے دوری عام ہے۔ بچے خاصے بڑے ہو جاتے ہیں، پھر بھی نہ ان میں نماز پڑھنے کی رغبت پیدا ہوتی ہے نہ نماز پڑھنے کا سلیقہ آتا ہے۔ جو بچے مسجد میں آتے ہیں، اندیشہ ہے کہ ان کے ساتھ اختیار کیا جانے والا درشت رویہ کہیں انھیں مسجد اور نماز سے دور نہ کر دے۔ عموماً شرارت کرنے والے دو چار بچے ہوتے ہیں، لیکن صف میں موجود تمام بچوں کو ڈانٹ سہنی پڑتی ہے۔ اس کے بجائے انھیں سمجھانے بجھانے کا رویہ اپنانا چاہیے۔ آخر میں والدین سے بھی گزارش ہے کہ وہ اپنے بچوں کی دینی و اخلاقی تربیت کا خصوصی اہتمام کریں۔ دین کی بنیادی قدریں ابتداء ہی سے ان کے ذہن نشیں کریں، مسجد کی کیا اہمیت ہے؟ نماز کیوں پڑھی جاتی ہے؟ نماز میں کیا پڑھنا چاہیے؟ اس کی ادائی میں کتنی سنجیدگی اور سکون ملحوظ رکھنا چاہیے؟ یہ باتیں بچوں کو سمجھائی جائیں۔ اس سے امید ہے کہ مسجدوں میں بچوں کی موجودگی سے وہ شور و ہنگامہ اور اودھم نہیں ہوگا، جس کا آئے دن مشاہدہ ہوتا رہتا ہے۔

---

(۱) فقہ الحدیث، طبع دہلی، ۲۰۰۴ء، ۱/۴۸۸، بہ حوالہ تمام المنۃ، ص ۲۸۴

چاند تارے والی چٹائیوں پر نماز

سوال: ہمارے علاقے میں اکثر مساجد میں جن چٹائیوں پر نماز ادا کی جاتی ہے ان میں چاند تارے بنے ہوتے ہیں۔ ان پر نماز پڑھنے کی صورت میں حالتِ سجدہ میں نماز کی پیشانی ان چاند تاروں پر پڑتی ہے۔ اس کے پیش نظر کچھ لوگ ان چٹائیوں کو الٹا کر کے چاند تاروں کو پیروں تلے رکھ کر نماز پڑھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں سورج اور چاند کو سجدہ کرنے سے منع کیا ہے۔ جب کہ کچھ لوگ چٹائی الٹی کر کے اس پر نماز پڑھنے کو ناپسند کرتے ہیں۔ آپ سے گزارش ہے کہ شرعی اعتبار سے صحیح نقطۂ نظر کی وضاحت فرمادیں۔

جواب: اوپر جس آیت کا حوالہ دیا گیا ہے وہ یہ ہے:

وَمِنْ اٰيٰتِهِ الَّيْلُ وَالنَّهَارُ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ؕ لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَهُنَّ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ۝ (حٰمٓ السجدۃ: ۳۷)

’’اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں یہ رات اور دن اور سورج اور چاند۔ سورج اور چاند کو سجدہ نہ کرو، بل کہ اس اللہ کو سجدہ کرو جس نے انھیں پیدا کیا ہے۔ اگر فی الواقع تم اسی کی عبادت کرنے والے ہو۔‘‘

یہ آیت عقیدۂ شرک پر کاری ضرب لگاتی ہے۔ لوگ سورج، چاند اور دیگر مظاہر کائنات کو خدائی میں شریک کرتے تھے، ان کی پرستش کرتے اور ان کے آگے سربہ سجود ہوتے تھے۔ انھیں ایسا کرنے سے منع کیا گیا اور صرف اللہ سبحانہ کی عبادت کرنے کا حکم دیا گیا۔

چٹائیوں میں بنی چاند تاروں کی تصویروں پر اگر حالتِ سجدہ میں پیشانی پڑ جائے تو اس پر اس آیت کا اطلاق نہیں ہوتا۔ علماء نے لکھا ہے کہ نقش کا حکم اصل کا نہیں ہوتا۔ اس لیے ایسی چٹائیوں کو سیدھی رکھ کر بھی ان پر نماز پڑھی جا سکتی ہے۔ جو لوگ اس کو ناپسند کرتے ہوں وہ اوپر سے رومال یا کوئی کپڑا بچھا کر نماز پڑھ لیں۔

نماز میں سجدۂ تلاوت

سوال: سورۃ اقرا کے اخیر میں سجدۂ تلاوت ہے۔ اگر امام نماز میں اس سورۃ کو پڑھے تو وہ سجدۂ تلاوت کس طرح کرے گا؟ وہ پہلے رکوع کرے گا یا سجدۂ تلاوت؟

جواب: قرآن کریم کی بعض آیات، جن میں سجدہ کا مضمون آیا ہے، ان کی تلاوت کرنے پر سجدہ کرنا احناف کے نزدیک واجب اور دیگر فقہا کے نزدیک سنت ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ایسے موقعے پر کبھی سجدہ کیا ہے اور کبھی ترک بھی کر دیا ہے۔ صحابہ کرامؓ کا بھی یہی معمول تھا۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ بیان کرتے ہیں: ''رسول اللہ ﷺ ہمارے سامنے قرآن کریم کی تلاوت فرماتے تھے۔ آیت سجدہ آتی تو آپؐ سجدہ کرتے اور آپؐ کے ساتھ ہی ہم بھی سجدہ کرتے تھے۔[۱] حضرت زید بن ثابتؓ فرماتے ہیں: ''میں نے نبی کریم ﷺ کی مجلس میں سورۃ النجم کی تلاوت کی۔ اس میں آیت سجدہ آنے پر ہم میں سے کسی نے سجدہ نہیں کیا۔[۲] حضرت عمر بن الخطابؓ نے ایک مرتبہ جمعہ کے خطبے میں سورۃ النحل کی آیات پڑھیں۔ آیت سجدہ آئی تو انھوں نے رک کر سجدہ کیا اور دوسرے لوگوں نے بھی سجدہ کیا۔ دوسرے جمعے میں پھر انھوں نے خطبے میں ان آیات کی تلاوت کی۔ مگر اس موقع پر سجدہ نہیں کیا اور فرمایا: کوئی سجدہ کر لے تو بہتر ہے، نہ کرے تو اس پر گناہ نہیں ہوگا۔''[۳]

نماز میں امام آیت سجدہ پڑھے تو اسے چاہیے کہ فوراً سجدہ میں چلا جائے، پھر قیام کر کے چند آیتیں مزید پڑھے، اس کے بعد رکوع کرے۔ اگر وہ کوئی ایسی سورۃ پڑھ رہا ہے جس کے آخر میں آیتِ سجدہ ہے تو اس صورت میں بھی یہی کرے کہ آیتِ سجدہ پڑھنے کے بعد سجدہ میں چلا جائے، پھر قیام کر کے دوسری سورۃ کی چند آیتیں پڑھے، پھر رکوع کرے۔ لیکن اگر امام اپنی قرأت کو آیت سجدہ پر ختم کرے یا کوئی ایسی سورۃ پڑھے جس کے آخر میں آیت سجدہ ہو، جیسے سورۂ اقرا، پھر رکوع میں چلا جائے، تو رکوع ہی کے ساتھ آیت سجدہ کی نیت کافی ہوگی۔ آیت سجدہ کے لیے الگ سے سجدہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔[۴]

---

(۱) بخاری، کتاب سجود القرآن، باب من سجد لسجود القاری، ۱۰۷۵، مسلم: ۵۷۵

(۲) بخاری، باب من قرأ السجدۃ ولم یسجد، ۱۰۷۲، مسلم: ۵۷۷

(۳) بخاری، باب من رأی ان اللہ عزوجل لم یوجب السجود ۱۰۷۷

(۴) الموسوعۃ الفقہیۃ، کویت، ۲۲۱/۲۴۔ ۲۲۲، بہ حوالہ ردالمختار، ۵۱۵/۱۔ ۵۱۸، فتح القدیر، ۳۸۰/۱، ۳۹۱۔ ۳۹۲، بدائع الصنائع، ۱۹۲/۱

فرض نمازوں کے بعد اجتماعی دعا

سوال: فرض نمازوں کے بعد امام اور مقتدیوں کا مل کر اجتماعی دعا مانگنے کا رواج ہوگیا ہے، جب کہ بعض حضرات کہتے ہیں کہ یہ بدعت ہے۔ عہد نبویؐ میں اس کا رواج نہیں تھا اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ ثابت نہیں ہے۔ بہ راہ کرم رہ نمائی فرمائیں، شریعت کی رو سے ایسا کرنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب: فرض نمازوں کے بعد دعا کے معاملے میں شدت پسندی کا مظاہرہ کیا جاتا ہے۔ بعض حضرات اسے غیر مسنون اور غیر شرعی قرار دیتے ہیں، چنانچہ وہ نماز باجماعت سے فارغ ہوتے ہی اس طرح اٹھ جاتے ہیں، گویا تپتی ہوئی زمین پر بیٹھے ہوں۔ دوسری جانب ایسے بھی لوگ ہیں جو اس کا اتنی پابندی سے التزام کرتے ہیں گویا دعا نماز کا جز ہے۔ چنانچہ اگر کوئی شخص امام کے ساتھ دعا میں شریک نہیں ہوتا اور پہلے ہی اٹھ جاتا ہے تو اسے ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

یہ بات صحیح ہے کہ فرض نمازوں کے بعد اجتماعی دعا کا ثبوت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عمل سے نہیں ملتا۔ شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہؒ نے اپنے فتاویٰ میں لکھا ہے: ''صحاح، سنن اور مسانید میں درج معروف احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نماز کے آخر میں سلام پھیرنے سے پہلے دعا مانگا کرتے تھے اور اپنے اصحاب کرامؓ کو بھی اسی کی ہدایت اور تعلیم دیتے تھے۔ کسی نے بھی یہ بات نقل نہیں کی ہے کہ آپؐ جب لوگوں کو نماز پڑھاتے تو نماز سے فارغ ہونے کے بعد آپؐ اور سارے مقتدی مل کر اجتماعی دعا مانگتے تھے۔ نہ فجر میں یہ معمول تھا، نہ عصر میں، نہ دیگر نمازوں میں۔ بلکہ آپؐ کے بارے میں یہ ثابت ہے کہ آپ نماز سے فارغ ہونے کے بعد صحابہ کرامؓ کی طرف رخ کر لیتے اور اللہ کا ذکر کرتے اور صحابہ کرامؓ کو بھی اس کی تلقین کرتے۔''[1]

جہاں تک انفرادی دعا کا معاملہ ہے، اس کا ثبوت ملتا ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ ایک موقع پر رسول اللہ ﷺ سے کسی نے سوال کیا: کس موقع کی دعا بارگاہِ الٰہی میں زیادہ مقبول ہوتی ہے؟ آپؐ نے جواب دیا:

---

(۱) مجموع فتاویٰ شیخ الاسلام ابن تیمیہ، طبع سعودی عرب، ۲۲/ ۴۹۲

جَوْفَ اللَّيْلِ الآخِرِ وَ دُبُرَ الصَّلَوٰتِ الْمَكْتُوبَاتِ(۱)

''رات کے آخری پہر اور فرض نمازوں کے بعد مانگی جانے والی دعا۔''

خود آپؐ کے جو معمولات منقول ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ فرض نمازوں کے بعد کبھی جلد اٹھ جاتے تھے اور کبھی کچھ دیر بیٹھ کر ذکر و دعا میں مشغول رہتے تھے۔

اگر فرض نمازوں کے بعد کی دعا کو نماز کا جز نہ سمجھا جائے اور امام کی دعا میں مقتدی بھی شریک ہو جائیں تو کوئی حرج نہیں ہے۔ اسے بدعت قرار دینا اور ترک کر دینے پر زور دینا درست نہیں معلوم ہوتا۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے لکھا ہے:

''اس میں شک نہیں کہ نبی کریم ﷺ کے زمانے میں یہ طریقہ رائج نہ تھا جو اب رائج ہے کہ نماز باجماعت کے بعد امام اور مقتدی سب مل کر دعا مانگتے ہیں۔ اس بنا پر بعض علماء نے اس طریقے کو بدعت ٹھہرایا ہے، لیکن میں نہیں سمجھتا کہ اگر اس کو لازم نہ سمجھ لیا جائے اور اگر نہ کرنے والے کو ملامت نہ کی جائے اور اگر کبھی کبھی قصداً اس کو ترک بھی کر دیا جائے تو پھر اسے بدعت قرار دینے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ خدا سے دعا مانگنا بہ جائے خود تو کسی حال میں برا فعل نہیں ہو سکتا۔'' (۲)

ایک صاحب نے ایک تفصیلی مقالہ تحریر کیا، جس میں اس موضوع پر مختلف پہلوؤں سے بحث کرنے کے بعد 'اجتماعی دعا بعد نماز' کو بدعت قرار دیا۔ مولانا سید احمد عروج قادریؒ نے اس مقالے کو ماہ نامہ زندگی رام پور میں شائع تو کر دیا، مگر ساتھ ہی اس پر یہ نوٹ بھی لگا یا:

''میں اپنے مطالعے کی روشنی میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس عمل کو 'بدعت' قرار دینا صحیح نہیں ہے۔ اگر اس اجتماعی دعا کو فرض نمازوں کا جز نہ سمجھا جائے تو اس کے بدعت ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے...... حضور اکرم ﷺ کا عمل فرض نمازوں کے بعد مختلف اوقات اور مختلف حالات میں مختلف رہا ہے۔ فرض نمازوں کے بعد حضور اکرم ﷺ نے اذکار، استغفار اور دعاؤں کے جو کلمات ارشاد فرمائے ہیں ان سب کو جمع کیا جائے تو ایک مقالہ تیار ہو جائے۔ کبھی آپؐ فرض نمازوں کے بعد اپنی جگہ سے فوراً ہٹ جاتے، کبھی

---

(۱) ترمذی، ۳۴۹۹۔ علامہ البانی نے اسے حسن قرار دیا ہے۔

(۲) رسائل و مسائل، مرکزی مکتبہ اسلامی، پبلشرز، نئی دہلی۔ ۲۰۰۷ء، ۱/۱۳۹

اذکار اور دعاؤں کے اچھے خاصے طویل کلمات ارشاد فرماتے، اس کے بعد اپنی جگہ سے ہٹتے۔ کبھی نماز سے فارغ ہو کر صحابہ کرامؓ کی طرف رخ کر کے بیٹھ جاتے۔ بیٹھ کر آپؐ کیا کچھ کرتے یا کہتے تھے، اس کی تمام تفصیلات احادیث میں نہیں ہیں۔ اگر ان تمام چیزوں کو ایک اصل مان کر امام اور مقتدی دونوں مل کر اجتماعی دعا کر لیں تو اس عمل کو 'بدعت' قرار دینا صحیح نہیں معلوم ہوتا۔'' (۱)

صاحب مقالہ نے اس موضوع پر بھی تفصیل سے بحث کی تھی کہ جن احادیث میں 'فی دبر کل صلوٰۃ' دعا کا ذکر آیا ہے اس سے مراد نماز کا آخری حصہ (سلام پھیرنے سے پہلے) ہے، نہ کہ نماز کے بعد۔ اس کا رد کرتے ہوئے مولانا عروج قادریؒ نے لکھا ہے:

''قُبُل اور دُبُر ایک دوسرے کی ضد اور نقیض ہیں۔ جس طرح قبل کے اصل معنی مقدم (آگے) کے ہیں، اسی طرح دبر کے اصل معنی مؤخر (پیچھے) کے ہیں۔ اس معنی کے لحاظ سے جسم کے آگے کے حصے کو قبل اور پیچھے کے حصے کو دبر کہتے ہیں اور اسی لحاظ سے اس لفظ کے معنی آخر اور بعد دونوں صحیح ہیں۔ مدبر اس غلام کو کہتے ہیں جس کو اس کے آقا نے اپنی موت کے بعد آزاد کر دیا ہو...... قرآن کریم کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں بھی اس لفظ کو 'بعد' کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ سورۂ ق میں ہے: وَ أَدْبَارَ السُّجُوْدِ۔ (آیت: ۴۰) اس کا ترجمہ مولانا اشرف علی تھانویؒ نے یہ کیا ہے: ''اور فرض نمازوں کے بعد بھی۔'' دبر الصلوٰۃ کے الفاظ بہت سی حدیثوں میں آئے ہیں۔ ان میں سے بعض احادیث میں وضاحت اور صراحت کے ساتھ دبر کے معنی 'بعد' کے ہیں۔ مثلاً بعض احادیث میں فی دبر الصلوٰۃ مخصوص تعداد میں تسبیحات پڑھنے کی فضیلت بیان کی گئی ہے۔ جہاں تک مجھے علم ہے، فرض نمازوں کے سجدے میں یا تشہد و درود کے بعد نماز کے اندر ان تسبیحات کو گن کر پڑھنے کا کوئی بھی قائل نہیں ہے۔ تمام محدثین ان کو فرض نمازوں کے بعد ہی کا ذکر قرار دیتے ہیں۔ بعض محدثین نے اس طرح کی احادیث پر تراجم یا عنوانات مقرر کر کے واضح کر دیا ہے کہ 'دبر الصلوٰۃ' کے معنی 'بعد نماز' کے ہیں، نہ کہ نماز کے آخر میں۔ امام نسائی نے اس طرح کے متعدد عنوانات قائم کیے ہیں، مثلاً ان کا ایک عنوان ہے: 'التھلیل والذکر بعد التسلیم'۔ امام بخاری نے بھی کتاب الدعوات میں الدعاء بعد الصلوٰۃ کا باب باندھا ہے اور اس میں دبر کل صلوٰۃ والی حدیث نقل کی ہے۔'' (۲)

---

(۱) ماہ نامہ زندگی، رام پور، جلد: ۶۰، رجب ۱۳۹۸ھ/جون ۱۹۷۸ء ص: ۴۹

(۲) حوالہ سابق، ص: ۴۹-۵۲

مولانا سید احمد عروج قادریؒ نے مزید لکھا ہے:

''اس سے آگے کی ایک اور بات یہ کہی جاسکتی ہے کہ احادیث نبویؐ میں نماز کے اندر کی دعاؤں اوراذکار کے لیے فی صلوٰتہ، فی سجودہ، فی السجود، فی صلوٰتی یا بعد التشہد کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں اور نماز کے بعد کی دعاؤں اوراذکار کے لیے دبر الصلوۃ، فی دبر الصلوۃ، حین ینصرف، اذا سلم، حین فرغ من الصلوۃ یا اثر الصلوۃ کے الفاظ لائے گئے ہیں۔ اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ دبر الصلوٰۃ یا فی دبر الصلوٰۃ کا ترجمہ 'نماز کے بعد' ہی صحیح ہے۔'' (۱)

کیا دعاؤں میں پیغمبر کا وسیلہ اختیار کرنا جائز نہیں؟

سوال: ماہ نامہ زندگی نو جنوری ۲۰۱۱ میں مولانا محمد سلیمان قاسمی کا مضمون بہ عنوان 'ابراہیم علیہ السلام کی دعائیں' شائع ہوا ہے۔ اس میں انھوں نے ص ۲۳ پر لکھا ہے: 'ابراہیم علیہ السلام کی دعاؤں سے ایک اور حقیقت واضح طور پر ثابت ہورہی ہے کہ دعاؤں میں کسی کو واسطہ اور وسیلہ نہیں بنانا چاہیے۔ کسی کو واسطہ اور وسیلہ بنانا اللہ کو اپنے سے دور سمجھنے کے مترادف ہے، حالاں کہ اللہ ہر جگہ موجود ہے اور اپنی مخلوق پر انتہائی شفیق اور مہربان ہے۔ سب کی سنتا ہے اور بلا واسطہ اور بغیر وسیلہ سنتا ہے۔'' جب کہ میں نے دوسری کتابوں میں پڑھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے وسیلے سے دعا مانگی جاسکتی ہے۔ مثلاً جناب نعیم صدیقی کی کتاب 'محسن انسانیت' کے صفحہ ۴ پر یہ عبارت ہے: 'وہ گورے مکھڑے والا جس کے روئے زیبا کے واسطے سے ابر رحمت کی دعائیں مانگی جاتی ہیں۔''

ہر نماز میں قعدۂ اخیرہ میں ہم دعا سے قبل درود شریف پڑھتے ہیں۔ احادیث سے بھی ثابت ہے کہ اگر دعا سے پہلے اور بعد میں درود شریف پڑھیں تو اس کی برکت سے دعا کی قبولیت یقینی ہوتی ہے۔ کیا یہ درود شریف ایک طرح کا واسطہ نہیں ہے؟

کیا دعا میں نبی کریم ﷺ کا واسطہ اختیار کرنا جائز نہیں ہے، جب کہ یہ عقیدہ پختہ ہو کہ حاجت روا صرف اور صرف اللہ رب العزت کی ذات ہے؟

جواب: قرآن کریم کی بہت سی آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات انسان سے بہت

---

(۱) حوالہ سابق، ص: ۵۲

قریب ہے، وہی حقیقی کارساز ہے۔اس لیے اپنی ہر ضرورت کے لیے انسان کو اسی کے آگے ہاتھ پھیلانا اور اسی سے دعا کرنی چاہیے۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَ نَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ ۚ وَ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ ۝ (قٓ:۱۶)

"ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے اور اس کے دل میں ابھرنے والے وسوسوں تک کو ہم جانتے ہیں۔ہم اس کی رگِ گردن سے بھی زیادہ اس سے قریب ہیں۔"

وَ اِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ؕ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ (البقرۃ:۱۸۶)

"اور اے نبی! میرے بندے اگر تم سے میرے متعلق پوچھیں تو انھیں بتا دو کہ میں ان سے قریب ہی ہوں۔ پکارنے والا جب مجھے پکارتا ہے، میں اس کی پکار سنتا اور جواب دیتا ہوں۔"

وَ قَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ ۝ (المؤمن:۶۰)

"تمھارا رب کہتا ہے: 'مجھے پکارو، میں تمھاری دعائیں قبول کروں گا، جو لوگ گھمنڈ میں آکر میری عبادت سے منہ موڑتے ہیں، ضرور وہ ذلیل وخوار ہوکر جہنم میں داخل ہوں گے۔"

اس آیت کی تشریح میں مولانا امین احسن اصلاحیؒ نے لکھا ہے:

"یہ توحید کی یاد دہانی ہے کہ تمھارا رب یہ اعلان کر چکا ہے کہ مجھ سے مانگنے کے لیے کسی واسطے کی ضرورت نہیں ہے۔ جس کو مانگنا ہو وہ مجھی سے مانگے، میں اس کی درخواست قبول کروں گا۔ مطلب یہ ہے کہ جب میں نے اپنے دروازے پر کوئی پہرہ نہیں بٹھایا ہے تو دوسروں کو سفارشی بنانے اور ان کی خوشامد کی کیا ضرورت ہے؟ یہ مشرکین کے اس وہم کی تردید ہے کہ خدا تک پہنچنے کا ذریعہ ان کے مزعومہ شرکاء وشفعاء ہی ہیں۔ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اور اپنے بندوں کے درمیان اس قسم کے وسائط حائل نہیں کیے ہیں، بلکہ ہر بندہ اس سے براہِ راست تعلق پیدا کرسکتا ہے اور اس سے دعا والتجا کرسکتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس کی دعا قبول فرماتا ہے۔" (۱)

---

(۱) تدبر قرآن طبع تاج کمپنی دہلی، ۱۹۸۹ء: ۷/ ۵۸، ۵۹

بہت سی احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد نبوی میں صحابۂ کرام رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور آپؐ سے اپنے حق میں بارگاہِ الٰہی میں دعا کرنے کی درخواست کرتے تھے اور آپؐ ان کی درخواست کو قبول کرتے ہوئے ان کے لیے دعا کرتے تھے۔ لیکن وہ آپؐ کی وفات کے بعد آپؐ کے وسیلے سے اللہ سے دعا کرتے رہے ہوں، یہ کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں ہے۔ بلکہ بعض احادیث سے اس کے برعکس معلوم ہوتا ہے۔ حضرت انس بن مالکؓ بیان کرتے ہیں کہ آں حضرت ﷺ کی وفات کے بعد جب کبھی بارش نہ ہوتی اور لوگ قحط کا شکار ہونے لگتے تو حضرت عمر بن الخطابؓ آپؐ کے چچا حضرت عباس بن عبدالمطلبؓ سے دعا کرنے کی درخواست کرتے تھے۔ کتبِ حدیث میں حضرت عمرؓ کی دعا کے یہ الفاظ مروی ہیں:

اَللّٰھُمَّ اِنَّا کنَّا نَتوسلُ اِلیكَ بِنَبینَا فَتسقینَا وَ اِنَّا نتوسَّلُ الیكَ بعَمِّ نبینَا فاسقنَا(۱)

''اے اللہ! پہلے ہم تیرے نبی کے وسیلے سے بارش کی دعا کرتے تھے اور تو اسے قبول کرکے ہمیں سیراب کرتا تھا۔ اب ہم اپنے نبی کے چچا کے وسیلے سے تجھ سے بارش کی دعا کرتے ہیں۔ اے اللہ! بارش کردے۔''

بعض روایات میں ہے کہ حضرت عمرؓ حضرت عباسؓ سے درخواست کرتے تھے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے بارش کی دعا کریں، چنانچہ وہ دعا کرتے تھے۔(۲) محترم نعیم صدیقی کی کتاب 'محسن انسانیت' سے جو شعر نقل کیا گیا ہے، وہ آں حضرت ﷺ کے چچا جناب ابوطالب کا ہے، اس میں اسی کی طرف اشارہ ہے کہ آپؐ کی حیاتِ طیبہ میں آپؐ کے واسطے سے بارش کی دعا کی جاتی تھی۔ امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں حضرت ابن عمرؓ کے حوالے سے یہ شعر نقل کیا ہے۔(۳)

ایک حدیث میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا: 'جب تم مؤذن کی آواز سنو تو اس کے کلمات کو تم بھی دہراؤ، پھر مجھ پر درود بھیجو، پھر میرے لیے اللہ سے وسیلہ چاہو۔' اس حدیث میں 'وسیلہ' سے مراد وہ وسیلہ نہیں ہے، جو عام طور پر سمجھا جاتا ہے، بلکہ یہ جنت کے ایک بلند تر مقام کا نام ہے۔

---

(۱) صحیح بخاری، کتاب الاستسقاء، باب سؤال الناس الامام الاستسقاء اذاقحطوا ۱۰۱۰، ۳۷۱۰

(۲) ابن حجر عسقلانی، فتح الباری بشرح صحیح البخاری، دارالمعرفۃ بیروت، ۴۹۵

(۳) بخاری، حوالہ سابق ۱۰۰۸

اسی حدیث میں آگے اس کی صراحت ہے۔ ساتھ ہی آپؐ نے یہ بھی فرمایا: 'جو شخص میرے لیے وسیلے کی دعا کرے گا وہ میری شفاعت کا مستحق ہوگا۔'(۱)

قرآن کریم کی بعض آیات میں بارگاہِ الٰہی میں 'وسیلہ' اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَابْتَغُوْٓا اِلَیْہِ الْوَسِیْلَۃَ ○ (المائدۃ:۳۵)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ سے ڈرو اور اس کی جناب میں باریابی کا ذریعہ تلاش کرو۔''

اس میں 'وسیلہ چاہنے' کا مطلب بارگاہ الٰہی میں پہنچنے کے لیے کسی کو واسطہ بنانا نہیں ہے، بلکہ ایسے کام کرنا ہے جن سے اللہ کا تقرب حاصل ہو۔ مولانا امین احسن اصلاحیؒ نے لکھا ہے:

> ''وسیلہ کے معنی قربت کے ہیں، یعنی خدا ہی کا قرب ڈھونڈو، جس کا طریقہ یہ ہے کہ خدا کے احکام و حدود کی پوری پوری پابندی کرو اور ان کی خلاف ورزی کے نتائج سے ڈرتے رہو۔ خدا اور اس کے بندوں کے درمیان واسطہ اور وسیلہ کتاب اللہ اور شریعت ہی ہے۔ اس وجہ سے کتاب اللہ اور شریعت کو مضبوطی سے تھامنا ہی خدا سے قربت کا واسطہ ہے۔ گویا آیت میں تنبیہ ہے کہ جن لوگوں نے خدا اور اس کی شریعت سے بے پروا ہوکر دوسروں کا تقرب ڈھونڈا اور ان کو اپنی نجات و فلاح کا ضامن سمجھے بیٹھے ہیں، وہ بڑی غلط امیدوں اور بڑے ہی غلط سہاروں پر جی رہے ہیں۔ فوز و فلاح کی راہ یہ ہے کہ خدا ہی سے ڈرو اور اسی کا قرب ڈھونڈو۔''

اللہ کے رسول ﷺ پر ایمان اور آپؐ سے محبت و عقیدت ایمان کا جز ہے۔ اس بنا پر آپؐ پر درود بھیجنے کی تاکید آئی ہے اور اس کی بڑی فضیلت مروی ہے۔ دعا کے آداب میں سے بیان کیا گیا ہے کہ اس سے قبل اور بعد میں درود شریف پڑھا جائے۔ لیکن یہ بہ ہر حال بارگاہِ الٰہی میں آپؐ کو واسطہ بنانا نہیں ہے۔

بارگاہِ الٰہی میں دعا عقیدۂ توحید کا مظہر ہے۔ اس سے بندے کی عاجزی اور اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کا اظہار ہوتا ہے۔ اس لیے دعا کے معاملے میں ایسے ہر رویے اور انداز سے بچنا چاہیے، جس سے یہ عقیدۂ صافی گدلا ہوتا دکھائی دیتا ہو۔

---

(۱) مسلم، کتاب الصلاۃ، باب استحباب القول مثل قول المؤذن ۳۸۴، ابوداؤد: ۵۲۳، ترمذی: ۳۶۱۲-۳۶۱۴، نسائی: ۶۷۹، احمد: ۲/۱۶۸، ۳/۸۳

(۲) تدبر قرآن: ۲/۵۱۰

اردو زبان میں خطبۂ جمعہ

سوال: ہماری بستی میں خطبۂ جمعہ کے معاملے نے انتشار کی صورت اختیار کرلی ہے۔ ہماری مسجد میں کچھ عرصے قبل ایک نئے مولانا صاحب آئے۔ انھوں نے جمعے کا خطبۂ اولیٰ اردو زبان میں دینا شروع کردیا۔ اس میں وہ آسان زبان میں دین کی بنیادی اور اہم باتیں بتاتے اور عوام کو وعظ و تلقین کرتے تھے۔ اس سے عام لوگوں کو بہت فائدہ محسوس ہوا۔ لیکن جلد ہی کچھ لوگوں نے مخالفت شروع کردی۔ ان کا کہنا تھا کہ خطبۂ جمعہ اردو زبان میں دینا جائز نہیں ہے۔ بالآخر بستی کے سربرآوردہ لوگوں کی میٹنگ ہوئی، جس میں طے پایا کہ امام صاحب جمعہ کے دونوں خطبے تو عربی زبان ہی میں دیا کریں، البتہ خطبے سے قبل منبر سے نیچے کھڑے ہوکر اردو زبان میں تقریر کردیا کریں۔ اس سے عوام کی تعلیم و تربیت کی ضرورت پوری ہوجایا کرے گی۔ لیکن امام صاحب نے اس تجویز کی مخالفت کی اور کہا کہ اس سے جمعہ کے خطبوں کی تعداد عملاً تین ہوجائے گی۔ نتیجتاً امام صاحب مسجد کی امامت سے علاحدہ کردیے گئے۔ بہ راہ کرم واضح فرمائیں کہ خطبۂ جمعہ کا مسنون طریقہ کیا ہے؟ کیا جمعہ کا خطبۂ اولیٰ اردو زبان میں دینا شرعی اعتبار سے درست نہیں ہے؟

جواب: رسول اللہ ﷺ نے خطبۂ جمعہ ہمیشہ عربی زبان میں دیا ہے۔ اسی طرح صحابہ کرام، جو مختلف علاقوں میں، حتیٰ کہ بلادِ عجم میں پھیل گئے تھے، انھوں نے بھی خطبۂ جمعہ عربی زبان کے علاوہ کسی اور زبان میں نہیں دیا۔ اس وجہ سے جمہور فقہا کہتے ہیں کہ خطبۂ جمعہ عربی زبان میں دینا مسنون ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک غیر عربی زبان میں بھی خطبہ دیا جاسکتا ہے۔ ان کے دونوں شاگردوں امام ابویوسفؒ اور امام محمدؒ (صاحبین) کے نزدیک جو شخص عربی زبان پر قادر ہو اسے عربی میں خطبہ دینا چاہیے۔ جو قادر نہ ہو اسے غیر عربی میں بھی خطبہ دینے کی اجازت ہے۔ عموماً فقہائے احناف کا فتویٰ اور عمل صاحبین کے مسلک پر ہے۔ لیکن بعض فقہا نے غیر عربی زبان میں خطبہ دینے کی اجازت دی ہے۔ مثلاً علامہ عبدالحی فرنگی محلی نے اس کے جواز کا فتویٰ دیا ہے[1] مولانا محمد علی مونگیریؒ بانی دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ نے بھی اس موضوع پر ایک مفصل رسالہ لکھا ہے، جس کا نام 'القول المحکم فی خطابة العجم' ہے۔

---

(۱) مجموعۃ الفتاویٰ، فصل: ۲۵

موجودہ دور میں اس چیز کی شدید ضرورت محسوس کی جا رہی ہے کہ خطبۂ جمعہ کو عوام کی تعلیم وتربیت کا ذریعہ بنایا جائے۔ اس بنا پر بعض علما کہتے ہیں کہ جمعے کے دونوں خطبے تو عربی زبان ہی میں دیے جائیں، البتہ خطبے سے قبل عوام کی زبان میں ان کے سامنے تقریر کی جائے، جس میں انھیں دین کی باتیں بتائی جائیں۔ اس طریقے کو اختیار کیا جا سکتا ہے، لیکن یہ بات بھی صحیح ہے کہ اس طرح عملاً جمعے کے تین خطبے ہو جاتے ہیں۔ اس لیے میرے خیال میں موجودہ دور کی ضرورت کو دیکھتے ہوئے امام ابو حنیفہؒ کے مسلک کو اختیار کر کے خطبۂ اولیٰ کو اردو میں دینا چاہیے۔

اس موقعے پر اسلامی فقہ اکیڈمی مکہ مکرمہ کے پانچویں سمینار منعقدہ ۸-۱۶ / ربیع الثانی ۱۴۰۲ھ مکہ مکرمہ میں منظور شدہ ایک فیصلے کا حوالہ دینا مناسب معلوم ہوتا ہے: ”معتدل رائے یہ ہے کہ غیر عرب علاقوں میں جمعہ وعیدین کے خطبے کے صحیح ہونے کے لیے عربی زبان کی شرط نہیں ہے۔ البتہ بہتر یہ ہے کہ خطبے کے ابتدائی کلمات اور قرآنی آیات عربی زبان میں پڑھی جائیں، تاکہ غیر عرب بھی عربی اور قرآن سننے کی عادت ڈالیں اور عربی وقرآن سیکھنا ان کے لیے آسان ہو۔ پھر خطیب علاقائی زبان میں انھیں نصیحت وتذکیر کرے۔“ (۱)

اردو خطبہ منبر سے دیا جائے یا نیچے سے؟

سوال: ہمارے محلے میں خطبۂ جمعہ کے حوالے سے تحت المنبر اور فوق المنبر کا مسئلہ کھڑا کر دیا گیا ہے۔ بہ راہِ کرم رہ نمائی فرمائیں کہ صحیح طریقہ کیا ہے؟

جواب: جمعہ کے دو خطبے مسنون ہیں۔ اب بعض جگہوں پر خطبہ کے ساتھ اردو میں تقریر کرنے کا بھی رواج ہو رہا ہے۔ کہیں امام صاحب خطبۂ اولیٰ کے ساتھ اردو میں تقریر کرتے ہیں اور کہیں خطبہ شروع کرنے سے پہلے اردو میں تقریر کرتے ہیں، پھر موذن خطبہ کی اذان دیتا ہے۔ اس کے بعد وہ دونوں خطبے پڑھتے ہیں۔

اگر خطبۂ اولیٰ کے ساتھ ہی اردو میں تقریر کی جا رہی ہو تو ظاہر ہے کہ خطبہ کے ساتھ وہ بھی منبر کے ساتھ کی جائے گی۔ لیکن اگر خطبہ سے الگ اردو تقریر کی جاتی ہے تو مناسب ہے کہ منبر سے الگ کھڑے ہو کر کی جائے، تاکہ مسجد میں آنے والے نمازیوں کو اشتباہ نہ ہو کہ خطبہ

---

(۱) مکہ فقہ اکیڈمی کے فقہی فیصلے، ایفا پبلی کیشنز نئی دہلی، طبع دوم، ۲۰۰۴ء، ص: ۱۰۷

شروع ہو گیا ہے۔ جہاں تک خطبۂ جمعہ کا معاملہ ہے اس کے بارے میں احادیث میں صراحت ہے کہ وہ منبر سے ہونا چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ کے لیے منبر بنایا گیا۔ اس کے بعد سے آپ اس پر کھڑے ہو کر خطبہ دیا کرتے تھے۔ حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے منبر پر خطبہ دیا۔ امام بخاری نے اس مضمون کی کئی احادیث نقل کی ہیں اور ان پر یہ ترجمۃ الباب قائم کیا ہے:

باب الخطبة علی المنبر۔[1]

نماز جمعہ کے چند مسائل

سوال: بہ راہِ کرم درج ذیل سوالات کی وضاحت فرما دیں:

(۱) نماز جمعہ میں کل کتنی رکعتیں ہیں؟ کہا جاتا ہے کہ اس میں فرض اور سنن و نوافل کل ملا کر چودہ رکعتیں ہیں؟ یہ محض رواج ہے یا اس کے پیچھے کوئی سند اور دلیل ہے؟ فقہ السنۃ شائع شدہ از مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نئی دہلی میں لکھا ہے کہ جمعہ میں فرض سے پہلے سنتیں اللہ کے رسول ﷺ سے ثابت نہیں ہیں، جب کہ فتاویٰ عالم گیری میں فرض سے قبل کی سنتوں کا ذکر ہے۔

(۲) کیا تین ہزار کی آبادی والے گاؤں میں تین مسجدوں میں نماز جمعہ بلا کراہت جائز ہے، جب کہ تینوں مسجدوں کا باہم فاصلہ سو، ڈیڑھ سو میٹر ہی کا ہو، اور ایک ہی مسجد میں اتنی جگہ ہو کہ پوری آبادی اس میں نماز پڑھ سکتی ہو؟

(۳) نماز کے بعد امام صاحب وظیفہ کا اہتمام کرتے ہیں اور مقتدی دعا کے انتظار میں بیٹھے رہتے ہیں، پھر اجتماعی طور پر دعا مانگی جاتی ہے، جب کہ قرآن میں نماز جمعہ ختم ہونے پر زمین میں پھیل کر اللہ کا فضل تلاش کرنے کی ہدایت موجود ہے۔ بہ راہِ کرم اجتماعی دعا کے جواز اور مواقع سے آگاہ فرمائیں۔

جواب: (۱) نماز جمعہ میں دو رکعتیں فرض ہیں۔ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک فرض سے قبل چار رکعتیں اور اس کے بعد چار رکعتیں سنت ہیں۔ امام صاحبؒ کے شاگرد قاضی ابو یوسفؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک فرض کے بعد چار رکعتوں کے علاوہ دو رکعتیں مزید مسنون ہیں۔ اس طرح کل رکعتیں بارہ ہو جاتی ہیں۔

---

(۱) صحیح بخاری، کتاب الجمعة، باب نمبر ۲۶

فقہ السنۃ میں یہ لکھا ہے کہ ''جمعہ سے پہلے سنتوں کا پڑھنا نبی ﷺ سے ثابت نہیں ہے۔'' یہ بات بے بنیاد نہیں ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے متعدد روایتیں نقل کی ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آں حضرت ﷺ جمعہ میں فرض سے پہلے سنتیں پڑھا کرتے تھے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی تحریر کیا ہے کہ یہ تمام روایتیں ضعیف ہیں(۱) دوسری طرف بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ نے فرض سے قبل سنتیں پڑھنے کی ترغیب دی ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا: ''جو شخص جمعہ کے دن غسل کر کے مسجد آئے، پھر اسے جتنی توفیق ہو اتنی رکعتیں پڑھے، پھر خاموشی سے امام کا خطبہ سنے اور اس کے ساتھ نماز ادا کرے تو اللہ اس کی ایک ہفتہ اور مزید تین دنوں کی خطائیں بخش دیتا ہے(۲) حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کے بارے میں منقول ہے کہ وہ جمعہ میں فرض سے قبل چار رکعتیں پڑھا کرتے تھے(۳)

احناف کے نزدیک نماز جمعہ ظہر کے مثل ہے اور چوں کہ ظہر میں فرض سے قبل چار رکعتیں مسنون ہیں، اس لیے ان کی ادائی جمعہ میں بھی فرض سے قبل کرنی چاہیے۔ امام بخاریؒ نے اپنی صحیح کی کتاب الجمعۃ میں ایک باب یہ منعقد کیا ہے: باب الصلاۃ بعد الجمعۃ و قبلھا (جمعہ میں فرض کے بعد اور اس سے قبل نماز کا بیان) اس کے تحت انھوں نے جو حدیث روایت کی ہے اس میں ہے کہ ''نبی ﷺ ظہر سے قبل چار رکعتیں اور اس کے بعد دو رکعتیں پڑھا کرتے تھے اور جمعہ کے بعد گھر جا کر دو رکعتیں ادا کرتے تھے۔'' اس سے شارحین نے یہ استنباط کیا ہے کہ امام بخاری کے نزدیک جمعہ اور ظہر کا حکم یکساں ہے۔ ظہر کی طرح جمعہ سے قبل بھی چار رکعتیں پڑھنی چاہئیں(۴)

(۲) نماز جمعہ کی مشروعیت کی حکمت یہ بیان کی گئی ہے کہ آبادی کے تمام افراد ایک دن ایک جگہ اکٹھا ہوں اور باہم ملاقات کر کے ایک دوسرے کے احوال سے باخبر ہوں۔ ان کا ہفتہ میں ایک بار اکٹھا ہونا آسان تھا، اس لیے اس کا حکم دیا گیا(۵) اسی بنا پر فقہاء متقدمین کی رائے تھی کہ ایک شہر میں عام حالات میں ایک ہی جگہ نماز جمعہ ہو سکتی ہے۔ دیہاتوں میں جمعہ کی اجازت نہ تھی اور وہاں رہنے والوں کو حکم تھا کہ اگر انھیں جمعہ کی نماز پڑھنی ہے تو شہر آئیں۔ لیکن بعد میں

---

(۱) فتح الباری بشرح صحیح البخاری، المکتبۃ السلفیۃ، ۲/۴۲۶

(۲) مسلم، کتاب الجمعۃ، باب فضل من استمع و انصت فی الخطبۃ: ۸۵۷

(۳) ترمذی، کتاب الجمعۃ، باب ماجاء فی الصلاۃ قبل الجمعۃ و بعدھا ۵۲۳

(۴) فتح الباری، ۲/۴۲۶

(۵) حجۃ اللہ البالغۃ، شاہ ولی اللہ، طبع مصر، ۱۳۲۲ھ، ۲/۲۱

حالات بدلے تو فقہا نے شہر میں ایک سے زائد مقامات پر نماز کی اجازت دے دی۔ چنانچہ البدائع میں امام کرخیؒ سے مروی ہے کہ قاضی ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک ایک سے زائد مقامات پر جمعہ کی نماز ہو سکتی ہے۔(۱)

موجودہ دور میں شہروں اور دیہاتوں میں آبادیاں بہت پھیل گئی ہیں، لوگوں کی مصروفیات بڑھ گئی ہیں، ایک جگہ تمام لوگوں کے اکٹھا ہونے میں طرح طرح کی زحمتیں ہیں، بازاروں میں جمعہ کے دن بھی دوکانیں کھلی رہتی ہیں۔ اور بھی دیگر بہت سے مصالح اور مسائل ہیں، اس لیے کوئی حرج نہیں ہے کہ مختلف مساجد میں جمعہ کی نماز ہو اور لوگ اپنی سہولت سے قریب کی مسجد میں نماز ادا کر لیں۔ اسی طرح نماز کا وقت مختلف مساجد میں الگ الگ رکھا جائے تو بھی نمازیوں کو سہولت ہو گی۔

(۳) اجتماعی دعا کے موضوع پر الگ سے جواب دیا جا چکا ہے۔ اسے ملاحظہ کر لیں۔

نماز عید میں خواتین کی شرکت

سوال: یہاں ہمارے علاقے میں عید الفطر کی نماز میں خواتین کی شرکت باعثِ نزاع بن گئی ہے۔ چوں کہ نماز عید کے موقع پر کافی تعداد میں خواتین عید گاہ میں نماز کے لیے آئی تھیں، مگر یہاں کے ایک مولانا صاحب نے اس پر سخت تنقید کی۔ معاملہ صرف اتنا ہی نہیں رہا، بلکہ سنا گیا کہ انھوں نے گھر گھر جا کر خواتین کو توبہ کرنے کو کہا، کیوں کہ وہ سمجھتے ہیں کہ خواتین کا نماز عید میں شریک ہونا جائز نہیں۔ اس طرح خواتین کو آئندہ عید گاہ جانے کی اجازت نہ ملنے کا اندیشہ ہے۔ دوسری طرف کچھ علماء نماز عید میں خواتین کی شرکت کو جائز ہی نہیں، بلکہ مستحسن قرار دیتے ہیں۔

براہِ مہربانی اس معاملے میں رہ نمائی فرمائیں، تا کہ آیندہ صحیح فیصلہ کیا جا سکے اور نزاع سے بھی بچا جا سکے۔

جواب: احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد نبوی میں خواتین پنج وقتہ نمازوں اور نماز جمعہ کے لیے مسجد اور عید الفطر اور عید الاضحیٰ کی نمازوں کے لیے عید گاہ جایا کرتی تھیں۔ خاص طور سے عیدین کی نمازوں کے لیے عید گاہ جانے کی، اللہ کے رسول ﷺ نے نہ صرف اجازت دے رکھی تھی، بلکہ آپ اس کا حکم دیا کرتے تھے اور تمام عورتوں کو اس کی تاکید فرمایا کرتے تھے۔

---

(۱) الموسوعۃ الفقہیۃ کویت، ۲۷/ ۲۰۴

حضرت ام عطیہؓ بیان کرتی ہیں:

اَمَرَنَا (رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ) اَنْ نُخْرِجَ فِی الْعِیْدَیْنِ الْعَوَاتِقَ وَ ذَوَاتِ الْخُدُوْرِ(۱)

''رسول اللہ ﷺ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ ہم عید الفطر اور عید الاضحیٰ میں بالغ اور پردہ کرنے والی (لڑکیوں اور عورتوں) کو (عیدگاہ) لے جایا کریں۔''

اسی روایت میں آگے ہے کہ ایک عورت نے دریافت کیا: اگر کسی کے پاس 'جلباب' نہ ہو تو وہ کیا کرے؟ (جلباب بڑی چادر کو کہتے ہیں جس سے پورا بدن ڈھک جائے، گھر سے باہر نکلنے کے لیے عورتیں اس کا استعمال کرتی تھیں) آپؐ نے جواب دیا: اپنی کسی بہن سے مانگ لے۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ کسی نے دریافت کیا: کیا حائضہ عورتیں بھی عیدگاہ جائیں؟ آپؐ نے فرمایا:

یَعْتَزِلْنَ الصَّلَاۃَ وَ یَشْهَدْنَ الْخَیْرَ وَ دَعْوَۃَ الْمُسْلِمِیْنَ(۲)

''وہ نماز کی جگہ سے الگ رہیں گی اور خیر کی مجلسوں اور مسلمانوں کی دعاؤں میں شریک ہوں گی۔''

آں حضرت ﷺ کی یہ تاکید اپنے گھر کی خواتین کے لیے بھی تھی۔ حضرت ابن عباسؓ اس کی گواہی ان الفاظ میں دیتے ہیں:

اِنَّ النَّبِیَّ ﷺ کَانَ یُخْرِجُ بَنَاتَهٗ وَ نِسَاءَہٗ فِی الْعِیْدَیْنِ(۳)

''نبی ﷺ اپنی صاحب زادیوں اور خواتین کو عیدین میں (عیدگاہ) لے جایا کرتے تھے۔''

عہد نبویؐ میں خواتین کے عیدگاہ جانے کے دو مقاصد تھے۔ ایک یہ کہ وہ نماز میں شریک ہوں اور اس کے بعد خطبہ سنیں، جس سے ان کی دینی معلومات میں اضافہ ہو اور ان میں احکامِ شریعت پر عمل کرنے کا جذبہ ابھرے۔ اسی مقصد کی خاطر بسا اوقات رسول اللہ ﷺ نماز اور خطبے سے فارغ ہو کر عورتوں کے مجمعے کی طرف تشریف لے جاتے تھے اور ان کے درمیان بھی وعظ

---

(۱) بخاری، کتاب العیدین، باب خروج النساء الی المصلّٰی ۹۷۴، مسلم: ۸۹۰

(۲) مسلم، کتاب صلاۃ العیدین، باب ذکر اباحۃ خروج النساء فی العیدین الی المصلی، ۸۹۰

(۳) ابن ماجہ، کتاب اقامۃ الصلاۃ، باب ماجاء فی خروج النساء فی العیدین: ۱۳۰۹، مسند احمد، ۲۳۱/۱۔ علامہ البانی نے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔

وارشاد فرماتے تھے۔ حضرت ابن عباسؓ اور حضرت جابر بن عبداللہؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے عید کی نماز پڑھائی، پھر خطبہ دیا۔ اس کے بعد عورتوں کے مجمع کی طرف تشریف لے گئے اور انھیں صدقہ کرنے کی تلقین فرمائی۔ اس وقت آپؐ کے ساتھ حضرت بلالؓ بھی تھے۔ آپؐ کا وعظ سن کر عورتیں بہت متاثر ہوئیں اور اپنے زیور: گلے کا ہار، کان کی بالیاں، انگوٹھیاں وغیرہ نکال نکال کر حضرت بلالؓ کو دینے لگیں۔(۱) دوسرا مقصد یہ تھا کہ عیدگاہ میں مردوں کے ساتھ عورتوں اور بچوں کی موجودگی سے مسلمانوں کی جمعیت بڑی نظر آئے۔ فقہاء نے ان دونوں مقاصد کا تذکرہ کیا ہے۔ امام ابوحنیفہؒ سے دونوں اقوال منقول ہیں۔(۲)

بعد میں جب مسلمان بڑی تعداد میں ہوگئے تو محض تعداد بڑھانے کے لیے عورتوں کو عیدگاہ میں جمع کرنے کی ضرورت نہ رہی، دوسری طرف مسلمان عورتوں میں پردہ کا اہتمام باقی نہ رہا اور خوب بناؤ سنگار کر کے گھر سے باہر نکلنے کا رجحان بڑھا، نیز دوسروں کی طرف سے فتنہ برپا کرنے کے مواقع پیدا ہوگئے تو عورتوں کا مسجد اور عیدگاہ جانا ناپسندیدہ قرار دیا گیا۔ عہد صحابہ و تابعین ہی میں ایسا ہونے لگا تھا۔ چنانچہ ام المومنین حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ انھوں نے فرمایا: ''اب عورتوں کا جو حال ہوگیا ہے، اگر اسے رسول اللہ ﷺ دیکھ لیتے تو انھیں اسی طرح مسجد جانے سے منع کر دیتے جس طرح بنی اسرائیل کی عورتوں کو منع کر دیا گیا تھا۔''(۳) اور متعدد تابعین اور تبع تابعین کے بارے میں مروی ہے کہ وہ عورتوں کو عیدگاہ جانے سے منع کیا کرتے تھے، مثلاً حضرت عروہ بن الزبیرؒ، قاسمؒ، یحیٰ الانصاریؒ، امام مالکؒ ابو یوسفؒ وغیرہ۔(۴)

فقہاء کا خیال ہے کہ فتنہ کے اندیشے سے جوان، خوب صورت اور سر برآوردہ طبقے کی خواتین کا عیدگاہ جا کر نماز ادا کرنا مکروہ ہے۔ رہیں عام عورتیں تو ان کا نکلنا اور مردوں کے ساتھ عید کی نماز ادا کرنا مستحب یا مباح ہے۔ البتہ انھیں اس کا اہتمام کرنا چاہیے کہ بھڑکیلے کپڑے نہ پہنیں، خوشبو نہ لگائیں اور بناؤ سنگار نہ کریں۔(۵)

---

(۱) مسلم، کتاب صلاۃ العیدین: ۸۸۴، ۸۸۵

(۲) کاسانی، بدائع الصنائع، ۱/۲۷۵-۲۷۶

(۳) بخاری، کتاب الاذان، باب انتظار الناس الامام العالم ۸۶۹، مسلم: ۴۴۵

(۴) عطیہ خمیس، فقہ النساء، اسلامک بک فاؤنڈیشن، نئی دہلی، ص: ۲۲۳

(۵) نووی، المجموع، ۶/۵، ۷، ابن قدامۃ، المغنی، ۲/۳۱۰، ۳۱۱، حاشیہ الصفتی، ص: ۱۰۴، بہ حوالہ الموسوعۃ الفقہیۃ کویت، ۲۷/۲۴۲

مشہور شافعی فقیہ امام نوویؒ نے لکھا ہے:

''ہمارے اصحاب (یعنی شافعی فقہاء) نے کہا ہے کہ سر برآوردہ طبقے کی اور خوب صورت خواتین کے علاوہ دیگر عورتوں کا عیدین میں نکلنا مستحب ہے۔ خوب صورت اور پردہ کی عمر کو پہنچ جانے والی عورتوں کا نکلنا مناسب نہیں، اس لیے کہ اب زمانہ خراب ہو گیا ہے، جب کہ عہد نبوی میں حالات پر امن تھے اور فتنہ وفساد کا اندیشہ نہیں تھا۔'' (۱)

اور حنبلی فقیہ حافظ عبدالرحمٰن بن علی الجوزیؒ فرماتے ہیں:

''عورتوں کا (نماز عید کے لیے) نکلنا مباح ہے، لیکن اگر ان کی وجہ سے یا ان کے بارے میں فتنہ کا اندیشہ ہو تو نہ نکلنا افضل ہے۔ کیوں کہ صدر اول کی عورتوں کا معاملہ اس زمانے کی عورتوں سے مختلف تھا۔ اسی طرح صدر اول کے مردوں کا معاملہ بھی آج کے مردوں سے مختلف تھا۔'' (۲)

فقہائے احناف نے عیدگاہ جانے، نہ جانے کے معاملے میں جوان اور بوڑھی عورتوں کے درمیان فرق کیا ہے۔ ان کے نزدیک جوان اور خوب صورت عورتوں کے لیے جمعہ وعیدین کی نمازوں کے لیے نکلنے کی اجازت نہیں ہے، البتہ بوڑھی عورتوں کے لیے اس کی رخصت ہے۔ بہ ہر حال افضل دونوں کے لیے یہی ہے کہ گھر میں نماز ادا کریں۔ (۳)

اس تفصیل سے واضح ہو جاتا ہے کہ عورتوں کے عیدگاہ جانے اور مردوں کے ساتھ نمازِ عید میں شریک ہونے کے معاملے میں نہ تو بہت زیادہ سختی کا مظاہرہ کرنا چاہیے اور نہ کھلی چھوٹ ہونی چاہیے۔ جن علاقوں میں فتنے کا اندیشہ نہ ہو، وہاں کی عیدگاہ یا جامع مسجد میں عورتوں کی نماز کے لیے علاحدہ خصوصی اہتمام ہوتا ہو اور مردوں اور عورتوں کے درمیان غیر ضروری اختلاط سے بچا جا سکتا ہو، وہاں تو عورتیں نماز عید کے لیے جا سکتی ہیں، لیکن جہاں اس کے برعکس معاملہ ہو، وہاں انھیں عیدگاہ نہ جانا چاہیے۔ جو عورتیں عیدگاہ کے لیے نکلیں انھیں بناؤ سنگار، خوشبو اور زرق برق کپڑوں سے اجتناب اور پردے کا پورا اہتمام کرنا چاہیے۔

---

(۱) نووی، شرح صحیح مسلم، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، ۱۹۹۵، ۱۵۶/۵

(۲) عبدالرحمٰن الجوزی، کتاب احکام النساء، وزارۃ الاوقاف والشئون الاسلامیۃ قطر، ۱۹۹۳ء، ص: ۲۰۱

(۳) کاسانی، بدائع الصنائع، ۲۷۵/۱، ۲۷۶، سرخسی، المبسوط، ۴۱/۲

آخر میں یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ عورتوں کو نماز کے لیے مسجد یا عیدگاہ جانے کی اجازت تو دی گئی ہے، لیکن متعدد احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا گھر میں نماز پڑھنا افضل ہے۔

عید الاضحیٰ میں خوشی کا پہلو

سوال: عید الاضحیٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قربانیوں کی یادگار ہے، جو نصیحت کے لیے ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس عید میں خوشی کا کون سا پہلو ہے؟

جواب: اسلام میں عید الفطر اور عید الاضحیٰ کو خوشی کے دو مواقع قرار دیا گیا ہے۔ 'عید' کے معنیٰ خوشی کے ہیں۔ احادیث میں ان کے لیے کثرت سے 'عیدین' کے الفاظ آئے ہیں۔ عید الاضحیٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مشہور 'واقعۂ ذبح' کی یاد میں منائی جاتی ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے مختلف آزمائشوں میں مبتلا کیا، جن میں وہ پورے اترے۔ ان میں سے ایک آزمائش بیٹے کو اللہ کی راہ میں قربان کرنے کی تھی۔ جب وہ اس آزمائش میں پورے اترے تو اللہ تعالیٰ نے اعلان فرمایا: وَ فَدَیْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِیْمٍ (الصّٰفّٰت: ۱۰۷) 'ذبح عظیم' سے مراد قربانی کی وہ سنت ہے جو اللہ تعالیٰ نے جاری کر دی ہے۔ اہل ایمان ہر سال دنیا بھر میں اپنے جانوروں کی قربانی کر کے وفاداری و جاں نثاری کے اس عظیم الشان واقعہ کی یاد تازہ کرتے ہیں۔

عید الاضحیٰ میں خوشی کا پہلو یہی ہے کہ ہمیں اللہ کے محبوب پیغمبر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت پر عمل کرنے کی توفیق حاصل ہو رہی ہے۔ جانور کی گردن پر چھری پھیر کر ہم محض ایک رسم نہیں نبھاتے، بلکہ درحقیقت اللہ تعالیٰ سے ایک عہد کرتے ہیں کہ ہم بھی اسی طرح تیرے ہر حکم کی تابع داری کریں گے جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کی تھی اور اپنی ہر خواہش بے جا پر چھری پھیر دیں گے۔ کاش ہم میں سے ہر شخص اس شعور کے ساتھ قربانی کا عمل انجام دے۔

عبادات اور دینی امور میں لاؤڈ اسپیکر کا استعمال

سوال: لاؤڈ اسپیکر کا استعمال ان دنوں بہت عام ہو گیا ہے۔ مسجد میں نماز کے دوران امام صاحب پوری آواز کے ساتھ اس کا استعمال کرتے ہیں، چاہے چند نمازی ہوں یا بڑا مجمع ہو۔

بعض علماء وعظ و نصیحت کے لیے مسجد کے لاؤڈ اسپیکر کو استعمال کرتے ہیں، جس سے مسجد کے اطراف میں رہنے والے متاثر ہوتے ہیں، جن میں امتحانات کی تیاری کرنے والے طلبہ، شدید بیمار لوگ اور غیر مسلم حضرات بھی ہوتے ہیں، اسی طرح اس کا استعمال نعت خوانی اور دیگر مذہبی تقریبات کے لیے پبلک مقامات پر ہوتا ہے اور اس میں دن اور رات کی کوئی قید نہیں رکھی جاتی۔ بعض دینی جماعتیں شاہ راہوں اور چوراہوں پر اپنے کیمپ لگا کر اپنے مجوزہ اجتماعات یا مصیبت زدہ مسلمانوں کی امداد کی خاطر عطیات جمع کرنے کے لیے اعلانات کرتے وقت لاؤڈ اسپیکر کا پوری قوت سے استعمال کرتی ہیں۔

بہ راہ کرم وضاحت فرمائیں۔ کیا دینی و شرعی اعتبار سے لاؤڈ اسپیکر کا اس طرح استعمال جائز ہے؟

جواب: لاؤڈ اسپیکر کے استعمال میں احتیاط ملحوظ رکھنی چاہیے۔ اگر اس کا استعمال مسجد میں باجماعت نماز کے لیے ہو رہا ہو تو اسے اسی وقت لگایا جائے جب مجمع اتنا بڑا ہو کہ بغیر اس کے تمام نمازیوں تک امام صاحب کی آواز نہ پہنچ سکتی ہو۔ اگر صرف چند نمازی ہوں تو لاؤڈ اسپیکر کے استعمال کی کوئی ضرورت نہیں۔

مسجد یا کسی ہال میں کوئی دینی اجتماع ہو رہا ہو تو لاؤڈ اسپیکر کی آواز اتنی تیز رکھنی چاہیے کہ وہاں موجود لوگ اچھی طرح سن سکیں۔ وہاں ہونے والے خطبات و مواعظ کی آواز کو آبادی میں دور دور تک پہنچانے کے لیے لاؤڈ اسپیکر کا Volume تیز رکھنا مناسب نہیں۔ اس لیے کہ آبادی میں ایسے لوگ بھی ہو سکتے ہیں، جن کے معمولات میں تیز آواز سے خلل ہو یا انھیں اذیت پہنچے۔ اسی طرح پبلک مقامات، شاہ راہوں اور چوراہوں پر مذہبی اجتماعات یا دیگر پروگرام منعقد کرتے وقت بھی خیال رکھنا چاہیے کہ راہ چلنے والوں یا آس پاس میں رہنے والوں کو کسی طرح کی زحمت نہ ہو اور وہ تکلیف یا پریشانی محسوس نہ کریں۔ اس سلسلے میں ہمیں رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد گرامی اپنے پیش نظر رکھنا چاہیے:

مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلَا يُؤْذِ جَارَهُ (۱)

”جو شخص اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتا ہو وہ اپنے پڑوسی کو کوئی تکلیف نہ پہنچائے۔“

---

(۱) بخاری، کتاب الادب، باب من کان یومن باللّٰہ... ۶۰۱۸، مسلم: ۱۸۳

ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ صحابۂ کرام کے ساتھ ایک غزوے میں نکلے۔ راستے میں صحابہ کسی اونچے مقام پر چڑھتے یا کہیں نشیبی جگہ میں اترتے تو زور زور سے نعرۂ تکبیر بلند کرتے۔ اسی طرح جب وہ واپس ہوئے تو مدینہ سے قریب پہنچنے پر بھی بلند آواز سے نعرے لگانے لگے۔ اس موقع پر آپؐ نے انھیں تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا:

اَیُّھَا النَّاسُ، ارْبَعُوْا عَلٰی اَنْفُسِکُمْ، اِنَّکُمْ لَیْسَ تَدْعُوْنَ اَصَمَّ وَلاَ غَائِبًا، اِنَّکُمْ تَدْعُوْنَ سَمِیْعًا قَرِیْبًا وَ ھُوَ مَعَکُمْ (۱)

''لوگو، ٹھہرو، تم کسی بہرے یا غیر حاضر کو نہیں پکار رہے ہو، تم جس ذات کی کبریائی بیان کر رہے ہو وہ ہر بات سننے والا اور قریب ہے اور وہ ہر وقت تمھارے ساتھ ہے۔''

اگر آبادی مخلوط ہو اور ساتھ میں دیگر مذاہب کے ماننے والے رہتے ہوں تو اس معاملے میں مزید احتیاط کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں لاپروائی سے بسا اوقات نہ صرف دیگر مذاہب کے ماننے والوں میں اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں بدگمانی اور نفرت پیدا ہوتی ہے، بلکہ کبھی معاملہ اشتعال انگیزی اور تنازعہ تک پہنچ جاتا ہے۔

حالتِ سفر میں جمع بین الصلاتین

سوال: کیا حالت سفر میں جمع بین الصلاتین کی اجازت ہے؟

جواب: جمع بین الصلاتین سے مراد ظہر اور عصر یا مغرب اور عشاء کو ایک ساتھ پڑھنا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقعے پر میدانِ عرفات میں ظہر کے وقت ظہر اور عصر اور مزدلفہ میں عشا کے وقت میں مغرب اور عشا کی نمازیں ایک ساتھ ادا فرمائی تھیں۔ فقہاء کے درمیان اختلاف ہے کہ اس رخصت کی علت سفر ہے یا یہ حج کے ساتھ خاص ہے؟ امام ابوحنیفہؒ اور بعض دیگر فقہا مثلاً حسن بصریؒ، ابن سیرینؒ، مکحولؒ اور نخعیؒ وغیرہ کہتے ہیں کہ یہ حج کے ساتھ خاص ہے۔ دیگر مواقعِ سفر پر ظہر اور عصر یا مغرب اور عشا کو جمع کرنا درست نہیں۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ نمازوں کے اوقات تواتر سے ثابت ہیں اور جن احادیث میں حج کے علاوہ دیگر مواقع پر رسول اللہ ﷺ کے دو نمازوں کو جمع کرنے کا ذکر ہے، وہ اخبارِ آحاد ہیں۔ اس لیے خبر واحد کی

(۱) بخاری، کتاب الجهاد والسیر، باب ما یکره من رفع الصوت فی التکبیر، ۲۹۹۲ مسلم: ۲۷۰۴

بنیاد پر تواتر کو ترک نہیں کیا جا سکتا۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ان مواقع پر غالباً رسول اللہ ﷺ نے جمع صوری کی شکل اختیار فرمائی تھی۔ یعنی ظہر کو موخر کر کے اس کے آخری وقت میں اور عصر کو اس کے اول وقت میں ادا فرمایا تھا۔ اسی طرح مغرب اور عشا میں بھی کیا تھا۔

دیگر ائمہ ثلاثہ (امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ) حالت سفر میں جمع بین الصلاتین کی اجازت دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک جمع تقدیم اور جمع تاخیر دونوں جائز ہیں۔ (امام اوزاعیؒ کے نزدیک صرف جمع تاخیر جائز ہے، جمع تقدیم نہیں) ان کی دلیل وہ بہت سی احادیث ہیں جن میں متعدد مواقع سفر پر رسول اللہ ﷺ کے ظہر اور عصر، اسی طرح مغرب اور عشاء کو جمع کرنے کا تذکرہ ہے۔ مثلاً حضرت انس بن مالکؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ آپؐ کا معمول بیان کرتے ہیں کہ آپؐ سفر میں جمع بین الصلاتین کیا کرتے تھے[۱] حضرت معاذؓ اور حضرت ابن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ سفر تبوک میں آپؐ ظہر و عصر اور مغرب و عشا ایک ساتھ ادا فرماتے تھے[۲]

جمع بین الصلاتین کی احادیث اتنی کثرت سے ہیں کہ انھیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور نہ انھیں جمع صوری پر محمول کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس رخصت کی علت سفر کو قرار دیا جائے اور اس سے فائدہ اٹھایا جائے۔ بعض متاخرین احناف مثلاً علامہ سید سلیمان ندوی کے بارے میں منقول ہے کہ وہ بھی اس کے قائل تھے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

تدفین کے بعد قبر پر تلاوتِ قرآن

سوال: ہمارے یہاں میت کی تدفین کے بعد قبر کے پاس سورۂ فاتحہ اور سورۂ بقرہ کے پہلے اور آخری رکوع کی تلاوت کی جاتی ہے۔ براہ کرم اس کی شرعی حیثیت واضح فرمادیں۔ کیا یہ سنت سے ثابت ہے؟

جواب: قبر کے پاس تلاوتِ قرآن کریم کے مسئلے میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے۔ مالکیہ

---

(۱) بخاری، ابواب تقصیر الصلاۃ، باب الجمع فی السفر ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، مسلم: ۷۰۴

(۲) مسلم، کتاب الصلاۃ، باب جواز الجمع بین الصلاتین فی السفر ۷۰۵، ۷۰۶

نے اسے مکروہ قرار دیا ہے اوراس کی دلیل یہ دی ہے کہ سلف سے ایسا کرنا ثابت نہیں ہے۔ البتہ متاخرین مالکیہ نے اس کی اجازت دی ہے۔

احناف، شوافع اور حنابلہ کہتے ہیں کہ قبر کے پاس قرأتِ قرآن مکروہ نہیں ہے۔ حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ انھوں نے اپنے انتقال کے وقت وصیت کی تھی کہ ان کی تدفین کے بعد قبر کے پاس سورۂ بقرہ کی ابتدائی اور آخری آیات کی تلاوت کی جائے۔

مشہور حنفی فقیہ ابن عابدینؒ نے شرح اللباب کے حوالے سے لکھا ہے:

> ''آدمی کو قبر کے پاس سورۂ فاتحہ، سورۂ بقرہ کی ابتدائی آیات (المفلحون تک) آیت الکرسی، سورۂ بقرہ کی آخری آیات (آمن الرسول تاختم سورہ) سورۂ یٰسٓ، سورہ ملک، سورۂ تکاثر اور سورۂ اخلاص (تین، سات، گیارہ یا بارہ مرتبہ) میں سے جو بھی توفیق ہو، پڑھے۔''

ایک قول یہ ہے کہ ''قبر کے سرہانے کھڑے ہوکر سورۂ بقرہ کی ابتدائی آیات اور پیروں کی طرف کھڑے ہوکر اس کی آخری آیات پڑھی جائیں۔''(۱)

والدین کی وفات کے بعد ان کے لیے دعائے مغفرت

سوال: میری والدہ کا پندرہ روز قبل انتقال ہوگیا۔ میں اس وقت باہر تھا۔ ان سے اپنی کوتاہیوں کی معافی نہیں مانگ سکا۔ اب کیا کروں؟

جواب: والدین کی زندگی میں اولاد کا فرض ہے کہ ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کرے اور ان کی خدمت اور خبر گیری میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھے۔ قرآن وحدیث میں اس کا تاکیدی حکم دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَ قَضٰی رَبُّكَ اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّاۤ اِیَّاہُ وَ بِالۡوَالِدَیۡنِ اِحۡسَانًا ؕ

(بنی اسرائیل: ۲۳)

> ''تیرے رب نے فیصلہ کردیا ہے کہ تم لوگ کسی کی عبادت نہ کرو مگر صرف اس کی، اور والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو۔''

---

(۱) الموسوعۃ الفقہیۃ، کویت، ۳۲/ ۲۵۵-۲۵۶

ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا: میں اللہ تعالیٰ سے اجر کی طلب میں آپ کے ہاتھ پر ہجرت اور جہاد کی بیعت کرنا چاہتا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا: کیا تمھارے والدین میں سے کوئی زندہ ہے؟ اس نے جواب دیا: ہاں، دونوں زندہ ہیں۔ آپؐ نے اس شخص سے پھر سوال کیا: کیا تم اللہ سے اجر کے طالب ہو؟ اس نے جواب دیا: ہاں۔ تب آپؐ نے فرمایا:

فَارْجِعْ اِلٰی وَالِدَیْكَ فَاَحْسِنْ صُحْبَتَهُمَا[1]

''تب اپنے والدین کے پاس واپس جاؤ اور ان کی اچھی طرح خدمت کرو۔''

آدمی پوری زندگی والدین کی خدمت کرتا رہے، لیکن ان کی زندگی کے آخری لمحات میں وہ کسی وجہ سے ان کے پاس نہ ہو، اس وجہ سے ان سے اپنی کوتاہیوں کی معافی نہ مانگ سکے تو کوئی حرج نہیں، ان کی دعائیں اس کی ترقیِ درجات کا ذریعہ بنیں گی، لیکن اگر وہ پوری زندگی ان سے غافل رہے، ان کے حقوق ادا نہ کرے، بلکہ بات بات پر ناگواری کا اظہار کرے، لیکن زندگی کے آخری لمحات میں رسم دنیا نبھانے کے لیے اپنی کوتاہیوں پر معافی مانگنے بیٹھ جائے تو ایسی معافی تلافی کس کام کی؟

والدین کی وفات کے بعد اولاد کے کرنے کا کام یہ ہے کہ ان کے لیے برابر دعائے مغفرت کرے اور ان کی طرف سے وقتاً فوقتاً صدقہ وخیرات کرتا رہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

اِذَا مَاتَ الْاِنْسَانُ انْقَطَعَ عَنْهُ عَمَلُهُ اِلَّا مِنْ ثَلَاثَةٍ: اِلَّا مِنْ صَدَقَةٍ جَارِیَةٍ اَوْ عِلْمٍ یُّنْتَفَعُ بِهٖ اَوْ وَلَدٍ صَالِحٍ یَدْعُوْ لَهٗ۔''[2]

''جب کسی انسان کا انتقال ہو جاتا ہے تو اس کے عمل کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے، مگر تین کاموں کا ثواب اسے بعد میں بھی ملتا رہتا ہے: (۱) صدقۂ جاریہ (۲) علم جس سے فائدہ اٹھایا جاتا رہے (۳) نیک اولاد جو اس کے لیے دعائے مغفرت کرتی رہے۔''

---

(۱) مسلم، کتاب البرّ والصلة، باب برّ الوالدین ۲۵۴۹

(۲) مسلم، کتاب الوصیة، باب ما یلحق الانسان من الثواب بعد وفاته، ۱۶۳۱

حضرت ابن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے دریافت کیا: ''اے اللہ کے رسول ﷺ! میری ماں کا انتقال ہوگیا ہے۔ اگر میں ان کی طرف سے صدقہ کروں تو کیا ان کو اس کا اجر ملے گا؟ آپؐ نے جواب دیا: ہاں۔ تب انھوں نے عرض کیا: میرے پاس کھجور کا ایک باغ ہے۔ اے اللہ کے رسول ﷺ! آپ گواہ رہیے کہ میں نے اسے اپنی ماں کی طرف سے صدقہ کردیا۔''(۱)

امام ترمذیؒ نے یہ حدیث نقل کرنے کے بعد لکھا ہے: ''اس حدیث کی بنا پر اہل علم کی رائے ہے کہ کس شخص کے مرنے کے بعد اسے اجر و ثواب ملنے کا سلسلہ بند ہو جاتا ہے۔ ہاں، کوئی اس کی طرف سے صدقہ کرے یا اس کے حق میں دعا کرے تو اس کا اسے فائدہ پہنچتا ہے۔''

زکوٰۃ کی مقدار

سوال: کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ زکوٰۃ کم از کم ڈھائی فی صد (2.5%) ہے، چنانچہ اس سے زیادہ بھی نکال سکتے ہیں، مثلاً پانچ فی صد یا دس فی صد۔ اب فرض کیجیے کہ پانچ فی صد کے حساب سے میری زکوٰۃ دو ہزار روپے بنتی ہے۔ یہ رقم میں کسی جماعت یا ادارہ کو دوں تو کیا یہ کہنا صحیح ہوگا کہ یہ پوری رقم زکوٰۃ کی ہے، یا یہ بتانا ہوگا کہ اس میں ایک ہزار روپے زکوٰۃ کے اور ایک ہزار روپے عطیہ ہیں؟

جواب: جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے مال و دولت سے نوازا ہوا سے چاہیے کہ وہ شکرانے کے طور پر دوسرے غریب اور ضرورت مند انسانوں پر خرچ کرے۔ قرآن میں ہے:

وَ فِيٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ○ (الذاریات:۱۹)

''اور ان کے مالوں میں حق تھا سائل اور محروم کے لیے۔''

مال خرچ کرنے کو انفاق کہا جاتا ہے۔ قرآن و حدیث میں انفاق کی ترغیب دی گئی ہے اور اللہ کی خوش نودی کے لیے زیادہ سے زیادہ خرچ کرنے پر ابھارا گیا ہے۔ اس کی انتہا یہ ہے کہ آدمی کے پاس اس کی اپنی بنیادی ضروریات سے زیادہ جتنا مال ہو، سب خرچ کر دے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

---

(۱) ترمذی، کتاب الزکاۃ، باب ما جاء فی الصدقۃ عن المیت ۶۶۹، ابوداؤد: ۲۸۸۴، نسائی: ۳۶۵۵

وَ یَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ ۬ ؕ قُلِ الْعَفْوَ ؕ (البقرہ:۲۱۹)

”پوچھتے ہیں: ہم راہِ خدا میں کیا خرچ کریں؟ کہو: جو کچھ تمھاری ضرورت سے زیادہ ہو۔“

انفاق کی ایک مخصوص صورت زکوٰۃ کی ہے۔ جس شخص کے پاس کم از کم مال کی ایک متعین مقدار [ساڑھے سات تولہ سونا یا ساڑھے باون تولہ چاندی یا ان میں سے کسی ایک کی مالیت کے بقدر نقد رقم] ہو اور وہ سال بھر اس کے پاس محفوظ رہے تو اس میں سے ڈھائی فی صد نکالنا اور اس کی مخصوص مدات میں اسے خرچ کرنا اس پر فرض ہے۔ اسے زکوٰۃ کہا جاتا ہے۔

جس شخص پر جتنی رقم بہ طور زکوٰۃ عائد ہوتی ہے وہ اس سے زیادہ خرچ کرسکتا ہے۔ اس پر وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اجر وثواب کا مستحق ہوگا، لیکن ڈھائی فی صد سے اوپر کی رقم کو زکوٰۃ نہیں کہا جاسکتا، اسے صدقہ، خیرات، عطیہ، ہبہ، اعانت کچھ بھی کہا جاسکتا ہے۔

اس کی مثال ایسے ہی ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے روزانہ پانچ وقت کی نمازیں فرض کی ہیں اور ہر فرض کی رکعتیں بھی متعین کردی ہیں۔ کوئی شخص ان اوقات میں مزید نمازیں پڑھ سکتا ہے، لیکن ان کی حیثیت نوافل کی ہوگی، وہ فرض رکعتوں کی تعداد میں اضافہ نہیں کرسکتا۔

زکوٰۃ اور صدقات کو الگ الگ رکھنا اس لیے بھی ضروری ہے، کیوں کہ زکوٰۃ صرف مخصوص مدات میں خرچ کی جاسکتی ہے، جن کی صراحت قرآن کریم (التوبۃ:۶۰) میں کردی گئی ہے، جب کہ صدقات کی رقمیں ہر کارِ خیر میں صرف کی جاسکتی ہیں۔ جو تنظیمیں یا ادارے زکوٰۃ وصول کرتے ہیں وہ بھی زکوٰۃ اور صدقات کا الگ الگ حساب رکھتے ہیں، اس لیے انھیں کوئی رقم حوالے کرتے وقت یہ صراحت مناسب بلکہ ضروری ہے کہ اس میں سے اتنی رقم زکوٰۃ کی ہے اور اتنی عطیہ ہے۔

تبلیغِ دین کے کام میں زکوٰۃ کا استعمال

سوال: برادرانِ وطن میں دین کی دعوت وتبلیغ کے لیے ایک ادارہ قائم کیا گیا ہے۔ اس کے تحت ایک موبائل وین کا بھی انتظام کیا جارہا ہے، جس کے ذریعہ دینی کتابیں شہر کے مختلف علاقوں میں پہنچائی جائیں گی، دینی کتابیں اور فولڈر مفت تقسیم کیے جائیں گے اور کچھ کتابیں برائے نام قیمت

پر فروخت بھی کی جائیں گی۔ ان سے جو رقم حاصل ہوگی وہ اسی کام میں صرف ہوگی، یعنی مزید کتابیں خرید کر اسی مقصد کے لیے استعمال کی جائیں گی۔ اس ادارہ سے کوئی نفع کمانا مقصد نہیں ہے۔ اس کا واحد مقصد دعوت دین ہے۔ کیا اس کام میں زکوٰۃ کی رقم استعمال کی جاسکتی ہے؟ بہ راہ کرم قرآن وسنت کی روشنی میں جواب عنایت فرما کر ممنون فرمائیں۔

جواب: قرآن کریم میں زکوٰۃ کے مصارف کا بیان درج ذیل آیت میں ہوا ہے:

اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَ فِي الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ وَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ؕ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝ (التوبۃ:۶۰)

”یہ صدقات تو دراصل فقیروں اور مسکینوں کے لیے ہیں اور ان لوگوں کے لیے جو صدقات کے کام پر مامور ہوں، اور ان کے لیے جن کی تالیف قلب مطلوب ہو، نیز یہ گردنوں کے چھڑانے اور قرض داروں کی مدد کرنے میں اور اللہ کی راہ میں اور مسافر نوازی میں استعمال کرنے کے لیے ہیں۔ ایک فریضہ ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ سب کچھ جاننے والا اور دانا و بینا ہے۔“

اس آیت میں زکوٰۃ کے آٹھ مصارف بیان کیے گئے ہیں۔ ان میں سے ایک فی سبیل اللہ (اللہ کی راہ میں) ہے۔ قرآن وحدیث میں فی سبیل اللہ کا استعمال بہ طور اصطلاح ہوا ہے۔ اس سے مراد اللہ کی راہ میں جہاد وقتال ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں یہ الفاظ جہاں جہاں آئے ہیں، ان میں سے بیش تر مقامات پر ان سے پہلے جہاد وقتال کی صراحت موجود ہے۔ حدیث میں بھی ان کا زیادہ تر استعمال جہاد کے معنی میں ہوا ہے۔ ایک حدیث ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا:

لَغَدْوَةٌ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوْ رَوْحَةٌ خَيْرٌ مِّنَ الدُّنْيَا وَمَا فِيْهَا (۱)

”اللہ کی راہ میں صبح یا شام جہاد کے لیے نکلنا دنیا ومافیہا سے بہتر ہے۔“

اسی بنا پر جمہور علماء زکوٰۃ کی اس مد کو جہاد کے لیے خاص کرتے ہیں، لیکن علماء کا ایک

---

(۱) بخاری، کتاب الجهاد والسیر، باب الغدوة والروحة فی سبیل الله ۲۷۹۲، مسلم: ۱۸۸۰

دوسرا طبقہ اس کی توسیع وتعمیم کا قائل ہے۔ وہ تمام وجوہِ خیر کو اس میں شامل قرار دیتا ہے۔ اس کے قائلین میں ایک نام مشہور حنفی فقیہ امام شوکانیؒ (م ۵۸۷ھ) صاحب بدائع الصنائع کا ہے۔ امام رازیؒ (م ۶۰۶ھ) نے لکھا ہے کہ امام قفالؒ نے اپنی تفسیر میں بعض فقہاء کا یہی قول نقل کیا ہے۔ نواب صدیق حسن خاںؒ (م ۱۸۹۰ء) کی بھی یہی رائے ہے۔ موجودہ دور کے علماء میں مولانا ابوالکلام آزادؒ (۱۹۵۸ء) مولانا سید سلیمان ندویؒ (۱۹۵۳ء) مولانا امین احسن اصلاحیؒ (۱۹۹۷ء) اور مولانا محمد شہاب الدین ندویؒ (م ۲۰۰۲ء) وغیرہ بھی اس مد میں تعمیم کے قائل ہیں۔

کچھ علماء نے بین بین کی راہ اپنائی ہے۔ وہ 'فی سبیل اللہ' کو نہ تو قتال اور عسکری جدوجہد کے معنی میں محدود کرتے ہیں اور نہ اس میں اتنے عموم کے قائل ہیں کہ اس میں ہر کار خیر شامل ہو جائے۔ وہ کہتے ہیں کہ جہاد کا وسیع مفہوم ہے۔ اس میں اللہ کا کلمہ بلند کرنے کی ہر کوشش شامل ہے۔ موجودہ دور میں عالم اسلام کے مشہور فقیہ ڈاکٹر یوسف القرضاوی نے اپنی کتاب فقہ الزکوٰۃ میں اس نقطۂ نظر کو تفصیل سے پیش کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''میں سبیل اللہ کا مدلول متعین کرنے میں ایسے توسع کا قائل نہیں کہ ہر قسم کے مصالح اور تقرب کے کام اس میں شامل ہو جائیں اور نہ اس کے دائرہ کو اتنا تنگ سمجھتا ہوں کہ وہ صرف عسکری جہاد کے لیے خاص ہو کر رہ جائے۔ جہاد جس طرح تلوار اور نیزہ سے کیا جاتا ہے اسی طرح زبان اور قلم سے بھی کیا جاتا ہے اور جس طرح جہاد عسکری ہوتا ہے اسی طرح فکری، تربیتی، اجتماعی، اقتصادی اور سیاسی بھی ہوتا ہے۔'' (۱)

اسی طرح کے ایک سوال کا جواب ڈاکٹر قرضاوی نے ان الفاظ میں دیا ہے:

> ''میری رائے یہ ہے کہ فی سبیل اللہ کو نہ صرف جہاد پر محمول کیا جائے اور نہ اسے عام کر کے ہر اس کام پر محمول کیا جائے جو اللہ کی راہ میں اللہ کی خوش نودی کے لیے ہو۔ بے شبہ فی سبیل اللہ سے مراد اللہ کی راہ میں جہاد ہے۔ لیکن جہاد کا مفہوم صرف جنگ کرنا نہیں ہے، بلکہ اس سے بڑھ کر اس سے وسیع تر مفہوم اس میں شامل ہے۔ یعنی ہر وہ قدم جو اللہ کے دین کی نصرت اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے اٹھے۔ جہاد صرف تلوار اور توپ سے نہیں ہوتا، بلکہ کبھی قلم سے ہوتا ہے اور کبھی زبان سے، کبھی اقتصادی جہاد ہوتا ہے اور کبھی سیاسی۔ ان میں سے ہر جہاد میں مالی تعاون کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہر

---

(۱) فقہ الزکوٰۃ، ادارہ دعوۃ القرآن، ممبئی ۲/ ۶۵۷

وہ کوشش اور قدم جو اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے اٹھے اسے فی سبیل اللہ کے مفہوم میں شامل کیا جاسکتا ہے۔'' (۱)

آگے انھوں نے زکوۃ کے ترجیحی مصارف ان الفاظ میں بیان کیے ہیں:

''میری رائے میں زکوۃ کی رقم جہاد کی ان صورتوں میں بھیجنا زیادہ بہتر ہے جنھیں لسانی، ثقافتی اور اعلامی جہاد سے تعبیر کرتے ہیں۔ ذیل میں میں بعض ایسی صورتیں پیش کرتا ہوں:

(۱) اسلامی دعوتی مرکز کا قیام، جہاں سے لوگوں تک اسلام کی دعوت پہنچائی جائے۔

(۲) خود اسلامی ممالک کے اندر اسلامی ثقافتی مراکز کا قیام، جہاں مسلم نوجوانوں کی عملی تربیت ہوسکے اور انھیں اعلائے کلمۃ اللہ کی خاطر تیار کیا جاسکے۔

(۳) اسلامی اخبارات وجرائد کا اجراء، جو غیر اسلامی صحافتی سرگرمیوں کے لیے چیلنج ہو۔

(۴) اسلامی کتب کی نشر واشاعت، جس یں اسلام کی صحیح تصویر پیش کی جائے اور کفر کی ریشہ دوانیوں کو اجاگر کیا جائے۔

یہ وہ چند صورتیں ہیں جہاں زکوۃ کی رقم استعمال کرنی چاہیے۔ بلکہ زکوۃ کے علاوہ بھی ہر ممکن طریقے سے ان تمام سرگرمیوں میں دل کھول کر مالی تعاون کرنا چاہیے۔'' (۲)

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے اپنی تفسیر تفہیم القرآن میں آیت زکوۃ (التوبۃ:۶۰) میں 'فی سبیل اللہ' کی جو تشریح کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی اس کے مفہوم میں ہر کارِ خیر کو شامل نہیں کرتے، بلکہ اسے جہاد ہی کے لیے خاص کرتے ہیں، لیکن جہاد ان کے نزدیک وسیع تر معنیٰ میں ہے۔ لکھتے ہیں:

''راہِ خدا کا لفظ عام ہے۔ تمام وہ نیکی کے کام، جن میں اللہ کی رضا ہو، اس لفظ کے مفہوم میں داخل ہیں۔ اسی وجہ سے بعض لوگوں نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ اس حکم کی رو سے زکوۃ کا مال ہر قسم کے نیک کاموں میں صرف کیا جاسکتا ہے۔ لیکن حق یہ ہے اور

---

(۱) فتاویٰ یوسف القرضاوی، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی، ۲۰۰۷ء، ۱/۱۴۴

(۲) حوالہ سابق، ۱/۱۴۶

ائمہ سلف کی بڑی اکثریت اسی کی قائل ہے کہ یہاں فی سبیل اللہ سے مراد جہاد فی سبیل اللہ ہے... یہاں یہ بات اور سمجھ لینی چاہیے کہ ائمہ سلف کے کلام میں بالعموم اس موقع پر غزو کا لفظ استعمال ہوا ہے، جو قتال کا ہم معنیٰ ہے۔ اس لیے لوگ یہ گمان کرنے لگتے ہیں کہ زکوٰۃ کے مصارف میں فی سبیل اللہ کی جو مدرکھی گئی ہے وہ صرف قتال کے لیے مخصوص ہے۔ لیکن درحقیقت جہاد فی سبیل اللہ قتال سے وسیع تر چیز کا نام ہے اور اس کا اطلاق ان تمام کوششوں پر ہوتا ہے جو کلمۂ کفر کو پست اور کلمۂ خدا کو بلند کرنے اور اللہ کے دین کو ایک نظام زندگی کی حیثیت سے قائم کرنے کے لیے کی جائیں، خواہ وہ دعوت وتبلیغ کے ابتدائی مرحلے میں ہوں، یا قتال کے آخری مرحلے میں۔'' (۱)

اس موقع پر موجودہ دور کی دو فقہی اکیڈمیوں کے فیصلوں کا حوالہ دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) کے پانچویں سمینار منعقد جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ ۱۹۹۲ء میں یہ موضوع زیر بحث تھا۔ عام شرکائے سمینار کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ سورۂ توبہ: ۶۰ میں مذکور فی سبیل اللہ کا مصداق غزوہ اور جہاد عسکری ہے۔ دور حاضر میں دینی اور دعوتی کاموں کے لیے درکار سرمایہ کی فراہمی میں پیش آنے والی دشواری کے باوجود شرعاً اس کی گنجائش نہیں ہے کہ زکوٰۃ کے ساتویں مصرف فی سبیل اللہ کا دائرہ وسیع کرکے اس میں تمام دینی اور دعوتی کاموں کو شامل کرلیا جائے۔ البتہ تین حضرات (جناب شمس پیرزادہ، مولانا سلطان احمد اصلاحی اور ڈاکٹر عبدالعظیم اصلاحی) نے اس سے اختلاف کیا تھا۔ ان کے نزدیک فی سبیل اللہ میں عسکری جہاد کے ساتھ وہ تمام کوششیں شامل ہیں جو آج کے دور میں واقعتاً دعوتِ اسلام اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے کی جارہی ہوں۔'' (۲)

عالم اسلام کی ایک دوسری فقہی اکیڈمی کا فیصلہ اس سے مختلف ہے۔ المجمع الفقہی الاسلامی مکہ مکرمہ رابطہ عالم اسلامی کا ایک ذیلی ادارہ ہے۔ اس نے اپنے آٹھویں اجلاس منعقدہ مکہ مکرمہ ۱۴۰۵ھ/ ۱۹۵۸ء میں اس موضوع پر غور کیا۔ علما کی دو رائیں سامنے آئیں۔ ایک یہ کہ مصرف فی سبیل اللہ کا مصداق صرف اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے ہیں اور دوسری یہ کہ اس کا

---

(۱) تفہیم القرآن، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی، ۲/ ۲۰۸

(۲) نئے مسائل اور فقہ اکیڈمی کے فیصلے، ایفا پبلی کیشنز، نئی دہلی، ۲۰۱۰ء ص: ۶۹-۷۰

مفہوم عام ہے۔ موضوع پر غور اور فریقین کے دلائل پر بحث ومباحثہ کے بعد اکثریت کی رائے سے درج ذیل فیصلے کیے گئے:

(۱) دوسری رائے کو بعض علمائے اسلام نے اختیار کیا ہے اور قرآن کریم کی بعض آیات میں یک گونہ اس مفہوم کا لحاظ رکھا گیا ہے۔

(۲) جہاد بالسلاح کا مقصد چوں کہ اعلائے کلمۃ اللہ ہے اور اعلائے کلمۃ اللہ جس طرح قتال سے ہوتا ہے اسی طرح داعیوں کی تیاری اور ان کی مدد اور تعاون کے ذریعے دعوت الی اللہ اور اشاعت دین سے بھی ہوتا ہے۔ لہٰذا دونوں طریقے جہاد ہی کے ہیں۔

(۳) اسلام پر آج ملحدین، یہود ونصاریٰ اور دشمنانِ دین کی طرف سے فکری اور عقائدی حملے ہو رہے ہیں اور دوسروں کی طرف سے انھیں مادی اور معنوی مدد مل رہی ہے۔ ان حالات میں انتہائی ضروری ہے کہ مسلمان ان کا مقابلہ انہی ہتھیاروں سے کریں جن سے وہ اسلام پر حملے کرتے ہیں یا ان سے سخت ہتھیار سے مقابلہ کریں۔

(۴) اسلامی ممالک میں جنگ کے لیے مخصوص وزارتیں ہوتی ہیں اور ہر ملک کے بجٹ میں ان کے لیے مالی ضوابط ہوتے ہیں، جب کہ دعوتی جہاد کے لیے بیش تر ممالک کے بجٹ میں کوئی تعاون و مدد بھی نہیں ہوتی ہے۔

ان مذکورہ بالا امور کے پیش نظر اکثریت کی رائے یہ طے کرتی ہے کہ دعوت الیٰ اللہ اور اس کے معاون اعمال آیت کریمہ میں مذکور زکوٰۃ کے مصرف فی سبیل اللہ کے مفہوم میں داخل ہیں۔'' (۱)

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ بعض معتبر علماء کے نزدیک اسلام کی دعوت وتبلیغ کے کاموں میں زکوٰۃ کی رقم خرچ کی جاسکتی ہے۔ بعض فقہی اکیڈمیوں کا فیصلہ بھی اسی کے حق میں ہے اور راقم سطور بھی اسی کا قائل ہے۔

ریاستی مظالم کے شکار لوگوں کو چھڑانے کے لیے زکوٰۃ کا استعمال

سوال: ادھر کچھ عرصے سے مسلم نوجوانوں کی بڑی تعداد ریاستی مظالم کا شکار ہے۔ انھیں جیل کی سلاخوں کے پیچھے ڈال دیا جاتا ہے اور ان پر بہت سے مقدمات لاد دیے جاتے ہیں۔ ان

---

(۱) مکہ فقہ اکیڈمی کے فقہی فیصلے، ایفا پبلی کیشنز، نئی دہلی، ۲۰۰۴ء، ص: ۱۸۰-۱۸۱

مقدمات کی پیروی کے لیے خطیر رقم کی ضرورت ہوتی ہے، جسے فراہم کرپانا بسا اوقات ان مظلومین کے لیے ممکن نہیں ہوپاتا۔ کیا اس کام میں زکوٰۃ کی رقم صرف کی جاسکتی ہے؟

جواب: زکوٰۃ کی جو مدّات قرآن کریم میں مذکور ہیں ان میں سے ایک 'وَ فِی الرِّقَابِ' (التوبۃ:۶۰) ہے، یعنی گردنوں کو چھڑانے میں۔ نزولِ قرآن کے عہد میں غلامی کا رواج تھا۔ انسانوں کی گردنیں اپنے ہی جیسے دوسرے انسانوں کے چنگل میں پھنسی ہوئی تھیں۔ قرآن نے ان کی گلوخلاصی کو کارِثواب قرار دیا۔ جمہور علماء ومفسرین کا خیال ہے کہ 'فی الرقاب' سے مراد غلام ہیں۔ چوں کہ غلامی کی یہ رسم الحمدللہ اب ختم ہوگئی ہے، اس لیے زکوٰۃ کا یہ مصرف اب باقی نہیں رہا۔

اس زمانے میں ایسے قیدی بھی پائے جاتے تھے، جو مختلف جنگوں میں گرفتار کرلیے جاتے تھے، اس لیے کتبِ فقہ میں ایک بحث یہ ملتی ہے کہ کیا زکوٰۃ قیدیوں کو چھڑانے میں صرف کی جاسکتی ہے؟ جمہور فقہاء کہتے ہیں کہ قیدی کو چھڑانے میں زکوٰۃ کی رقم خرچ نہیں کی جاسکتی، لیکن بعض علماء، جن میں ابن عبدالحکم مالکیؒ، قاضی ابن العربی مالکیؒ، امام احمدؒ (ایک روایت کے مطابق) اور علامہ ابن تیمیہؒ قابلِ ذکر ہیں، اس کی اجازت دیتے ہیں۔

ادھر کچھ عرصے سے ہندوستانی مسلمان جس صورت حال سے دوچار ہیں اس کی ماضی میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ ان کے نوجوانوں کو بلا کسی قصور کے جیلوں میں ٹھونسا جارہا ہے۔ اُن پر اتنے مقدمات لاد دیے جاتے ہیں کہ ان کی پیروی میں برسوں گزر جاتے ہیں اور جیلوں سے ان کی رہائی ممکن نہیں ہوپاتی۔ ان کی رہائی کے لیے قانونی چارہ جوئی کرنا، ان کے مقدمات کی پیروی کرنا، انھیں قید وبند سے چھٹکارا دلانا اور ان کی فلاح و بہبود کے دیگر کام انجام دینا وقت کا اہم تقاضا ہے۔ امت کے سربرآوردہ طبقے کو ان کی فکر کرنی چاہیے اور اس کے لیے ہر ممکن تدبیر اختیار کرنی چاہیے۔

کیا ریاستی دہشت گردی کے شکار ان اسیران کے مقدمات کی پیروی اور ان کو رہائی دلانے کی کوششوں میں زکوٰۃ کی رقم خرچ کی جاسکتی ہے؟ فقہائے کرام کو اس موضوع پر غور کرنا چاہیے۔ راقم کی رائے ہے کہ مذکورہ معاملہ زکوٰۃ کا مصرف بن سکتا ہے۔ قرآن نے 'وَ فِی الرِّقَابِ' (گردنیں چھڑانے میں) کی جامع تعبیر اختیار کی ہے۔ زمانۂ قدیم میں اس کا انطباق غلاموں پر ہوتا تھا۔ موجودہ دور میں ہندوستان کے ان اسیرانِ بلا کی حالت ان سے مختلف نہیں ہے۔

ان مظلومین کے سلسلے میں کرنے کے دو کام اور ہیں جو شاید ان کے مقدمات کی پیروی سے زیادہ اہم ہیں:

اول یہ کہ یہ نوجوان عام طور پر اپنے گھروں کا سہارا ہوتے ہیں۔ ان کے ذریعۂ معاش پر ان کے پورے خاندان کا انحصار ہوتا ہے۔ قید و بند کی بنا پر ان کا سلسلۂ معاش منقطع ہوجانے کی وجہ سے ان کے خاندان بڑی آزمائش میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ بسا اوقات ان کے افرادِ خانہ دانے دانے کو محتاج ہوجاتے ہیں۔ ایسے موقع پر ضروری ہے کہ متمول حضرات ان خاندانوں کی خبر گیری کریں اور ان کی معاشی کفالت کی ذمہ داری لیں۔

دوم یہ کہ جیلوں میں ان نوجوانوں کے ساتھ برا سلوک کیا جاتا ہے، ان کی بنیادی ضروریات پوری نہیں کی جاتیں اور ان کو جسمانی اور نفسیاتی اذیتیں دی جاتی ہیں۔ ایسے میں ان نوجوانوں کی راحت رسانی کی بھی کوشش کرنی چاہیے، ممکن ہو تو انھیں کچھ سہولیات مثلاً پہننے کے کپڑے اور غذائی اشیاء وغیرہ پہنچائی جائیں، دینی لٹریچر، کتب و رسائل بھی پہنچائے جائیں، تاکہ ان کی دینی معلومات میں اضافہ ہو اور انھیں ذہنی و نفسیاتی سکون بھی مل سکے۔

سفرِ حج کے لیے جمع کی گئی رقم پر زکوٰۃ

سوال: میں نے گزشتہ سال سفرِ حج کے لیے پیسہ اکٹھا کیا تھا، مگر میرا نام نہیں آیا۔ میں نے وہ پیسہ محفوظ کر دیا تھا۔ اب اس پر ایک سال گزر گیا ہے۔ کیا مجھے اس کی زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی؟

جواب: کسی مال کے نصاب تک پہنچ جانے کے بعد اس پر زکوٰۃ واجب ہونے کی دو شرطیں ہیں۔ ایک یہ کہ اس پر ایک سال گزر گیا ہو اور دوسرے یہ کہ وہ آدمی کی بنیادی ضروریات سے زائد ہو۔ بنیادی ضروریات میں اپنے اور اپنے اہل و عیال نیز زیر کفالت رشتے داروں سے متعلق روزمرہ کے اخراجات، جائے رہائش، استعمالی چیزیں، کپڑے، سواری، وسائل رزق جن سے آدمی اپنی روزی کماتا ہے، وغیرہ شامل ہیں۔

اور فرضیت حج کی شرائط میں سے ایک شرط یہ ہے کہ اس کے پاس حج کے مصارف کے علاوہ اتنا مال ہو کہ حج سے واپسی تک کی مدت کے لیے اس کے زیر کفالت افراد کی بنیادی ضروریات کے لیے کافی ہو۔

حج کا سفر انسان کی بنیادی ضروریات میں سے نہیں ہے کہ اس بنا پر اس کے لیے خاص کی گئی رقم سے زکوٰۃ کی ادائی ساقط ہو جائے۔ اگر اس پر ایک سال گزر گیا ہے تو اس کی زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی۔ اس بات میں کوئی وزن نہیں ہے کہ اس کی زکوٰۃ ادا کرنے سے حج کے لیے جمع کی گئی رقم میں کمی آجائے گی۔ ہر سال سفرِ حج کے مصارف میں کچھ نہ کچھ اضافہ ہو جاتا ہے۔ جس طرح اگلے سال حج کرنے کی صورت میں آدمی کو اضافہ شدہ مصارف کا نظم کرنا ہوگا، اسی طرح وہ اس کی زکوٰۃ ادا کرنے کی صورت میں رقم زکوٰۃ میں ہونے والی کمی کی بھی تلافی کر سکتا ہے۔

زمین پر زکوٰۃ

سوال: میں نے ۲۰۰۹ء میں چار لاکھ کی ایک زمین خریدی تھی۔ بس ایک پراپرٹی کی شکل میں کہ کبھی وقتِ ضرورت کام آئے گی۔ تین سال گزر گئے ہیں۔ ہمارے ایک بہی خواہ کہتے ہیں کہ اس پر زکوٰۃ نکالنی ضروری ہے۔ براہِ کرم رہ نمائی فرمائیں:

(۱) کیا اس پر زکوٰۃ نکالنی لازم ہے؟ اگر ہاں تو اس کی موجودہ قیمت کا اعتبار کیا جائے گا یا قیمتِ خرید کا؟

(۲) جب بھی زمین فروخت کی جائے گی اس وقت زکوٰۃ نکالی جائے تو حاصل شدہ رقم پر زکوٰۃ نکالنی ہوگی یا قیمتِ خرید پر؟

(۳) اگر زکوٰۃ نکالنی ضروری نہیں ہے تو اس کے کیا دلائل ہیں؟

براہِ کرم جواب سے نوازیں، تاکہ میرے بہی خواہ کو اطمینان ہو اور میں اللہ کی پکڑ سے بچ سکوں۔

جواب: کسی زمین کی خریداری کے وقت اگر اس کی تجارت کی نیت نہیں تھی تو اس پر زکوٰۃ نہیں ہے۔ اسے فروخت کرنے کے بعد جو رقم ملے، دوسرے اموال زکوٰۃ کے ساتھ اس پر بھی زکوٰۃ عائد ہوگی، اگر وہ رقم اس وقت موجود ہو جب اس کا مالک صاحبِ نصاب ہوا ہو۔

اگر کوئی زمین ابتدا ہی میں تجارت کی نیت سے خریدی جائے تو سال گزرنے کے بعد اس پر زکوٰۃ عائد ہوگی۔ اس صورت میں قیمتِ خرید کا نہیں، بلکہ اس کی موجودہ قیمت کا اعتبار رہوگا۔

زکوٰۃ کے چند مسائل

(۱)

سوال: میں ایک فیکٹری کا مالک ہوں۔ اس میں بہت سے ملازمین کام کرتے ہیں۔ میں ہر سال رمضان میں اپنی پورے سال کی آمدنی کا حساب کرکے زکوٰۃ نکالتا ہوں۔ زکوٰۃ کی ادائی کے بارے میں میری چند الجھنیں ہیں۔ بہ راہِ کرم شریعت کی روشنی میں انھیں دور فرمائیں:

(۱) فیکٹری میں کام کرنے والے ملازمین کے بچوں کی تعلیم، علاج معالجہ، شادی اور دیگر مواقع پر میں ضرورت محسوس کرتا ہوں کہ ان کی کچھ مالی مدد کی جائے۔ کیا انھیں زکوٰۃ کی مد سے کچھ رقم دی جاسکتی ہے؟ میرا خیال ہے کہ بعض ملازمین ایسے بھی ہیں کہ اگر انھیں رقم دیتے وقت بتادیا جائے کہ یہ زکوٰۃ کا مال ہے تو وہ اسے قبول کرنے سے انکار کردیں گے۔ کیا انھیں بغیر اس کی صراحت کے کچھ رقم دی جاسکتی ہے؟ کیا زکوٰۃ کی ادائی درست ہونے کے لیے ضروری ہے کہ جسے دی جائے اسے صاف لفظوں میں یہ بھی بتایا جائے کہ یہ زکوٰۃ ہے؟

(۲) کیا جتنی زکوٰۃ واجب ہوتی ہے، اسے فوراً ایک مشت ادا کردینا ضروری ہے؟ یا اسے الگ رکھ کر اس میں سے تھوڑا تھوڑا بہ وقتِ ضرورت خرچ کیا جاسکتا ہے؟ میں یہ مناسب سمجھتا ہوں کہ زکوٰۃ کی رقم الگ کرکے رکھ لوں اور پورے سال اس میں سے تھوڑی تھوڑی رقم ضرورت مندوں کو دیتا رہوں۔ لیکن مجھے شبہ ہے کہ جب تک زکوٰۃ کی رقم میری تحویل میں رہے گی میں اس کی عدم ادائی کا گناہ گار ہوں گا۔

(۳) بعض ملازمین قرض مانگتے ہیں، مگر پھر اسے ادا نہیں کرتے۔ بارہا تقاضوں کے باوجود ان سے قرض کی رقم واپس نہیں مل پاتی۔ کیا رقم زکوٰۃ کو اس میں ایڈجسٹ کیا جاسکتا ہے، کہ میں ان ملازمین سے قرض مانگنا چھوڑ دوں اور اس کے بہ قدر رقم واجب الادا زکوٰۃ میں سے روک لوں؟

جواب: بہ قدر نصاب مال کسی شخص کے پاس ایک سال تک رہے تو اس پر زکوٰۃ فرض ہوجاتی ہے۔ سال پورا ہونے کے بعد وہ کبھی بھی زکوٰۃ ادا کرسکتا ہے۔ اس کے لیے رمضان کا انتظار

کرنے کی ضرورت نہیں۔لیکن اگرکسی نے رمضان المبارک میں زکوٰۃ نکالنے کا معمول بنا رکھا ہے تو یہ بھی اچھا ہے۔حضرت عثمان بن عفانؓ کے بارے میں آتا ہے کہ وہ رمضان میں اپنی زکوٰۃ نکالا کرتے تھے اور دوسروں کو بھی اس کی ترغیب دیا کرتے تھے۔فرماتے تھے:'لوگو! یہ تمھاری زکوٰۃ کی ادائی کا مہینا ہے،اس لیے اپنے قرض ادا کرلو،تاکہ جو مال بچے اس کی زکوٰۃ ادا کرو۔'(۱)

آپ کے سوالات کے جوابات درج ذیل ہیں:

(۱) زکوٰۃ کی ادائی کے لیے ضروری ہے کہ کوئی شخص زکوٰۃ کی نیت سے کچھ مال کسی شخص کو دے۔اس کے بغیر زکوٰۃ ادا نہ ہوگی۔لیکن جس شخص کو مال دیا جارہا ہے اس کے علم میں یہ بات آنی ضروری نہیں ہے کہ یہ زکوٰۃ کی رقم ہے۔

ولا یشترط علم آخذ الزکاۃ انھا زکاۃ (۲)

''ادائے زکوٰۃ کی صحت کے لیے یہ شرط نہیں ہے کہ اسے قبول کرنے والے کو معلوم ہو کہ یہ زکوٰۃ ہے۔''

موجودہ دور کے عالم اسلام کے مشہور فقیہ شیخ وہبۃ الزحیلی نے لکھا ہے:

''اگر مسلمان اپنی زکوٰۃ کسی ایسے شخص کو دے دے جس کو وہ غریب گمان کرتا ہو یا وہ بہ ظاہر ضرورت مند دکھائی دیتا ہو تو اس کو یہ بتانا ضروری نہیں کہ یہ زکوٰۃ ہے۔'' (۳)

مولانا مجیب اللہ ندویؒ فرماتے ہیں:

''کسی مستحق کو اگر زکوٰۃ کا روپیہ دیا جائے تو اس کو بتانا ضروری نہیں ہے کہ یہ زکوٰۃ کا روپیہ ہے اور اگر بتانے میں اس کو رنج پہنچنے کا اندیشہ ہو تو نہ بتانا ہی بہتر ہے۔خاص طور پر اپنے قریبی اعزّہ اور دوستوں کو بالکل ہی نہ بتانا چاہیے۔'' (۴)

(۲) زکوٰۃ فرض ہونے کے بعد اسے فوراً بھی ادا کیا جاسکتا ہے اور کچھ تاخیر سے بھی۔ یک مشت بھی اس کی ادائی کی جاسکتی ہے اور اس میں سے تھوڑی تھوڑی رقم بھی حسب ضرورت خرچ کی جاسکتی ہے۔لیکن محض رقم زکوٰۃ کو الگ رکھ لینے سے وہ ادا شدہ متصور

---

(۱) موطا امام محمد،ص:۱۲۸

(۲) الموسوعۃ الفقہیۃ،۲۳/۲۹۳،بہ حوالہ المغنی،۲/۶۴۰،شرح المنہاج،۲/۴۳

(۳) الفقہ الاسلامی وادلّتہ،دار الفکر دمشق،۲/۷۸۹

(۴) اسلامی فقہ،تاج کمپنی دہلی،۱۹۹۲ء،۱/۴۴۸

نہ ہوگی، جب تک کہ وہ کسی مستحق کے ہاتھ میں نہ پہنچ جائے۔اس لیے کہ ادائے زکوٰۃ کے لیے 'تملیک' (کسی کو مالِ زکوٰۃ کا مالک بنادینا) ضروری ہے۔ جب زکوٰۃ کی وہ رقم کسی مستحق کو مل جائے گی تبھی وہ ادا سمجھی جائے گی۔اسی وجہ سے فقہاء کہتے ہیں کہ اگر کسی شخص نے قدرت کے باوجود ادائے زکوٰۃ میں تاخیر کی تو وہ گنہ گار ہوگا۔فقہائے احناف تاخیر سے ادائی کی اجازت دیتے ہیں، لیکن وہ بھی ایسا کرنے کو مکروہ کہتے ہیں۔(۱)

(۳) کسی شخص نے دوسرے کو ایک رقم بہ طور قرض دی، لیکن وہ اسے واپس نہیں کر پا رہا ہے تو کیا قرض خواہ (قرض دینے والے) کے لیے جائز ہے کہ اس قرض کو زکوٰۃ میں ایڈجسٹ کردے اور قرض دار سے کہے کہ اب تمھیں قرض واپس کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں نے تمھیں اس کے بہ قدر زکوٰۃ دے کر اسے واپسیِ قرض مان لیا ہے؟ اس سلسلے میں فقہاء کا اختلاف ہے۔

احناف، حنابلہ اور مالکیہ (امام شافعیؒ کا بھی ایک قول یہی ہے) کہتے ہیں کہ ایسا کرنا جائز نہیں ہے۔اس لیے کہ زکوٰۃ اللہ تعالیٰ کا حق ہے، اس لیے اس کی ادائی کے معاملے میں کوئی ایسی تدبیر اور حیلہ اختیار کرنا مناسب نہیں جس سے اپنا ڈوبا ہوا مال بچ جائے اور قرض واپس مل جائے۔ادائے زکوٰۃ کے لیے 'تملیک' ضروری ہے۔ جب تک اس مال کا کسی دوسرے کو مالک نہیں بنایا جائے گا اسے ادا نہ سمجھا جائے گا۔

تابعین میں سے حسن بصریؒ اور عطا بن ابی رباحؒ اور فقہاے مالکیہ میں سے اشہبؒ کہتے ہیں (اور امام شافعیؒ کا بھی ایک قول یہی ہے) کہ ایسا کرنا جائز ہے۔اس لیے کہ اگر وہ اپنی زکوٰۃ اس کے حوالے کردیتا، پھر اسی رقم کو اپنے قرض کے بدلے واپس لے لیتا تو ایسا کرنا درست ہوتا۔اسی طرح رقم حوالے کیے بغیر بھی اسے ایڈجسٹ کیا جاسکتا ہے۔

جو لوگ عدم جواز کے قائل ہیں وہ بھی کہتے ہیں کہ اگر بغیر کسی پیشگی شرط اور معاہدے کے قرض خواہ نے قرض دار کو زکوٰۃ کی رقم دی اور قرض دار نے اسی سے اپنا قرض ادا کردیا تو ایسا کرنا صحیح ہوگا۔لیکن اگر اس نے پہلے سے شرط لگالی اور معاہدہ کرلیا کہ میں تمھیں زکوٰۃ دے رہا

(۱) ملاحظہ کیجیے: قاموس الفقہ، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، ۴/ ۹۲

ہوں، تمھیں اسی سے میرا قرض ادا کرنا ہوگا، تو یہ معاملہ کرنا صحیح نہ ہوگا اور زکوٰۃ ادا نہ ہوگی[۱]

(۲)

سوال: زکوٰۃ کے سلسلے میں چند سوالات ارسالِ خدمت ہیں، گزارش ہے کہ ان کے تشفی بخش جواب کی زحمت فرمائیں:

(۱) کیا زکوٰۃ اپنے غریب قریبی رشتے داروں (سگے بھائی، چچا وغیرہ) کو دی جاسکتی ہے؟

(۲) کیا اپنی کل زکوٰۃ کسی ایک شخص کو دی جاسکتی ہے؟

(۳) ایک شخص خود غریب ہے، لیکن اس کی بیوی کے پاس اتنے زیور ہیں کہ اس پر زکوٰۃ عائد ہوتی ہے۔ کیا ایسے شخص کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے؟

(۴) عورت سروس کرتی ہے، مال دار ہے، صاحبِ نصاب ہے، لیکن اس کا شوہر غریب اور بے روزگار ہے۔ کیا عورت اپنی زکوٰۃ اپنے شوہر کو دے سکتی ہے؟

جواب: ادائے زکوٰۃ کی صحت کے لیے ایک بنیادی بات یہ ہے کہ زکوٰۃ دینے والے اور زکوٰۃ لینے والے کے درمیان ایسا رشتہ نہ ہو کہ وہ مملوکہ اشیاء سے استفادے میں شریک رہتے ہوں، یا زکوٰۃ قبول کرنے والے زکوٰۃ ادا کرنے والے کے زیر کفالت ہوں یا ان کے درمیان ولادت کا رشتہ نہ ہو۔ اسی بنا پر ماں باپ، دادا دادی، نانا نانی، بیٹوں، پوتوں، بیٹیوں نواسیوں کو زکوٰۃ نہیں دی جاسکتی۔ البتہ دیگر رشتے داروں کو مثلاً بھائی، بہن، چچا، پھوپھی، خالہ، ماموں وغیرہ کو، اگر وہ غریب اور مستحق ہوں، زکوٰۃ دی جاسکتی ہے[۲]

حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی اجنبی شخص کو زکوٰۃ دینے سے جتنا ثواب ملتا ہے، اس کا دوگنا ثواب رشتے داروں کو دینے سے ملتا ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا:

اَلصَّدَقَةُ عَلَى الْمِسْكِيْنِ صَدَقَةٌ وَ هِيَ عَلٰى ذِي الرَّحِمِ ثِنْتَانِ صَدَقَةٌ وَ صِلَةٌ[۳]

---

(۱) فقہ السنۃ، ۱/ ۴۷-۴۸، الموسوعۃ الفقہیۃ، ۲۳/ ۳۰۰، الفقہ الاسلامی وادلتہ، ۲/ ۸۰۲

(۲) الموسوعۃ الفقہیۃ، کویت، ۲۳/ ۳۲۶، فقہ السنۃ، سید سابق، بیروت، ۱/ ۴۰۱

(۳) ترمذی، کتاب الزکاۃ، باب ماجاء فی الصدقۃ علی ذی القرابۃ ۶۵۸

''مسکین کو صدقہ دینا باعثِ اجر ہے اور رشتے دار کو دینے سے دوہرا اجر ملتا ہے۔ ایک صدقے کا، دوسرا صلہ رحمی کا۔''

(۲) قرآن کریم میں زکوٰۃ کے آٹھ مصارف بیان کیے گئے ہیں۔ ضروری نہیں کہ اسے جملہ مصارف میں خرچ کیا جائے۔ بلکہ حسبِ ضرورت اور حسبِ موقع ان میں سے کسی ایک یا ایک سے زائد مدات میں زکوٰۃ دی جاسکتی ہے۔

اسی طرح زکوٰۃ متعدد افراد کو بھی دی جاسکتی ہے اور کسی ایک شخص کو بھی اس کا مالک بنایا جاسکتا ہے۔ بلکہ بہتر طریقہ یہ ہے کہ دو دو چار چار روپے تقسیم کرنے کی بجائے کسی ایک شخص کو زکوٰۃ کی اتنی رقم دے دی جائے کہ اس کی کوئی بنیادی ضرورت پوری ہو جائے۔

فقہاء نے لکھا ہے کہ کسی ایک شخص کو زکوٰۃ کی زیادہ سے زیادہ اتنی رقم دی جاسکتی ہے جو اس کے نصاب کو نہ پہنچے۔ لیکن موجودہ دور میں اس بات کی کوئی معنویت نہیں رہ گئی ہے۔ بعض امراض کے آپریشن میں ہزاروں نہیں، لاکھوں روپے خرچ ہوتے ہیں۔ بعض دیگر ایسی ضرورتیں ہوسکتی ہیں جن میں نصابِ زکوٰۃ سے کم مقدار کی رقم کفایت نہیں کرسکتی۔ ایسی صورت میں حسب ضرورت کسی ایک شخص کو مقدارِ نصاب سے زیادہ زکوٰۃ بھی دی جاسکتی ہے۔(۱)

(۳) کوئی عورت اپنے زیورات کی وجہ سے صاحبِ نصاب ہے، لیکن اس کا شوہر غریب اور ضرورت مند ہے تو ایسے شخص کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے اور یہ شخص اس رقم کو اپنی گھریلو ضروریات میں خرچ کرے گا تو اس عورت کے اس سے فائدہ اٹھانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ عہد نبوی کے ایک واقعے سے ہمیں اس سلسلے میں رہ نمائی ملتی ہے۔

بریرہ نامی ایک باندی کا رسول اللہ ﷺ کی ازواج مطہرات کے گھروں میں آنا جانا تھا۔ لوگ اسے جو چیزیں بہ طور صدقہ دیتے تھے، وہ انھیں بھی ازدواجِ مطہرات کے یہاں لے آتی تھی۔ انھیں ان چیزوں کے استعمال میں تردد ہوتا تھا۔ ام المومنین حضرت عائشہؓ نے اس سلسلے میں رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا تو آپؐ نے جواب دیا:

هُوَ عَلَيهَا صَدَقَةٌ وَلَكُمْ هَدِيَّةٌ فَكُلُوهُ(۲)

''وہ اس کے لیے صدقہ اور تمھارے لیے ہدیہ ہے، تم اسے کھاسکتی ہو۔''

---

(۱) اس موضوع پر ملاحظہ کیجیے: قاموس الفقہ، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، کتب خانہ نعیمیہ دیوبند، ۴/۸۷، ۸۸

(۲) صحیح مسلم، كتاب الزكاة، باب اباحة الهدية للنبي ﷺ... ۱۰۷۵

ایک مرتبہ آپؐ گھر میں داخل ہوئے۔ اس وقت ہانڈی میں گوشت پک رہا تھا۔ آپؐ کی خدمت میں کھانے کے لیے روٹی سالن پیش کیا گیا تو آپؐ نے فرمایا: ہانڈی میں گوشت بھی تو ہے۔ آپؐ سے بتایا گیا کہ یہ گوشت بریرہ کو صدقے میں ملا تھا اور آپ چوں کہ صدقہ نہیں کھاتے، اسی لیے اس میں سے آپ کو نہیں دیا گیا۔ آپؐ نے فرمایا:

عَلَيْهَا صَدَقَةٌ وَلَنَا هَدِيَّةٌ (۱)

''یہ اس کے لیے صدقہ ہے اور ہمارے لیے ہدیہ۔''

(۴) اسلام کے نزدیک عورت کی قدر افزائی کا مظہر یہ ہے کہ اس نے اس کی ملکیت تسلیم کی ہے، جب کہ بیش تر مذاہب اور تہذیبوں میں وہ اس حق سے محروم رہی ہے اور مغربی ممالک میں بھی اسے یہ حق بیسویں صدی میں جا کر مل سکا ہے۔ عورت جو کچھ کمائے اسلام کی نظر میں وہ اس کی مالک ہے۔ شوہر کو حق نہیں کہ اس پر قبضہ جمالے اور اس میں اپنی مرضی سے تصرف کرے۔

فقہاء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ شوہر اپنی زکوٰۃ اپنی بیوی کو نہیں دے سکتا۔ اس لیے کہ وہ اس کے زیر کفالت ہوتی ہے۔ لیکن بیوی شوہر کو زکوٰۃ دے سکتی ہے یا نہیں؟ اس میں اختلاف ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک نہیں دے سکتی، اس لیے کہ شوہر اس رقم کو گھریلو ضروریات میں خرچ کرے گا تو اس کا فائدہ عورت کو بھی پہنچے گا۔ دیگر فقہاء جن میں امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمدؒ (ایک قول کے مطابق) ابن المنذرؒ، امام ابوحنیفہ کے دونوں شاگرد قاضی ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ اور اہل ظاہر قابل ذکر ہیں، اس کے جواز کے قائل ہیں (۲)

ان حضرات کی دلیل حضرت ابوسعید خدریؓ سے مروی وہ مشہور روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی بیوی حضرت زینبؓ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا: اے اللہ کے نبی! میرے پاس کچھ زیورات ہیں، آپؐ نے صدقہ کرنے کی ترغیب دی ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ ان زیورات کو صدقہ کردوں۔ گھر میں تذکرہ کیا تو میرے شوہر ابن مسعود کہتے ہیں کہ وہ اور ان کے بچے اس کے زیادہ مستحق ہیں۔ نبی ﷺ نے جواب دیا:

---

(۱) بخاری، کتاب الطلاق، باب لا یکون بیع الامة طلاقاً ۵۲۷۹

(۲) الموسوعۃ الفقہیۃ، ۳۲۷/۲۳، فقہ السنۃ، ۴۰۶/۱-۴۰۷، قاموس الفقہ، ۸۶/۴-۸۷

صَدَقَ ابْنُ مَسْعُوْدٍ زَوْجُكِ وَ وَلَدُكِ اَحَقُّ مَنْ تَصَدَّقْتِ بِهٖ عَلَیْهِمْ (۱)

''ابن مسعودؓ نے سچ کہا۔ تمھارا شوہر اور تمھارے بچے اس کے زیادہ مستحق ہیں کہ تم ان پر صدقہ کرو۔''

اس حدیث میں 'صدقہ' کا لفظ آیا ہے، جس کا اطلاق زکوٰۃ اور نفلی صدقات دونوں پر ہوتا ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کہتے ہیں کہ حدیث میں نفلی صدقہ مراد ہے۔ جب کہ دیگر فقہاء اسے زکوٰۃ کے معنی میں لیتے ہیں۔

بہ ہر حال اصولی طور پر یہ بات طے ہے کہ زکوٰۃ کسی ایسے شخص کو دینی جائز نہیں ہے جس سے اس کا فائدہ خود زکوٰۃ دینے والے کو پہنچے۔

(۳)

سوال: بہ راہ کرم زکوٰۃ کے سلسلے میں چند سوالات کے جوابات سے نوازیں:

(۱) اب عموماً سرکاری ملازمین کا مشاہرہ ان کے اکاؤنٹ میں پہنچ جاتا ہے۔ اس طرح ہر ماہ اکاؤنٹ میں رقم آتی رہتی ہے اور حسبِ ضرورت خرچ ہوتی رہتی ہے۔ زکوٰۃ کا حساب کیسے کیا جائے گا اور زکوٰۃ کس رقم پر دیں گے؟

(۲) اکاؤنٹ میں انٹرسٹ کی رقم بھی شامل رہتی ہے۔ کیا زکوٰۃ کا حساب کرتے وقت انٹرسٹ کی رقم کو منہا کر کے حساب کیا جائے گا؟ اگر کوئی شخص اکاؤنٹ کی کل رقم بہ شمول انٹرسٹ کے حساب سے زکوٰۃ نکال دے تو وہ گناہ گار ہوگا؟

جواب: (۱) ایک سال کی ابتدا اور اختتام پر اگر کوئی شخص نصاب زکوٰۃ کا مالک ہے تو درمیانِ سال میں اس کے مال میں کمی بیشی سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ ہاں اگر سال کے درمیان میں کسی وقت اس کا مال بالکل ختم ہو گیا ہو تو اس پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی اور دوبارہ نصابِ زکوٰۃ کا مالک بننے کے بعد از سرِ نو سال گزرنے کا حساب کیا جائے گا۔

مثال کے طور پر ایک شخص ہر سال رمضان میں اپنی زکوٰۃ نکالتا ہے۔ گزشتہ سال اس

---

(۱) بخاری، کتاب الزکاۃ، باب الزکاۃ علی الاقارب ۱۴۶۲، مسلم: ۸۰

کے پاس ایک لاکھ روپے تھے۔ چھ ماہ کے بعد اس نے یہ پوری رقم کسی کام میں خرچ کرلی۔ کچھ دنوں بعد پھر اس کے پاس ایک لاکھ روپے آگئے تو اس رمضان میں اس پر زکوٰۃ عائد نہ ہوگی۔ جب تک کہ دوبارہ حاصل شدہ اس رقم پر ایک سال نہ گزر جائے۔

لیکن اگر سال کے درمیان کسی وقت پوری رقم خرچ نہیں ہوئی ہے، اس کا کچھ حصہ باقی رہا ہے تو سال کے آخر میں جتنی رقم ہوگی اس کے حساب سے زکوٰۃ دینی ہوگی۔

مثال کے طور پر اگر کسی شخص کے پاس سال کی ابتدا میں ایک لاکھ روپے تھے۔ درمیانِ سال اس میں سے کچھ رقم خرچ ہوتی رہی اور کچھ رقم کا اضافہ ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ سال کے آخر میں اس کے پاس تین لاکھ ہیں تو اب اسے تین لاکھ روپے کی زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی۔ یہ اضافہ شدہ رقم اصل نصاب کے تابع ہوگی۔

یہ حکم احناف کے نزدیک ہے۔ شافعیہ کے نزدیک اضافہ شدہ رقم پر بھی سال کا گزرنا ضروری ہے، تبھی اس پر زکوٰۃ عائد ہوگی[۱]

(۲) بینک انٹرسٹ کو عموماً علماء نے 'ربوٰ' (سود) قرار دیا ہے، جسے اسلامی شریعت میں حرام کہا گیا ہے۔ اس لیے اس کا حساب رکھنا چاہیے اور انٹرسٹ کی رقم کو اپنے ذاتی کاموں میں نہ استعمال کرنا چاہیے۔ لیکن اگر کوئی شخص انٹرسٹ کی رقم کو منہا کیے بغیر اکاؤنٹ کی رقم سے حساب کرکے زکوٰۃ نکال دے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ ظاہر ہے، انٹرسٹ کی رقم کو منہا کرکے وہ حساب کرتا تو زکوٰۃ کی جو رقم نکلتی، منہا کیے بغیر حساب کرنے سے زکوٰۃ کی رقم اس سے زیادہ بنے گی۔ لیکن یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ ایسا کرنے سے نہ انٹرسٹ کی رقم اس کے لیے پاک ہوجائے گی اور نہ اس زائد نکالی گئی رقم کو انٹرسٹ کی رقم میں ایڈجسٹ کرنا اس کے لیے روا ہوگا۔

(۴)

سوال: زکوٰۃ کے درج ذیل مسائل کی براہِ کرم قرآن وحدیث کی روشنی میں وضاحت فرمائیے:

(۱) زکوٰۃ کے لیے سونے اور چاندی کا الگ الگ نصاب متعین ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں

---

(۱) ملاحظہ کیجیے: قاموس الفقہ، ۴/ ۶۴-۶۵، بہ حوالہ: بدائع الصنائع، ۲/ ۱۳، شرح المہذب: ۵/ ۳۶۴، الفقہ الاسلامی وادلّتہ، ۲/ ۷۴۴

کہ اگر کسی کے پاس اتنی مقدار میں سونا ہو کہ نصاب تک پہنچ جائے اور اتنی مقدار میں چاندی ہو کہ نصاب تک پہنچ جائے تبھی زکوٰۃ واجب ہوگی، اگر دونوں الگ الگ اپنے نصاب سے کم ہوں تو ان پر زکوٰۃ نہیں ہے، جب کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اگر دونوں کو ملاکر ان کی مالیت کسی ایک کے نصاب کے برابر پہنچ جائے تو زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی۔ ان میں سے کون سی بات صحیح ہے؟

(۲) ماں نے اپنے بیٹے کی شادی کے موقع پر ہونے والی بہو کے لیے کچھ زیورات خریدے۔ شادی زیورات کی خریداری کے ڈیڑھ سال بعد ہوئی۔ ان زیورات کی زکوٰۃ کا حساب کریں گے تو وہ کس پر واجب ہوگی؟ ماں پر یا بیٹے پر؟

(۳) ماں نے ایک خلیجی ملک سے چند سونے کے سکے خریدے اور وطن پہنچ کر انھیں بیچ کر کچھ زیورات بنوا لیے۔ جب زکوٰۃ کا حساب کریں گے تو کیا سونے کے سکوں پر بھی زکوٰۃ دینی پڑے گی؟

جواب: (۱) اگر کسی شخص کے پاس سونے اور چاندی کے زیورات اتنی مقدار میں ہوں کہ دونوں الگ الگ نصاب کو نہ پہنچتے ہوں تو ان پر وجوب زکوٰۃ کے معاملے میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے۔ احناف اور مالکیہ کے نزدیک دونوں کو ملا کر اگر کسی ایک کا نصاب پورا ہو جائے تو زکوٰۃ واجب ہو جائے گی۔ یہی امام ثوریؒ اور امام اوزاعیؒ کی بھی رائے ہے۔ امام شافعیؒ کے نزدیک دونوں کو ملایا نہیں جائے گا۔ زکوٰۃ اسی وقت واجب ہوگی جب دونوں یا ان میں سے کسی ایک کا نصاب پورا ہو جائے۔ امام احمدؒ سے دو رائیں مروی ہیں۔ فقہاء کے اپنے اپنے دلائل ہیں، تفصیل کتبِ فقہ میں دیکھی جاسکتی ہے۔

(۲) امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک زیورات میں زکوٰۃ عائد ہوتی ہے (دیگر ائمہ کے نزدیک استعمالی زیورات پر زکوٰۃ نہیں ہے) زکوٰۃ کی ادائی اس کے ذمے ہوگی جو ان کا مالک ہو۔ کسی عورت نے اپنی ہونے والی بہو کے لیے زیورات خریدے تو شادی سے قبل تک اسی کو زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی اور شادی کے بعد جب بہو ان کی مالک ہو جائے گی تو زکوٰۃ کی ادائی اس کے ذمے ہوگی۔

(۳) سونا چاہے سکوں کی شکل میں ہو یا زیورات کی شکل میں، دونوں صورتوں میں اس پر زکوٰۃ عائد ہوتی ہے۔

روزہ کے چند مسائل

سوال: (۱) کیا روزہ کی حالت میں کسی شخص کو خون دیا جاسکتا ہے؟ خون نکلوانے سے روزہ ٹوٹ جائے گا یا باقی رہے گا؟

(۲) کیا روزہ کی حالت میں آنکھ میں دوا ڈالی جاسکتی ہے؟ اس سے روزہ نہیں ٹوٹے گا؟

(۳) سعودی عرب میں عموماً ایک دن پہلے رمضان المبارک کا روزہ شروع ہوتا ہے۔ ایک شخص نے رمضان کا آغاز سعودی عرب میں کیا، پھر آخری عشرہ میں وہ اپنے وطن (ہندوستان) آ گیا۔ یہاں ۲۹/ رمضان المبارک کو عید کا چاند نظر نہیں آیا۔ چنانچہ رؤیت ہلال کمیٹی نے تیسواں روزہ رکھے جانے کا اعلان کر دیا۔ اس شخص کے تیس روزے ۲۹/ رمضان ہی کو پورے ہو چکے ہیں۔ کیا اسے تیس رمضان المبارک کو روزہ رکھنا ہوگا؟ جب کہ وہ اس کا اکتیسواں روزہ ہوگا۔

جواب: (۱) روزہ کی حالت میں رسول اللہ ﷺ سے پچھنہ لگوانا ثابت ہے۔ حضرت ابن عباسؓ بیان کرتے ہیں:

اِنَّ النَّبِیَّ ﷺ اِحْتَجَمَ وَ هُوَ صَائِمٌ (۱)

''نبی ﷺ نے پچھنہ لگوایا، جب کہ آپؐ روزہ سے تھے۔''

پچھنہ لگوانے کو عربی میں 'حجامۃ' کہا جاتا ہے۔ یہ ایک طبی عمل ہے، جس کے ذریعے جسم کے بعض مخصوص مقامات سے خون نکلوایا جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جسم سے خون نکلنے سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔ اس لیے دورانِ روزہ جسم سے خون نکلوایا جاسکتا ہے۔ خواہ ٹیسٹ کروانے کے لیے یا کسی مریض کو دینے کے لیے۔

البتہ اگر خون نکلوانے سے بہت زیادہ ضعف پیدا ہو جانے کا امکان ہو اور اندیشہ ہو کہ

---

(۱) بخاری، کتاب الصوم، باب الحجامة والقیء للصائم ۱۹۳۸، مسلم: ۱۲۰۲

روزہ خطرے میں پڑ جائے گا تو اس سے بچنا چاہیے اور دن میں دورانِ روزہ خون نکلوانے کے بجائے افطار کے بعد نکلوانا چاہیے۔ مشہور صحابیِ رسول حضرت انس بن مالکؓ سے کسی نے دریافت کیا: کیا آپ لوگ عہد نبوی میں روزہ دار کے لیے پچھنہ لگوانا مکروہ سمجھتے تھے۔ انھوں نے جواب دیا: نہیں، الاّ یہ کہ کمزوری کا اندیشہ ہو۔'' (۱)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے بارے میں مروی ہے کہ وہ پہلے دورانِ روزہ دن میں پچھنہ لگوایا کرتے تھے، مگر پھر بعد میں ترک کر دیا اور صرف رات میں پچھنہ لگوانے لگے۔(۲)

(۲) آنکھوں اور ناک کے درمیان ایک باریک سی نالی ہوتی ہے جسے انبوب انفی دمعی (Nasolacrimal Duct) کہتے ہیں۔ اگر آنکھوں میں آنسو کی زیادتی ہو تو زاید آنسو اسی نالی کے ذریعے ناک میں پہنچ جاتے ہیں۔ آنکھ میں دوا ڈالنے سے وہ اسی نالی کے ذریعے ناک میں اور وہاں سے حلق میں پہنچ جاتی ہے اور اس کا اثر حلق میں ظاہر ہوتا ہے۔

روزہ کی حالت میں آنکھ میں دوا ڈالنے کے سلسلہ میں فقہاء کا اختلاف ہے۔ احناف کے نزدیک اس سے روزہ نہیں ٹوٹے گا، چاہے دوا کا اثر حلق میں محسوس ہو۔ شوافع کی بھی یہی رائے ہے۔ لیکن مالکیہ اور حنابلہ کی رائے ہے کہ اگر دوا کا اثر حلق میں ظاہر ہو جائے تو روزہ ٹوٹ جائے گا۔(۳)

بین الاقوامی اسلامی فقہ اکیڈمی جدہ نے اپنے دسویں اجلاس منعقدہ جدہ ۱۹۹۷ء میں 'علاج معالجہ کے میدان میں روزہ توڑنے والی چیزیں' کے موضوع پر جو قراردادیں منظور کی تھیں ان میں سے ایک قرارداد یہ بھی تھی:

> '' آنکھ میں ٹپکانے والی دوا، کان میں ٹپکانے والی دوا، کان دھونے والی دوا، ناک میں ٹپکانے والی دوا، ناک میں پچکاری سے دی جانے والی دوا سے روزہ نہیں ٹوٹے گا، اگر جو کچھ حلق میں پہنچے اسے نگلنے سے اجتناب کیا جائے۔''

ساتھ ہی یہ بھی سفارش کی تھی کہ '' مریض کو چاہیے کہ علاج کی مذکورہ بالا صورتوں میں

---

(۱) بخاری، حوالہ سابق ۱۹۴۰

(۲) بخاری، کتاب الصوم، باب الحجامۃ

(۳) الموسوعۃ الفقہیۃ، کویت، ۲۸/ ۷۲

سے جن کو افطار کے بعد تک موخر کرنے میں کوئی ضرر نہ پہنچے، انھیں افطار کے بعد تک موخر کردے۔''(۱)

(۳) اس معاملے میں آدمی جس جگہ ہو وہاں کا اعتبار کیا جائے گا۔ اگر ہندوستان کے لوگ رمضان کا تیسواں روزہ رکھ رہے ہیں تو اس دن اسے بھی روزہ رکھنا چاہیے، چاہے اس کے تیس دن کے روزے پورے ہو گئے ہوں اور یہ اس کا اکتیسواں روزہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَمَنْ شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ط (البقرۃ:۱۸۵)

''جو شخص اس مہینے کو پائے اس کو لازم ہے کہ اس میں روزہ رکھے۔''

اس آیت کے الفاظ سے اشارہ مل رہا ہے کہ آدمی جس جگہ پہنچے وہاں اگر رمضان کا مہینہ چل رہا ہو تو اسے روزہ رکھنا چاہیے۔

سفر میں روزہ

سوال: سفر میں روزہ نہ رکھنے کی اجازت دی گئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے رخصت ہے، اس لیے اس سے ضرور فائدہ اٹھانا چاہیے۔ دوسری جانب آج کے دور میں سفر بڑے آرام دہ اور پر تعیش ہو گئے ہیں۔ ذرا بھی دشواری اور پریشانی کا احساس نہیں ہوتا، بلکہ بسا اوقات سفر میں گھر سے زیادہ آرام ملتا ہے۔ اس صورت حال میں کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ اگر رمضان میں کہیں سفر کرنا پڑ جائے تو دورانِ سفر بھی روزہ رکھ لیا جائے؟

جواب: ماہ رمضان کے روزوں کی فرضیت کا اعلان کرنے کے ساتھ ہی سفر میں روزہ نہ رکھنے کی اجازت دی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ط فَمَنْ كَانَ مِنكُمْ مَّرِيضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ط (البقرۃ:۱۸۴)

---

(۱) جدید فقہی مسائل اور ان کا مجوزہ حل، طبع کراچی، ۲۰۰۶ء، ص ۲۵۳، ۲۵۵

''چند مقررہ دنوں کے روزے ہیں۔ اگر تم میں سے کوئی بیمار ہو یا سفر پر ہو تو دوسرے دنوں میں اتنی ہی تعداد پوری کر لے۔''

اس آیت میں رمضان کے دنوں میں روزہ نہ رکھنے اور دوسرے دنوں میں ان کی قضا کرنے کی اجازت مشقت اور پریشانی سے متعلق نہیں کی گئی ہے کہ اگر مشقت ہو تو روزہ نہ رکھو، مشقت نہ ہو تو روزہ رکھو، بلکہ اس اجازت کو سفر سے متعلق کیا گیا ہے۔ اس لیے سفر چاہے پُرمشقت ہو یا آرام دہ، آدمی اس سہولت سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ اس میں کوئی برائی نہیں ہے اور یہ تقویٰ و پرہیز گاری کے بھی خلاف نہیں ہے۔

سفر میں روزہ رکھنے یا نہ رکھنے کے سلسلے میں رسول اللہ ﷺ کے معمولات اور ہدایات دونوں طرح کی ملتی ہیں۔ بعض اسفار میں آپؐ نے کچھ دن روزہ رکھا، اس کے بعد ترک کر دیا اور صحابہ کو یہ بتانے کے لیے کہ آپؐ روزہ سے نہیں ہیں، آپؐ نے دودھ کا پیالہ منگوایا اور سب کے سامنے اسے نوش فرمایا(۱)

ایک سفر میں کچھ لوگ روزہ سے تھے اور کچھ روزہ سے نہیں تھے۔ پڑاؤ پر پہنچے تو روزہ دار نڈھال ہو کر لیٹ گئے اور جو روزہ سے نہیں تھے انھوں نے خیمے لگائے اور دوسرے کام انجام دیے۔ آپؐ نے روزہ داروں کے مقابلے میں غیر روزہ داروں کی تعریف و تحسین فرمائی(۲) ایک موقع پر آپؐ نے دیکھا کہ ایک بزرگ بڑے نڈھال سے ہیں، لوگوں نے ان پر سایہ کر رکھا ہے۔ آپؐ نے دریافت فرمایا: انھیں کیا ہو گیا ہے؟ آپ کو بتایا گیا کہ یہ روزہ سے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا ''سفر میں روزہ رکھنا کوئی نیکی کا کام نہیں ہے۔''(۳)

دوسری طرف ایسی روایات بھی ملتی ہیں کہ سفر میں آپؐ نے بھی روزہ رکھا ہے اور صحابۂ کرام نے بھی۔ حضرت انس بن مالکؓ بیان کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سفر کرتے تھے۔ کچھ لوگ روزہ رکھتے تھے اور کچھ نہیں رکھتے تھے، لیکن کوئی کسی کو ملامت نہیں کرتا تھا۔''(۴)

---

(۱) مسلم، کتاب الصیام، باب استحباب الفطر للحاج... ۱۱۴

(۲) بخاری، کتاب الجهاد والسیر، باب فضل الخدمة فی الغزو ۲۸۹۰، مسلم: ۱۱۱۹

(۳) بخاری، کتاب الصوم، باب قول النبی لمن ظلّل علیه واشتد الحر ۱۹۴۶، مسلم: ۱۱۱۵

(۴) بخاری، کتاب الصوم، باب لم یعب اصحاب النبی بعضهم بعضاً ۱۹۴۷، مسلم: ۱۱۱۸

حضرت ابوسعید الخدریؓ فرماتے ہیں کہ ''ہم نے بار ہا رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ایسے سفر کیے ہیں کہ آپؐ بھی روزہ رکھتے تھے اور ہم بھی۔''(۱)

حضرت حمزہ بن عمرو اسلمیؓ نے ایک مرتبہ آں حضرت ﷺ کی خدمت میں عرض کی:

''اے اللہ کے رسول، میں اکثر سفر پر رہتا ہوں۔ بسا اوقات دوران سفر رمضان آجاتا ہے۔ میں نوجوان ہوں، روزہ رکھ سکتا ہوں۔ مجھے یہ آسان معلوم ہوتا ہے کہ دورانِ سفر روزہ رکھ لوں، اس کے مقابلے میں کہ نہ رکھوں اور بعد میں مجھے اس کی قضا کرنی پڑے۔ اس صورت حال میں میرا روزہ رکھنا بہتر ہے یا نہ رکھنا؟ آپؐ نے فرمایا:

اِنْ شِئْتَ فَصُمْ وَ اِنْ شِئْتَ فَاَفْطِرْ (۲)

''چاہو تو روزہ رکھو اور چاہو تو نہ رکھو۔''

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ سفر میں آدمی کو اختیار ہے۔ چاہے روزہ رکھ لے، چاہے نہ رکھے اور بعد میں اس کی قضا کرے۔

اعتکاف کے آداب

سوال: میں ایک مدرسہ میں کام کرتا ہوں، مدرسہ کے ناظم ہر سال رمضان کے آخری دس دنوں میں اعتکاف کرتے ہیں۔ ان کے ساتھ مدرسہ کے دیگر ذمہ دار اور اساتذہ بھی اعتکاف کرتے ہیں۔ مدرسہ میں نئے سال کی تعلیم شوال سے شروع ہوتی ہے، اس لیے داخلہ فارم رمضان میں آتے ہیں، انھیں چیک کر کے جواب دینا ہوتا ہے۔ یہ سارا دفتری کام ناظم صاحب دوران اعتکاف انجام دیتے ہیں۔ داخلہ چاہنے والے جو لوگ آتے ہیں ان سے ملاقات بھی کرتے ہیں۔ اس طرح ایک اعتبار سے پورا دفتر نظامت رمضان کے آخری دس دنوں میں مسجد میں منتقل ہوجاتا ہے۔ ناظم صاحب اعتکاف میں موبائل بھی اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔ اس طرح وہ باہر کے لوگوں سے برابر رابطہ میں رہتے ہیں۔

یہ چیزیں مجھے اعتکاف کی روح کے خلاف معلوم ہوتی ہیں۔ بہ راہ کرم رہ نمائی فرمائیں۔ کیا دورانِ اعتکاف ان کاموں کی انجام دہی کی اجازت ہے؟

---

(۱) مسلم، کتاب الصیام، باب اجر المفطر فی السفر اذا تولی العمل ۱۱۲۰

(۲) ابو داؤد، کتاب الصوم، باب الصوم فی السفر ۲۴۰۳۔ علامہ البانی نے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔

جواب: اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرنے کی نیت اور عبادت کی غرض سے مسجد میں ٹھہرنے کو اعتکاف کہا جاتا ہے۔ قرآن و حدیث میں اس کا تذکرہ تحسین کے انداز میں کیا گیا ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ سے ثابت ہے کہ آپؐ نے ایک مرتبہ رمضان کے ابتدائی دس دنوں میں اور ایک مرتبہ وسطی دس دنوں میں اعتکاف کیا، مگر پھر رمضان کے آخری عشرہ میں اعتکاف کا معمول بنالیا۔ ایک مرتبہ بعض وجوہ سے آپ نے اعتکاف نہیں کیا تو شوال کے ابتدائی دس دنوں میں اس کا اہتمام کیا۔

اعتکاف کی روح یہ ہے کہ آدمی کچھ عرصہ نفسانی خواہشات اور دنیاوی کاروبار سے الگ ہوکر کلی طور پر اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اُس کے ذکر میں لگا رہے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے لکھا ہے۔

> ''مسجد میں اعتکاف دل جمعی، صفائی قلب، اللہ کی عبادت و اطاعت میں انہماک، ملائکہ سے تشبہ اور شب قدر کے حصول کا ذریعہ ہے۔'' (۱)

الموسوعۃ الفقہیۃ کویت میں اعتکاف کے بارے میں لکھا گیا ہے:

> ''اعتکاف کرنے والا اللہ کا تقرب حاصل کرنے کے لیے اپنی ذات کو اس کی عبادت کے لیے وقف کردیتا ہے اور ان دنیاوی مشاغل سے خود کو الگ کرلیتا ہے جو تقرب الٰہی میں مانع بنتے ہیں۔ وہ اپنے تمام اوقات کو نمازوں کی ادائی یا ان کے انتظار میں صرف کرتا ہے۔ اعتکاف کی مشروعیت کا مقصد اصلی یہ ہے کہ اعتکاف کرنے والے کی تمام نمازیں جماعت کے ساتھ ادا ہوں اور اس کی ذات ملائکہ کے مشابہ ہوجائے، جو اللہ کے کسی حکم سے سرتابی نہیں کرتے اور وہ تمام کام انجام دیتے ہیں جن کا انھیں حکم دیا جاتا ہے اور دن رات بغیر کسی توقف کے اس کی تسبیح بیان کرتے رہتے ہیں۔'' (۲)

حافظ ابن قیم الجوزیہؒ نے اپنی کتاب زاد المعاد میں اعتکاف کے سلسلے میں بہت اچھی بحث کی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے:

> ''اعتکاف کا مقصود اور اس کی روح یہ ہے کہ قلب اللہ تعالیٰ کی جانب پورے طور سے

---

(۱) حجۃ اللہ البالغۃ، دار الجیل، بیروت، ۲۰۰۵ء، ۲/ ۸۶

(۲) الموسوعۃ الفقہیۃ کویت، ۵/ ۲۰۷، بہ حوالہ فتاویٰ عالم گیری، ۱/ ۲۱۲

متوجہ ہو، اس کی طرف اسے مکمل انہماک اور دل جمعی حاصل ہو، مخلوق سے وہ بالکل کٹ جائے اور صرف اللہ سبحانہ سے اس کا رابطہ ہو اور یہ حال ہو جائے کہ تمام افکار و تردّدات اور ہموم و وساوس کی جگہ اللہ کا ذکر اور اس کی محبت لے لے، ہر فکر اس کی فکر میں ڈھل جائے، اس کی زبان ہر وقت اس کے ذکر سے تر رہے، ہر وقت وہ اس کی رضا اور قرب حاصل کرنے کے لیے فکر مند رہے، اس میں مخلوق سے انس کے بجائے اللہ سے انس پیدا ہو، تاکہ قبر کی وحشت میں جب کوئی اس کا غم خوار نہ ہوگا یہ انس اس کا زاد سفر بنے۔ یہ ہے اس اعتکاف کا مقصد جو رمضان کے آخری عشرے کے ساتھ مخصوص ہے۔'' (۱)

اس کے بعد علامہ ابن قیمؒ نے اعتکاف کے معمولات نبوی کا تذکرہ کرکے آخر میں لکھا ہے:

''اس کے برخلاف جاہل لوگ جائے اعتکاف کو ملنے جلنے کی جگہ بنا لیتے ہیں۔ اعتکاف کی حالت میں لوگ ان سے ملنے کے لیے کثرت سے آتے ہیں۔ وہ ان کے ساتھ بیٹھ کر ادھر ادھر کی باتیں کرتے ہیں۔ یہ اعتکاف کا ایک انداز ہے، جب کہ نبی ﷺ کے اعتکاف کا دوسرا انداز تھا۔'' (۲)

فقہاء نے اعتکاف کے آداب پر تفصیل سے لکھا ہے۔ ان کے مطابق:

''اعتکاف کرنے والے کو چاہیے کہ وہ کثرت سے نوافل پڑھے، قرآن کی تلاوت کرے، سبحان اللہ، الحمد للہ، لا الہ الا اللہ، اللہ اکبر اور دوسرے اذکار کا ورد کرے، توبہ و استغفار کرے، نبی ﷺ پر درود و سلام بھیجے۔ دعا کرے اور دیگر ایسے اعمال انجام دے جن سے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوتا ہے اور بندہ خالق سے قریب ہو جاتا ہے۔ اسی طرح وہ دوران اعتکاف حصول علم کی تدابیر اختیار کر سکتا ہے۔ اس کے لیے وہ تفسیر، حدیث، انبیاء و صالحین کی سیرت، فقہ اور دیگر دینی موضوعات پر کتابوں کا مطالعہ کرے۔'' (۳)

اس تفصیل سے واضح ہوا کہ دورانِ اعتکاف دفتری مشاغل اختیار کرنا اعتکاف کی

---

(۱) زاد المعاد فی ہدی خیر العباد، موسسۃ الرسالہ بیروت، ۱۹۹۴ء، ۲/ ۸۳

(۲) حوالہ سابق، ۲/ ۸۶

(۳) فقہ السنۃ، سید سابق، دار الکتاب العربی بیروت، ۱۹۷۷ء، ۱/ ۴۸۰

روح کے خلاف ہے۔ جو لوگ کسی مدرسہ، تنظیم یا ادارہ کے ذمہ دار ہوں وہ اگر اعتکاف کرنا چاہیں تو انھیں اپنی ذمہ داری کسی دوسرے کو منتقل کر دینی چاہیے۔ اسی طرح دوران اعتکاف موبائل فون کے استعمال سے بھی حتی الامکان اجتناب کرنا چاہیے کہ اس سے ذکر و عبادت میں خلل کا قوی امکان رہتا ہے۔

کیا عید کی نماز اگلے دن پڑھی جا سکتی ہے؟

سوال: امسال رمضان المبارک کی ۲۹/ تاریخ کو چاند نظر آ گیا اور اگلے دن عید الفطر ہونے کا اعلان کر دیا گیا۔ لیکن عید کے دن صبح ہی سے زبردست بارش ہونے لگی، جو دیر تک ہوتی رہی۔ سڑکیں، راستے اور میدان پانی سے بھر گئے۔ بالآخر عید گاہ کے امام صاحب نے اعلان کر دیا کہ آج عید کی نماز نہیں پڑھی جائے گی، اس کے بجائے کل نماز ہوگی۔ اس سلسلے میں لوگوں میں اختلاف ہو گیا اور دو گروپ بن گئے۔ کچھ لوگوں نے امام صاحب کی تائید کی، جب کہ دوسرے لوگوں نے کہا کہ عید کا دن گزر جانے کے بعد اگلے دن اس کی نماز پڑھنا صحیح نہیں ہے۔

بہ راہ کرم اِس مسئلے میں صحیح بات واضح فرمائیں۔ کیا عید کی نماز کسی عذر کی بِنا پر عید کے اگلے دن پڑھنا درست ہے؟

جواب: عید کی نماز کا وقت طلوع آفتاب کے تھوڑی دیر بعد سے زوال آفتاب تک ہے۔ اگر عید کے دن اس وقت کے دوران نماز ادا نہ کی جا سکے تو کیا اگلے دن اس کی ادائیگی کی جا سکتی ہے؟ اس کی تین صورتیں ہیں:

۱- اگر عید کے دن لوگوں نے جماعت کے ساتھ عید کی نماز ادا کر لی ہو، صرف چند افراد کی نمازِ عید چھوٹ گئی ہو تو احناف اور مالکیہ کے نزدیک اس کی قضا نہیں ہوگی، شوافع قضا کرنے کی اجازت دیتے ہیں، حنابلہ کہتے ہیں کہ عید کی نماز کی اصلاً قضا نہیں ہے، لیکن اگر کوئی شخص پڑھنا ہی چاہے تو چار رکعتیں ایک سلام سے یا دو سلام سے پڑھ لے۔

۲- اگر کوئی عذر نہ ہو لیکن عید کی نماز عید کے دن نہ پڑھی گئی ہو، تو عید الفطر کی صورت میں اس کی قضا نہیں ہوگی، البتہ عید الاضحیٰ کی صورت میں اگلے دن اس کی قضا کر لی جائے گی۔

۳- اگر کسی عذر کی بنا پر عید کے دن نمازِ عید ادا نہ کی جا سکی ہو، مثلاً چاند ہونے کی خبر کی

تصدیق زوالِ آفتاب کے بعد ہوسکی ہو، یا مسلسل بارش ہوتی رہی ہو تو مالکیہ کہتے ہیں کہ اگلے دن اس کی قضا نہیں کی جائے گی، لیکن احناف، شوافع اور حنابلہ اگلے دن قضا کرنے کی اجازت دیتے ہیں۔ عہد نبوی کے ایک واقعہ سے اس کی تائید ہوتی ہے:

ایک مرتبہ رمضان المبارک کی ۲۹ ؍تاریخ کو چاند نظر نہیں آیا تو صحابۂ کرام نے تیسواں روزہ رکھ لیا، لیکن شام کو ایک قافلہ نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، جس نے گواہی دی کہ وہ گزشتہ روز چاند دیکھ چکا ہے۔ آں حضرت ﷺ نے اس کی بات مان لی، صحابۂ کرام کو حکم دیا کہ روزہ توڑ دیں اور اگلے دن نمازِ عید ادا کرنے کا حکم دیا۔

یہ روایت امام ابوداؤد نے اپنی صحیح (۱۱۵۷) میں بیان کی ہے اور علامہ البانی نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ دار قطنی (۲؍۱۷۰) نے بھی اس کی روایت کی ہے اور اسے حسن کہا ہے۔ ابن حبان نے بھی اپنی صحیح میں اس کی تخریج کی ہے۔ مشہور ناقدینِ حدیث: ابن المنذر، ابن السکن، ابن حزم، خطابی اور ابن حجر وغیرہ نے بھی اس روایت کو صحیح قرار دیا ہے۔

اس تفصیل سے واضح ہوتا ہے کہ اگر کسی عذر کی بنا پر عید کے دن نمازِ عید نہ پڑھی جا سکے تو اگلے دن اس کی ادائیگی کی جاسکتی ہے۔ اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔(۱)

اگر امام دوسرا خطبہ بھول جائے

سوال: عید کی نماز کے وقت گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ نماز کے بعد بوندا باندی شروع ہوگئی۔ امام صاحب نے خطبہ شروع کیا تو نمازیوں میں بارش کی وجہ سے شور وغل ہونے لگا۔ اسی افراتفری میں امام صاحب نے عید کا ایک ہی خطبہ پڑھا، دوسرا خطبہ پڑھنا وہ بھول گئے۔

بہ راہ کرم مطلع فرمائیے، اگر امام عید کا دوسرا خطبہ پڑھنا بھول جائے تو نماز درست ہوگی یا اس میں کچھ کمی رہ جائے گی؟

جواب: جمعہ اور عیدین میں دو خطبے مشروع ہیں۔ متعدد صحابۂ کرام نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کھڑے ہو کر خطبہ دیا کرتے تھے اور درمیان میں ذرا دیر کے لیے بیٹھتے تھے۔ یہاں صرف ایک روایت پیش کی جاتی ہے:

حضرت جابر بن سمرۃؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ دو خطبے دیا کرتے تھے، ان کے

---

(۱) مزید فقہی تفصیلات کے لیے ملاحظہ کیجیے الموسوعۃ الفقہیۃ کویت، ۲۷؍۲۴۳-۲۴۵

درمیان تھوڑی دیر بیٹھتے تھے۔ خطبہ میں آپ قرآن کی تلاوت کرتے تھے اور لوگوں کو وعظ و نصیحت فرمایا کرتے تھے۔(۱)

جمعہ کی طرح عیدین میں بھی دو خطبے مسنون ہیں۔ بس فرق یہ ہے کہ جمعہ میں نماز سے قبل خطبہ دیا جاتا ہے اور عیدین میں نماز کے بعد۔ علامہ ابن قدامہؒ فرماتے ہیں: ''اس پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے، ان کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے۔''(۲)

اس لیے جان بوجھ کر دوسرا خطبہ چھوڑنا خلافِ سنت ہونے کی بنا پر مکروہ تحریمی ہے۔ البتہ دوسرا خطبہ بھول جانے کی صورت میں ایک خطبہ کفایت کرے گا اور نماز درست ہوگی، اس پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

عید کی زائد تکبیرات چھوٹ جائیں تو نماز دہرانا ضروری نہیں

سوال: ہمارے یہاں عید الفطر کی نماز میں امام صاحب دوسری رکعت میں عید کی زائد تکبیرات میں سے ایک تکبیر کہنا بھول گئے اور رکوع میں چلے گئے۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد مقتدیوں میں سے ایک صاحب نے ٹوکا تو انھوں نے دوبارہ عید کی نماز پڑھادی۔

بہ راہ کرم مطلع فرمائیں۔ اگر نمازِ عید میں ایک تکبیر چھوٹ جائے تو کیا نماز صحیح نہیں ہوتی؟ کیا اس کی دوبارہ ادائیگی ضروری ہے؟

جواب: عیدین کی نماز میں جو زائد تکبیرات کہی جاتی ہیں وہ واجب ہیں۔ نماز میں کوئی واجب چھوٹ جائے تو اس کی تلافی سجدۂ سہو سے ہو جاتی ہے، لیکن فقہاء نے لکھا ہے کہ چوں کہ جمعہ اور عیدین کی نماز میں بڑا مجمع ہوتا ہے، اگر امام سجدۂ سہو کرے گا تو دور رہنے والے بہت سے نمازی سمجھ نہیں پائیں گے اور ان کی نماز میں خلل ہوگا، اس لیے ان نمازوں میں سجدۂ سہو نہیں کیا جائے گا:

لاَ يُسْجَدُ لِلسَّهْوِ فِى الْعِيْدَيْنِ وَالْجُمُعَةِ لِئَلَّا يَقَعَ النَّاسُ فِى الْفِتْنَةِ (۳)

---

(۱) مسلم کتاب الجمعۃ، باب ذکر الخطبتین قبل الصلاۃ...:۸۶۲

(۲) المغنی، ۲/ ۳۸۴

(۳) الفتاویٰ الہندیۃ، ۱/ ۲۸

''عیدین اور جمعہ کی نمازوں میں سجدۂ سہو نہیں کیا جائے گا، تاکہ لوگ انتشار میں نہ مبتلا ہوں۔''

اس لیے ایک تکبیر زائد چھوٹ جانے کی صورت میں نماز کے اعادہ کی ضرورت نہ تھی۔

عید کی نماز ایک مسجد میں دو مرتبہ پڑھی جا سکتی ہے

سوال: امسال عید الفطر کے موقع پر بارش ہونے کی وجہ سے نماز عید گاہ میں نہیں پڑھی جاسکی، بلکہ مسجدوں میں ادا کی گئی۔ نمازیوں کی کثرت کی وجہ سے مسجدیں بھی تنگ پڑ گئیں اور بعض مسجدوں میں دو مرتبہ عید کی نماز پڑھی گئی۔ اس موقع پر بعض لوگوں کی جانب سے یہ اعتراض سامنے آیا کہ عید کی نماز ایک مسجد میں دو مرتبہ نہیں پڑھی جاسکتی۔

بہ راہ کرم وضاحت فرمائیں۔ کیا یہ بات صحیح ہے؟

جواب: عام حالات میں کیا کسی مسجد میں نماز باجماعت ہو جانے کے بعد دوسری جماعت کی جاسکتی ہے؟ اس سلسلے میں فقہاء کا اختلاف ہے۔ احناف، شوافع اور مالکیہ اسے مکروہ قرار دیتے ہیں، جب کہ حنابلہ کے نزدیک یہ بلا کراہت جائز ہے۔ تفصیل کتبِ فقہ میں دیکھی جاسکتی ہے۔ لیکن کسی عذر کی بنا پر دوسری جماعت کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ جمعہ کی جماعتِ ثانیہ کے بارے میں مولانا خالد سیف اللہ رحمانی نے لکھا ہے: ''عذر کی وجہ سے دوبارہ جماعت کی گنجائش ہے، کیوں کہ خاص حالات میں فقہاء نے تکرار جماعت کی اجازت دی ہے''[1] یہی بات نماز عید کے سلسلے میں بھی کہی جائے گی۔

اگر عید اور جمعہ ایک ہی دن جمع ہو جائیں

سوال: امسال عید الفطر جمعہ کے دن ہوئی۔ چنانچہ نماز عید کے چند گھنٹوں کے بعد جمعہ کی نماز ادا کی گئی۔ اس موقع پر کچھ لوگوں نے کہا کہ اگر عید اور جمعہ ایک ہی دن جمع ہو جائیں تو جمعہ کی نماز ساقط ہو جاتی ہے۔

بہ راہ کرم اس مسئلے کی وضاحت فرما دیں۔ کیا یہ بات صحیح ہے؟ اگر ہاں تو کیا ظہر کی نماز بھی ساقط ہو جائے گی یا اسے ادا کرنا ہوگا؟

---

(۱) کتاب الفتاویٰ، طبع دیوبند: ۳/ ۸۲

جواب: عید الفطر ہفتہ کے دنوں میں سے کسی بھی دن ہوسکتی ہے، چنانچہ کچھ کچھ عرصہ کے بعد وہ جمعہ کے دن بھی ہوتی رہی ہے۔ ایسا موقع عہدِ نبوی میں بھی پیش آیا ہے اور عہدِ صحابہ میں بھی۔ بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر عید اور جمعہ ایک ہی دن جمع ہو جائیں تو آدمی کو اختیار ہے، چاہے جمعہ پڑھے یا اس کی جگہ ظہر ادا کرلے۔

حضرت معاویہ بن ابی سفیانؓ نے حضرت زید بن ارقمؓ سے دریافت کیا: کیا عہد نبوی میں کوئی ایسا موقع آیا ہے جب عید اور جمعہ ایک ہی دن جمع ہوئے ہوں؟ انھوں نے جواب دیا: ہاں۔ حضرت معاویہؓ نے پھر سوال کیا: تب آپؐ نے کیا کیا تھا؟ انھوں نے فرمایا: آپؐ نے عید کی نماز ادا کی اور جمعہ کے سلسلے میں رخصت دے دی۔ آپؐ نے فرمایا:

مَنْ شَاءَ اَنْ يُّصَلِّيَ فَلْيُصَلِّ.

''جو شخص نماز جمعہ پڑھنا چاہے، پڑھ لے۔'' (۱)

حضرت ابو ہریرہؓ اسی طرح کے ایک موقع کا تذکرہ کرتے ہیں، جب عید اور جمعہ ایک ہی دن جمع ہوگئے تھے، کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

اِجْتَمَعَ فِيْ يَوْمِكُمْ هٰذَا عِيْدَانِ، فَمَنْ شَاءَ اَجْزَاَهُ مِنَ الْجُمُعَةِ وَ اِنَّا مُجَمِّعُوْنَ (۲)

''آج کے دن دو عیدیں (یعنی عید اور جمعہ) جمع ہوگئی ہیں۔ اب تم میں سے جو شخص چاہے جمعہ کی نماز نہ پڑھے، اس کے لیے یہی (عید کی) نماز کافی ہے، لیکن ہم ضرور جمعہ کی نماز ادا کریں گے۔''

فقہاء (احناف، شوافع اور مالکیہ) کا مسلک یہ ہے کہ کوئی نماز کسی دوسری نماز کی جگہ کفایت نہیں کرتی۔ نماز جمعہ فرض ہے اور نماز عید سنت، لہٰذا اگر عید اور جمعہ کی نمازیں ایک دن جمع ہوجائیں تو دونوں ادا کی جائیں گی، جمعہ ترک کرنا جائز نہیں۔ درج بالا احادیث کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ یہ رخصت اہل مدینہ کے لیے نہیں، بلکہ ارد گرد کے دیہاتوں سے آنے والوں

---

(۱) ابو داؤد کتاب الصلاۃ، باب اذا وافق یوم الجمعۃ یوم عید: ۱۰۷۰، نسائی: ۱۵۹۱، ابن ماجہ: ۱۳۱۰، دارمی: ۱۶۲۰، احمد، ۴/ ۳۷۲، بیہقی، ۳/ ۴۱۷، حاکم، ۱/ ۲۸۸

(۲) ابو داؤد، حوالہ سابق: ۱۰۷۳، ابن ماجہ: ۱۳۱۱، بیہقی، ۳/ ۳۱۸

کے لیے تھی، جو نماز جمعہ کے لیے بھی مدینہ آیا کرتے تھے، تا کہ انھیں عید کی نماز پڑھ کر اپنے گھروں کو واپس جانے کے بعد نماز جمعہ کے لیے دوبارہ مدینہ آنے کی زحمت نہ ہو، ان لوگوں پر ظہر کی فرضیت بہ ہر حال باقی رہتی تھی۔ حنابلہ کہتے ہیں کہ امام سے جمعہ کی نماز ساقط نہیں ہوتی، دیگر افراد کے لیے رخصت ہے۔ بہ الفاظ دیگر جمعہ کی نماز باجماعت ادا کی جائے گی۔ انفرادی طور پر کوئی شخص چاہے تو رخصت سے فائدہ اٹھا سکتا ہے، البتہ اسے ظہر کی نماز ادا کرنی ہوگی۔

ایک روایت حضرت عطا بن ابی رباحؒ سے مروی ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے زمانۂ خلافت میں عید اور جمعہ ایک دن جمع ہو گئے۔ حضرت ابن زبیرؓ نے دن کے ابتدائی حصے میں عید کی نماز پڑھا دی۔ جمعہ کے وقت لوگ اکٹھا ہوئے، مگر وہ نماز پڑھانے کے لیے نہیں نکلے، بلکہ انھوں نے شام کے وقت نکل کر عصر کی نماز پڑھائی۔ اس موقع پر حضرت ابن عباسؓ طائف میں تھے۔ وہ واپس آئے تو لوگوں نے تفصیل بتا کر مسئلہ دریافت کیا۔ انھوں نے فرمایا: ابن زبیر نے سنت پر عمل کیا۔(۱)

اس روایت کی بنا پر امام شوکانی فرماتے ہیں کہ اگر عید اور جمعہ ایک دن جمع ہو جائیں تو عید کی نماز پڑھ لینے کے بعد اس روز کسی پر نہ جمعہ فرض رہتا ہے نہ ظہر،(۲) لیکن یہ بات صحیح نہیں معلوم ہوتی، اس لیے کہ مذکورہ بالا روایت کی بعض سندوں میں فَصَلَّيْنَا وُحدَانًا کے الفاظ ہیں، یعنی راوی کہتے ہیں کہ جب ابن زبیرؓ جمعہ کی نماز پڑھانے کے لیے نہیں نکلے تو ہم نے تنہا تنہا ظہر کی نماز ادا کرلی۔

بہتر یہ ہے کہ عید اور جمعہ ایک ہی دن جمع ہو جانے کی صورت میں نماز عید بھی ادا کی جائے اور نماز جمعہ بھی۔ البتہ انفرادی طور پر کوئی شخص چاہے تو رخصت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے نماز جمعہ میں شریک نہ ہو اور نماز ظہر پر اکتفا کرلے۔

یوم عاشورا کا روزہ

سوال: یوم عاشورا کی اہمیت کے بارے میں مشہور ہے کہ اس دن کئی تاریخی واقعات ظہور پذیر ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک تاریخی واقعہ یہود کے بارے میں ہے کہ انھیں اس دن فرعون سے نجات ملی۔ اس لیے یوم عاشورا کو یہود کے ساتھ مخصوص نہیں کیا جا سکتا۔

---

(۱) ابوداؤد، حوالہ سابق: ۱۰۷۱، نسائی: ۱۵۹۲، ابن خزیمہ: ۱۴۶۵

(۲) نیل الاوطار، ۲/ ۵۷۸

احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہود سے امتیاز کرنے کے لیے یوم عاشورا سے قبل یا بعد ایک دن اور ملا کر دو دن روزہ رکھنا چاہیے۔ کیا ایسا کرنا ضروری ہے؟ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں یوم عاشورا اور یہود کا Yom Kippur ایک ہی روز واقع ہوئے ہوں گے، کیا اب بھی ایسا ہوتا ہے؟ کیا یوم عاشورا کا روزہ رکھ لیا جائے اور بہ وجوہ دوسرے دن کے روزے کے بجائے فدیہ ادا کر دیا جائے تو کیا ایسا کرنا درست ہوگا؟

جواب: عاشورا یعنی ۱۰ر محرم الحرام کے روزے کے سلسلے میں کثرت سے احادیث مروی ہیں۔ بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ایام جاہلیت میں قریش بھی اس دن روزہ رکھا کرتے تھے، اس لیے کہ اسی دن خانۂ کعبہ پر غلاف چڑھایا جاتا تھا۔ رسول اللہ ﷺ کا بھی اس دن روزہ رکھنے کا معمول تھا، جو ہجرت مدینہ کے بعد بھی جاری رہا، بلکہ آپؐ نے صحابۂ کرام کو بھی اس دن روزہ رکھنے کا حکم دیا۔ ہجرت کے دوسرے سال جب ماہ رمضان کے روزے فرض ہوئے تو آپؐ نے صحابہ کرامؓ کو اختیار دے دیا کہ چاہیں عاشورا کا روزہ رکھیں، چاہیں نہ رکھیں۔ آپؐ نے فرمایا:

مَنْ شَاءَ اَنْ یَّصُوْمَهٗ فَلْیَصُمْهُ وَ مَنْ شَاءَ اَنْ یَّتْرُکَهٗ فَلْیَتْرُکْهُ (۱)

''جو شخص اس دن روزہ رکھنا چاہے وہ رکھے اور جو نہ رکھنا چاہے وہ نہ رکھے۔''

بعض احادیث میں ہے کہ ''مدینہ میں رسول اللہ ﷺ نے دیکھا کہ یہود بھی ۱۰ر محرم کو روزہ رکھتے ہیں، تو آپؐ نے ان سے اس کی وجہ دریافت فرمائی۔ انھوں نے جواب دیا کہ اس دن اللہ تعالیٰ نے فرعون کو غرقاب کیا تھا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کو اس کے مظالم سے نجات دی تھی، اس کے شکرانے کے طور پر ہم روزہ رکھتے ہیں۔ آپؐ نے جواب دیا: اس پر شکر ادا کرنے کے ہم زیادہ حق دار ہیں۔'' (۲)

ایک حدیث میں ہے کہ آں حضرت ﷺ نے اپنی حیات طیبہ کے آخری دنوں میں ایک موقع پر فرمایا تھا:

لَئِنْ بَقِیْتُ اِلٰی قَابِلٍ لَاَصُوْمَنَّ التَّاسِعَ (۳)

''اگر میں اگلے سال زندہ رہا تو ۹ر محرم کو ضرور روزہ رکھوں گا۔''

---

(۱) بخاری، کتاب الحج، باب قول اللہ تعالی جعل اللہ الکعبۃ... ۱۵۹۲، مسلم: ۱۱۲۵

(۲) بخاری، کتاب الصوم، باب صیام یوم عاشوراء ۲۰۰۴، مسلم: ۱۱۳۰

(۳) مسلم، کتاب الصیام، باب ای یوم یصام فی عاشوراء ۱۱۳۴

لیکن آپؐ کی وفات اس سے قبل ہی ہوگئی، اس لیے آپؐ کا یہ ارادہ شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا۔ اس حدیث کی بنا پر علماء نے محرم کی دسویں تاریخ کے ساتھ نویں تاریخ کو بھی روزہ رکھنا مستحب قرار دیا ہے۔ اس کا کیا مقصد ہے؟ اس سلسلے میں دو اقوال منقول ہیں:

(۱) اس کا مقصد یہود کی مخالفت کرنا اور ان کی مشابہت سے بچنا ہے۔

اس قول کی تائید حضرت ابن عباسؓ سے مروی اس حدیث سے ہوتی ہے جس میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

صُوْمُوْا يَوْمَ عَاشُوْرَاءَ وَ خَالِفُوْا فِيْهِ الْيَهُوْدَ، وَ صُوْمُوْا قَبْلَهٗ يَوْمًا اَوْ بَعْدَهٗ يَوْمًا(۱)

''عاشورا کے دن روزہ رکھو اور یہود کی مخالفت کرو۔ اس کے لیے اس سے قبل یا بعد کے دن بھی روزہ رکھ لو۔''

اس حدیث کو ہیثمیؒ نے مجمع الزوائد (۱۸۸/۳) میں روایت کیا ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہے: ''اس کی روایت احمد اور بزار نے بھی کی ہے، لیکن اس کی سند میں ایک راوی محمد بن ابی لیلیٰ ہے، جس پر محدثین نے کلام کیا ہے۔''

(۲) اس حکم کا مقصد یہ ہے کہ یوم عاشورا کا روزہ تنہا نہ رکھا جائے، جس طرح صرف جمعہ کا روزہ رکھنے سے منع کیا گیا ہے(۲)

علامہ ابن حجر عسقلانیؒ نے بعض اصحاب علم کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ''عاشورا کے روزے کے تین درجے ہیں: یہ کہ کم از کم ۱۰ر محرم کو روزہ رکھا جائے۔ اس سے بہتر ہے کہ اس کے ساتھ ۹ر محرم کو بھی شامل کرلیا جائے۔ اور سب سے اچھا یہ ہے کہ محرم کی ۹، ۱۰، ۱۱ تینوں تاریخوں میں روزہ رکھا جائے۔'' (۳)

احادیث میں عاشورا کے روزے کی فضیلت مذکور ہے۔ حضرت ابوقتادہؓ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

---

(۱) مسند احمد: ۲۴۱/۱

(۲) ترمذی، کتاب الصوم، باب ماجاء فی کراھیة صوم یوم الجمعة وحده ۷۴۳

(۳) فتح الباری بشرح صحیح البخاری، المکتبة السلفیة، ۲۴۶/۴

صِیَامُ یَوْمِ عَاشُوْرَاءَ اِنِّیْ اَحْتَسِبُ عَلَی اللّٰہِ اَنْ یُّکَفِّرَ السَّنَةَ الَّتِیْ قَبْلَهٗ۔(۱)

''میں اللہ تعالیٰ سے امید رکھتا ہوں کہ جو شخص عاشورا کے دن کا روزہ رکھے گا، اللہ اس کے پچھلے ایک سال کے گناہ معاف کردے گا۔''

اس بنا پر فقہا نے عاشوراء کے روزے کو مستحب قرار دیا ہے۔ جو شخص یہ روزہ رکھنا چاہے اسے چاہیے کہ محرم کی نویں تاریخ کو بھی روزہ رکھ لے۔ اگر نہ رکھ سکے تو گیارہویں کو رکھ لے۔ بلکہ امام شافعی نے تینوں دن روزہ رکھنا مستحب قرار دیا ہے۔(۲)

اس تفصیل سے واضح ہوا کہ روزہ صرف عاشورا کے دن بھی رکھا جاسکتا ہے اور اس کے ساتھ اس سے پہلے یا بعد کا دن بھی ملایا جاسکتا ہے۔ صرف عاشورا کا روزہ رکھا جائے، دوسرے دن روزہ نہ رکھا جائے تو بھی فدیہ ادا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

یہ تحقیق نہیں کی جاسکی کہ یہود کے یہاں مہینے کون کون سے ہیں؟ اور ان کا Yom Kippur اور یوم عاشورا عہد نبوی میں اتفاقاً ایک ہی دن واقع ہوگئے تھے یا اب بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔

محرم کے بغیر عورت کا سفرِ حج

سوال: میری سالی (بیوی کی سگی بہن) جو بیوہ ہے، اس کا کوئی لڑکا بھی نہیں ہے، اس کے بھائی کا بھی کافی عرصے پہلے انتقال ہوچکا ہے، اس کی تمنا اور دلی خواہش فریضۂ حج ادا کرنے کی ہے، لیکن کسی محرم کا ساتھ نہ ہونے کی وجہ سے وہ اب تک ادائے حج سے محروم ہے۔ اس سال ہم میاں بیوی کا حج پر جانے کا ارادہ ہے۔ ابھی فارم بھرے جانے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ اپنی سالی کو بھی اپنی بیوی کے ساتھ حج کے لیے لے جاؤں۔ آپ سے استدعا ہے کہ بہ راہ کرم قرآن وحدیث کی روشنی میں یہ بتانے کی مہربانی فرمائیں کہ کیا وہ ہمارے ساتھ حج کے لیے جاسکتی ہے؟

جواب: حج کی فرضیت اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے عائد ہوتی ہے:

---

(۳) ترمذی، کتاب الصوم، باب ماجاء فی الحثّ علی صوم یوم عاشوراء ۷۵۲

(۴) الموسوعة الفقهية، کویت، ۹۰/۲۸

وَ لِلّٰہِ عَلَی النَّاسِ حِجُّ الۡبَیۡتِ مَنِ اسۡتَطَاعَ اِلَیۡہِ سَبِیۡلًا ؕ

(آل عمران:۹۷)

''لوگوں پر اللہ کا یہ حق ہے کہ جو اس کے گھر تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو وہ اس کا حج کرے۔''

'استطاعت' کی تشریح کرتے ہوئے علماء نے کچھ شرائط مقرر کی ہیں۔ ان میں سے کچھ عام ہیں، جن کا اطلاق مردوں اور عورتوں دونوں پر ہوتا ہے اور کچھ عورتوں کے ساتھ مخصوص ہیں۔ عام شرائط یہ ہیں: زادِ راہ اور سواری میسر ہو، جسمانی صحت ہو، راستے پر امن ہوں اور اتنا وقت ہو کہ زمانۂ حج میں مکہ پہنچا جا سکتا ہو۔ عورتوں کے لیے مزید دو شرطیں ہیں۔ ایک یہ کہ عورت عدت نہ گزار رہی ہو اور دوسری یہ کہ وہ اپنے شوہر یا محرم کے ساتھ ہو۔

محرم سے مراد وہ مرد ہے جس سے نسب یا سسرالی رشتہ یا رضاعت کی وجہ سے عورت کا نکاح ہمیشہ کے لیے حرام ہے۔ مثلاً بیٹا، باپ، بھائی، بھتیجا، بھانجا، چچا، ماموں، داماد، خسر وغیرہ۔ بعض رشتے ایسے ہوتے ہیں، جن میں کسی عارضی سبب سے عورت سے نکاح حرام ہوتا ہے۔ وہ سبب دور ہو جائے تو نکاح جائز ہوگا۔ مثلاً بیوی کے زندہ رہتے ہوئے اس کی بہن یعنی سالی سے نکاح نہیں ہو سکتا، لیکن اگر بیوی کا انتقال ہو جائے تو سالی سے نکاح ہو سکتا ہے۔ فقہاء نے عورت کے سفرِ حج کے سلسلے میں ابدی محارم کا اعتبار کیا ہے، عارضی محارم کا نہیں۔

عورتوں کے لیے مخصوص شرائط میں سے پہلی شرط پر تمام علماء کا اتفاق ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لَا تُخۡرِجُوۡهُنَّ مِنۡۢ بُيُوۡتِهِنَّ وَلَا يَخۡرُجۡنَ (الطلاق:۱)

''(زمانۂ عدت میں) نہ تم انھیں ان کے گھروں سے نکالو اور نہ وہ خود نکلیں۔''

اسی طرح دوسری شرط پر بھی تمام علماء کا اتفاق ہے، اگر عورت نفلی حج کا ارادہ رکھتی ہے۔ رہی وہ عورت جس پر حج فرض ہے، کیا اس کے لیے بھی سفرِ حج میں شوہر یا محرم کے ساتھ ہونا ضروری ہے؟ اس میں فقہاء کا اختلاف ہے۔ بعض فقہاء کہتے ہیں کہ عورت پر حج کے وجوب کے لیے شوہر یا محرم کی رفاقت ضروری ہے۔ اس رائے کے حامل حسن بصری، ابراہیم نخعی، سفیان

ثوری، اعمش، اسحٰق، ابوثور کے علاوہ امام ابوحنیفہ اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ ہیں۔ ان کی دلیل یہ حدیث ہے:

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا:

لاَ یَخْلُوَنَّ رَجُلٌ بِامْرَاَۃٍ اِلّاَ وَ مَعَھَا ذُوْ مَحْرَمٍ وَلاَ تُسَافِرُ امْرَاَۃٌ اِلّاَ مَعَ ذِی مَحْرَمٍ۔

''کوئی مرد کسی اجنبی عورت سے تنہائی میں ہرگز نہ ملے، مگر اس وقت جب اس کے ساتھ کوئی محرم ہو، اور کوئی عورت محرم کے بغیر سفر نہ کرے۔''

راوی کہتے ہیں کہ اس موقعے پر ایک آدمی نے سوال کیا: اے اللہ کے رسول! میری بیوی حج کے لیے جانے کا ارادہ رکھتی ہے، جب کہ میں نے فلاں غزوے میں شرکت کے لیے اپنا نام لکھا دیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا:

اِنْطَلِقْ فَحُجَّ مَعَ امْرَاَتِكَ(۱)

''جاؤ، اپنی بیوی کے ساتھ حج کرو۔''

بعض دوسرے فقہاء کہتے ہیں کہ فرض حج کی ادائی کے لیے شوہر یا محرم پر عورت کا انحصار ضروری نہیں ہے۔ اگر کسی وجہ سے شوہر یا کوئی محرم ساتھ نہ جاسکے تو عورت کسی ایسے گروپ میں شامل ہوسکتی ہے، جس میں معتبر مرد اور عورتیں ہوں۔ بلکہ ایسا گروپ بھی حج کے لیے جاسکتا ہے، جس میں صرف عورتیں ہوں۔ اس رائے کے حاملین میں عطا، سعید بن جبیر، ابن سیرین اور اوزاعی کے علاوہ امام مالک اور امام شافعی رحمہم اللہ ہیں۔

امام احمدؒ نے (ایک قول کے مطابق) نوجوان اور بوڑھی عورت میں فرق کیا ہے۔ ان کے نزدیک بوڑھی عورت بغیر محرم کے سفر حج کرسکتی ہے، جواں عورت نہیں۔ بعض شافعی فقہاء مثلاً شیرازیؒ فریضۂ حج کے لیے عورت کو تنہا سفر کرنے کی بھی اجازت دیتے ہیں۔ امام ابن تیمیہؒ کی بھی یہی رائے ہے کہ فرض حج کی ادائی کے لیے عورت محرم کے بغیر بھی سفر کرسکتی ہے۔

---

(۱) بخاری، ۳۰۰۶، مسلم، ۱۳۴۱ کتاب الحج، باب سفر المرأۃ مع محرم الی حج وغیرہ۔

ان حضرات کی دلیل حضرت عدی بن حاتمؓ سے مروی حدیث ہے، جس میں اللہ کے رسول ﷺ نے حضرت عدی کو مخاطب کر کے فرمایا تھا:

اِنْ طَالَتْ بِكَ حَيَاةٌ لَتَرَيَنَّ الظَّعِينَةَ تَرْتَحِلُ مِنَ الْحِيرَةِ حَتّٰى تَطُوفَ بِالْكَعْبَةِ لَا تَخَافُ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ (۱)

''اگر تمھاری زندگی رہی تو تم ضرور دیکھو گے کہ ایک عورت تنہا حیرہ (عراق کا ایک مقام) سے سفر کر کے آئے گی اور خانۂ کعبہ کا طواف کرے گی۔ اسے پورے سفر میں اللہ کے سوا اور کسی کا خوف نہ ہوگا۔''

یہ حضرات اس سے بھی استدلال کرتے ہیں کہ خلیفۂ دوم حضرت عمر بن الخطابؓ نے اپنی زندگی کے آخری سال ازواج مطہرات کو حج کے لیے روانہ فرمایا تھا تو ان کے ساتھ حضرت عثمان بن عفانؓ اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کو بھیجا تھا۔(۲)

حافظ ابن حجرؒ نے لکھا ہے: ''اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ اور ازواج مطہرات بغیر محرم کے عورت کے سفر کو جائز سمجھتے تھے اور دوسرے صحابہ کرامؓ نے بھی ان کے اس عمل پر ان کی نکیر نہیں کی تھی۔'' (۳) یہ بھی مذکور ہے کہ پہلے حضرت عمرؓ نے ازواج مطہرات کو سفر حج سے منع کر دیا تھا، لیکن بعد میں انھوں نے اس کی نہ صرف اجازت دے دی تھی، بلکہ اس کا انتظام بھی کیا تھا۔(۴)

یہ حضرات عورت کے سفر حج کے لیے محرم کے بجائے امن و امان کی شرط لگاتے ہیں۔ یعنی عورت بغیر محرم کے اس صورت میں حج کے لیے سفر کر سکتی ہے، جب راستہ پر امن ہو اور اس کی جان اور عزت و آبرو کو کوئی خطرہ نہ ہو۔

دیکھا جائے تو امام ابو حنیفہؒ اور ان کے ہم نوا فقہاء کی رائے میں احتیاط کا پہلو ملحوظ ہے اور دوسرے فقہاء کی رائے میں جواز کا۔ اسی وجہ سے موجودہ دور کے علماء کی رایوں میں بھی

---

(۱) بخاری، کتاب المناقب، باب علامات النبوة فی الاسلام، ۳۵۹۵
(۲) بخاری، کتاب جزاء الصید، باب حج النساء ۱۸۶۰
(۳) فتح الباری بشرح صحیح البخاری، المکتبۃ السلفیۃ، ۷۶/۴
(۴) فتح الباری، ۷۴/۴

اختلاف پایا جاتا ہے۔ چنانچہ سعودی عرب کے علماء شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن بازؒ، شیخ محمد بن عثیمینؒ اور شیخ محمد صالح المنجد نے عدم جواز کا فتویٰ دیا ہے اور شیخ یوسف القرضاوی نے جواز کا(۱)

کیا عورت دورانِ عدّت حج کے لیے جاسکتی ہے؟

سوال: میاں بیوی نے حج کے لیے فارم بھرا تھا اور اس کی منظوری بھی آگئی تھی، لیکن اچانک شوہر کا انتقال ہوگیا۔ اب بیوی عدت میں ہے۔ کیا وہ اس حالت میں کسی محرم کے ساتھ حج کے لیے جاسکتی ہے؟

جواب: شوہر کی وفات کے بعد عورت کے لیے عدت کا حکم قرآن کریم میں صراحت سے مذکور ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَ يَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّ عَشْرًا ج (البقرۃ:۲۳۴)

''تم میں سے جو لوگ مرجائیں، ان کے پیچھے اگر ان کی بیویاں زندہ ہوں تو وہ اپنے آپ کو چار مہینے دس دن روکے رکھیں۔''

اسی طرح صاحبِ استطاعت کے لیے حج کا حکم ہے:

وَ لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلاً ط

(آل عمران:۹۷)

''لوگوں پر اللہ کا یہ حق ہے کہ جو اس گھر تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو وہ اس کا حج کرے۔''

جس عورت کے شوہر کا انتقال ہوگیا ہو وہ اگر دورانِ عدت حج کا سفر کرے گی تو عدت کے حکم الٰہی کی پامالی ہوگی۔ حج کا عمل ایسا نہیں ہے کہ واجب ہوتے ہی فوراً اس کی ادائی ضروری ہو۔ اس لیے اسے آیندہ کے لیے ٹالا جاسکتا ہے۔ محترمہ کو چاہیے کہ اس سال حج کا ارادہ ملتوی کردیں، اپنی عدّت پوری کریں اور آیندہ اپنے کسی محرم کے ساتھ حج کا ارادہ کرلیں۔

---

(۱) شیخ یوسف القرضاوی کے فتویٰ کے لیے ملاحظہ کیجیے فتاویٰ یوسف القرضاوی، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی، جلد اول، ص:۱۷۹-۱۸۲

مسجد نبویؐ میں چالیس نمازیں ادا کرنے کی فضیلت؟

سوال: برصغیر سے حج کے لیے سفر کرنے والوں میں اکثر عازمین پہلی مرتبہ سعودی عرب پہنچتے ہیں۔ اتنے لمبے سفر کے بعد سب کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ مکہ مکرمہ کے ساتھ مدینہ منورہ کی زیارت اور مسجد نبویؐ میں نماز پڑھنے کا شرف بھی حاصل کرلیں۔ اس لیے حج کمیٹی آف انڈیا کی جانب سے چالیس روزہ سفر کے دوران مدینے میں بھی آٹھ، دس دن قیام کی سہولت فراہم کی جاتی ہے۔ اس ضمن میں مسجد نبویؐ میں چالیس نمازیں پڑھنے کی فضیلت پر مشتمل ایک حدیث بیان کی جاتی ہے۔ اس حدیث کے پیش نظر ہر شخص مسجد نبویؐ میں تکبیر تحریمہ کے ساتھ چالیس نمازیں پڑھنے کی کوشش کرتا ہے۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ مذکورہ حدیث کی اصل کیا ہے؟ اگر یہ حدیث مستند اور صحیح ہے تو کیا ایسے موقعے پر اگر کسی شرعی عذر کی بنا پر کسی خاتون کی کوئی نماز رہ گئی تو وہ اس فضیلت کو کیسے حاصل کرے گی؟ چالیس نمازوں کی تکمیل کے لیے مدینے میں رکنے سے قیام اور دوسرے انتظامی مسائل پیدا ہوں گے۔

جواب: مسجد نبویؐ میں چالیس نمازیں ادا کرنے کی فضیلت کے بارے میں جو حدیث بیان کی جاتی ہے وہ حضرت انس بن مالکؓ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا:

مَنْ صَلَّى فِيْ مَسْجِدِيْ اَرْبَعِيْنَ صَلاَةً لاَ يَفُوْتُهُ صَلاَةٌ كُتِبَتْ لَهُ بَرَاءَةٌ مِّنَ النَّارِ وَ نَجَاةٌ مِنَ الْعَذَابِ وَ بَرِئٌ مِنَ النِّفَاقِ.

”جس شخص نے میری مسجد میں چالیس نمازیں اس طرح پڑھیں کہ اس کی ایک نماز بھی نہیں چھوٹی اس کے لیے جہنم سے براءت اور عذاب سے نجات لکھ دی گئی اور وہ نفاق سے بھی پاک ہوگیا۔“

اس حدیث کو امام احمد نے اپنی مسند[1] اور طبرانی نے اپنی کتاب المعجم الاوسط[2] میں روایت کیا ہے۔ لیکن اس کی سند ضعیف ہے۔ اس لیے کہ اس میں مذکور ایک راوی 'نبیط' مجہول ہے اور اس سے روایت کرنے میں دوسرا راوی ابن ابی الرجال منفرد ہے۔ مشہور محدث علامہ محمد ناصر الدین الالبانی نے اپنی تصنیف سلسلة الاحادیث الضعیفة والموضوعة میں اس حدیث کو نقل

(۱) مسند احمد: ۳/ ۱۵۵، حدیث نمبر ۱۲۵۸۳

(۲) المعجم الاوسط للطبرانی، ۲/ ۳۲/ ۲/ ۵۵۷۶

کر کے اِس پر تفصیل سے بحث کی ہے اور اسے 'منکر' قرار دیا ہے۔ ان کی بحث کا خلاصہ درج ذیل ہے:

''اس حدیث کی سند ضعیف ہے۔ نبیط غیر معروف ہے۔ ابن حبان نے اس کا تذکرہ اپنی کتاب الثقات میں کیا ہے، لیکن ان کی عادت ہے کہ وہ مجہول افراد کو بھی ثقہ قرار دے دیتے ہیں۔ انہی پر اعتماد کرتے ہوئے ہیثمی نے اپنی کتاب مجمع الفوائد میں اس حدیث کی روایت کی ہے اور اس کے راویوں کو ثقہ کہا ہے۔ اس حدیث کی روایت منذری نے بھی اپنی کتاب الترغیب والترہیب میں کی ہے اور اس کے راویوں کو حدیث صحیح کے راوی قرار دیا ہے، لیکن یہ ان کا کھلا ہوا وہم ہے۔ اس لیے کہ نبیط حدیث صحیح کے راویوں میں سے نہیں ہیں۔ یہ حدیث ایک دوسری سند سے بھی مروی ہے، لیکن اس میں بھی اسی طرح کا ضعف پایا جاتا ہے۔''(۱)

مسجد نبویؐ میں نماز کی فضیلت پر ایک صحیح حدیث بخاری و مسلم میں مروی ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

صَلاَةٌ فِیْ مَسْجِدِیْ هٰذَا خَیْرٌ مِنْ اَلْفِ صَلاَةٍ فِیْمَا سِوَاهُ اِلَّا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ(۲)

''میری اس مسجد میں نماز کا ثواب دوسری کسی مسجد (سوائے مسجد حرام کے) میں نماز کے ثواب سے ایک ہزار گنا زیادہ ہے۔''

اس لیے حاجی کو مسجد نبویؐ میں جتنی زیادہ سے زیادہ نمازیں پڑھنے کی توفیق ملے اس کا اہتمام کرنا چاہیے۔ چالیس کی گنتی پوری کرنے کے چکر میں نہیں پڑنا چاہیے۔

کیا ایک قربانی گھر کے تمام افراد کے لیے کافی ہے؟

سوال: اگر ایک گھر میں کئی صاحبِ نصاب افراد ہوں، مثلاً شوہر بھی صاحب نصاب ہو، بیوی کے پاس اتنے زیورات ہوں جو نصاب تک پہنچتے ہیں، ان کے بیٹے بھی ملازمت یا تجارت کی

(۱) سلسلۃ الاحادیث الضعیفۃ والموضوعۃ، دار المعارف الریاض، ۱۹۹۲ء، ۱/ ۵۴۰، حدیث نمبر ۳۶۴

(۲) بخاری، کتاب فضل الصلاۃ، باب فضل الصلاۃ فی مسجد مکۃ والمدینۃ، ۱۹۹۰، مسلم: ۱۳۹۴

وجہ سے اتنا کما رہے ہوں کہ وہ صاحب نصاب ہوں، اگرچہ ان کی ابھی شادی نہ ہوئی ہو اور وہ والدین کے ساتھ رہتے ہوں۔ تو کیا ان میں سے ہر ایک پر قربانی واجب ہے یا گھر میں صرف ایک قربانی کافی ہے؟

جواب: قربانی کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ اس سلسلے میں فقہاء کا اختلاف ہے۔ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک یہ واجب ہے۔ دیگر فقہاء میں ربیعہؒ، لیثؒ، اوزاعیؒ، ثوریؒ اور ایک قول کے مطابق امام مالکؒ کی بھی یہی رائے ہے۔

ان کا استدلال قرآن کریم کی اس آیت سے ہے:

فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ۝ط (الکوثر:۲)

''پس اپنے رب ہی کے لیے نماز پڑھو اور قربانی کرو۔''

وہ کہتے ہیں کہ اس آیت میں قربانی کا حکم مطلق ہے اور مطلق حکم وجوب پر دلالت کرتا ہے۔ آیت میں خطاب نبی کریم ﷺ سے ہے اور آپؐ کی تبعیت میں امت بھی اس کی مخاطب ہے۔ اس کے علاوہ یہ حضرات کچھ احادیث سے بھی استدلال کرتے ہیں۔ امام ابو حنیفہؒ یہ بھی فرماتے ہیں کہ یہ وجوب ہر اس شخص پر ہے جس میں وجوب کی شرائط پائی جائیں۔ بہ الفاظ دیگر ایک قربانی ایک ہی شخص کے لیے کفایت کرے گی۔

امام شافعیؒ اور امام احمدؒ (اور ایک قول کے مطابق امام مالکؒ اور حنفی فقیہ قاضی ابو یوسفؒ) اسے سنت موکدہ قرار دیتے ہیں۔ صحابہ اور تابعین میں سے ابوبکر، عمر، بلال، ابو مسعود البدری، سوید بن غفلہ، سعید بن المسیب، عطا، علقمہ، اسود، اسحاق، ابوثور اور ابن المنذر رضی اللہ عنہم کی بھی یہی رائے ہے۔

یہ حضرات دلیل میں اس حدیث کو پیش کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

اِذَا دَخَلَتِ الْعَشْرُ وَ اَرَادَ اَحَدُكُمْ اَنْ يُّضَحِّيَ فَلَا يَمَسَّ مِنْ شَعَرِهٖ وَ بَشَرِهٖ شَيْئًا (۱)

''جب ذی الحجہ کے مہینے کا آغاز ہو جائے اور تم میں سے کسی شخص کا قربانی کرنے کا ارادہ ہو تو وہ اپنے بال نہ بنوائے اور ناخن نہ تراشے۔''

---

(۱) صحيح مسلم، كتاب الاضاحي، باب نهي من دخل عليه عشر ذي الحجة... ۱۹۷۷

اس حدیث کا انداز بتاتا ہے کہ قربانی واجب نہیں ہے۔ اگر یہ واجب ہوتی تو رسول اللہ ﷺ اس طرح نہ فرماتے ''اور تم میں سے کسی شخص کا قربانی کا ارادہ ہو...''

بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ سال، دو سال قربانی نہیں کرتے تھے(۱) اگر قربانی واجب ہوتی تو یہ حضرات کسی سال ناغہ نہ کرتے۔

جو فقہا قربانی کو سنت قرار دیتے ہیں، ان کے درمیان اس معاملے میں اختلاف ہے کہ کیا قربانی ہر شخص کے لیے سنت ہے یا ایک گھر کے لوگوں کے لیے ایک ہی قربانی کفایت کرتی ہے؟

قاضی ابو یوسفؒ کے نزدیک قربانی 'سنت عین' ہے، یعنی یہ ہر شخص کے لیے سنت ہے۔

امام مالکؒ کے نزدیک یہ حکماً سنت عین ہے، یعنی اس کا مطالبہ تو ہر شخص سے ہے، لیکن اگر کوئی شخص اپنی قربانی میں اپنے والدین اور بچوں کی طرف سے بھی نیت کرلے تو ان کی طرف سے بھی قربانی ادا ہو جائے گی اور وہ ثواب میں شریک ہو جائیں گے۔

امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک قربانی سنتِ کفایہ ہے۔ یعنی اگر ایک گھر کا ذمے دار قربانی کرے تو گھر کے تمام افراد کی طرف سے قربانی ادا ہو جائے گی۔ ایک گھر میں وہ تمام افراد شامل ہیں جن کا نفقہ کسی ایک شخص کے ذمّے ہو۔

یہ حضرات دلیل میں حضرت ابو ایوب انصاریؓ کا قول پیش کرتے ہیں۔ انھوں نے ایک موقعے پر فرمایا:

كُنَّا نُضَحِّي بِالشَّاةِ الْوَاحِدَةِ يَذْبَحُهَا الرَّجُلُ عَنْهُ وَ عَنْ اَهْلِ بَيْتِهٖ، ثُمَّ تَبَاهَى النَّاسُ بَعْدُ، فَصَارَتْ مُبَاهَاةً (۲)

''ہم ایک بکری ذبح کرتے تھے۔ یہ قربانی آدمی اور اس کے گھر والوں، سب کی طرف سے کفایت کرتی تھی۔ بعد میں لوگ ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کے لیے زیادہ قربانی کرنے لگے اور یہ چیز فخر و مباہات کا ذریعہ بن گئی۔''

---

(۱) السنن الکبریٰ للبیہقی، دائرۃ المعارف العثمانیۃ حیدرآباد، ۹/ ۲۶۵

(۲) ترمذی، کتاب الاضاحی، باب ماجاء ان الشاۃ الواحدۃ تجزی عن اهل البیت ۱۵۰۵، موطا مالک: ۲۰۳۱

حضرت ابوایوبؓ کا یہ اندازِ بیان اسے حدیثِ مرفوع کا درجہ دے دیتا ہے۔ یعنی اس عمل کو رسول اللہ ﷺ کی تائید حاصل تھی۔(۱)

حاملہ جانور کی قربانی

سوال: کیا حاملہ جانور کی قربانی جائز ہے؟

جواب: جس جانور کے پیٹ میں بچہ ہو اس کی قربانی جائز ہے، البتہ جان بوجھ کر ولادت کے قریب والے جانور کو ذبح کرنا مکروہ ہے۔

اگر جانور کو ذبح کرنے کے بعد اس کے پیٹ سے بچہ مردہ حالت میں نکلے تو اس بچے کا گوشت کھانا جائز نہیں، وہ مردار کے حکم میں ہے۔ اسی طرح اگر وہ پیٹ سے نکلتے وقت تو زندہ ہو، لیکن ذبح کرنے سے پہلے مر جائے تو بھی وہ حرام ہے، البتہ اگر اسے زندہ حالت میں ذبح کرلیا جائے تو حلال ہے۔

غیر مسلم کو آب زمزم اور کھجور دینا

سوال: میرے ملاقاتیوں میں بہت سے غیر مسلم بھی ہیں۔ وہ عید، بقرعید اور دوسرے مواقع پر آتے رہتے ہیں۔ امسال میں الحمدللہ حج پر جا رہا ہوں۔ واپسی پر وہ ملاقات کرنے اور مبارک باد دینے ضرور آئیں گے۔ بہ راہ کرم یہ بتائیں کہ کیا انھیں آب زمزم اور کھجور بہ طور تحفہ دیا جا سکتا ہے؟

جواب: جہاں تک مال زکوٰۃ کا معاملہ ہے اسے غیر مسلموں کو دینا جائز نہیں۔ اس لیے کہ حدیث میں اس کی صراحت آئی ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے حضرت معاذ بن جبلؓ کو یمن بھیجتے وقت انھیں ہدایت فرمائی تھی:

فَاعۡلِمۡهُمۡ اَنَّ اللّٰهَ افۡتَرَضَ عَلَيۡهِمۡ صَدَقَةً فِىۡ اَمۡوَالِهِمۡ تُؤۡخَذُ مِنۡ اَغۡنِيَائِهِمۡ وَ تُرَدُّ عَلٰى فُقَرَائِهِمۡ(۲)

’’(اگر وہاں کے لوگ کلمۂ شہادت اور پنج وقتہ نمازوں کا اقرار کرلیں) تو انھیں بتاؤ کہ اللہ نے ان کے اموال میں صدقہ (یعنی زکوٰۃ) فرض کیا ہے، جو ان کے مال داروں سے لیا جاتا ہے اور ان کے غریبوں کی طرف لوٹا دیا جاتا ہے۔‘‘

---

(۱) تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجیے الموسوعۃ الفقہیۃ، کویت ۵/۷۶-۷۸

(۲) بخاری کتاب الزکاۃ، باب وجوب الزکاۃ: ۱۳۹۵، مسلم: ۱۹

زکوٰۃ کے علاوہ عام صدقات، نذر و کفارات کی رقوم وغیرہ غیر مسلموں کو دی جا سکتی ہیں۔ فتحِ مکہ کے بعد ایک سال تک غیر مسلموں کو حج و عمرہ کرنے کی اجازت تھی، اس عرصہ میں وہ مسجد حرام میں آتے تو زمزم کے پانی سے بھی استفادہ کرتے تھے۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں غیر مسلم مہمان آیا کرتے تھے تو آپؐ کھجوروں سے ان کی تواضع فرماتے تھے۔

کیا قربانی کا گوشت غیر مسلم کو دیا جاسکتا ہے؟

سوال: کیا قربانی کا گوشت کسی غیر مسلم کو دیا جا سکتا ہے؟ براہِ کرم وضاحت فرمائیں؟

جواب: قربانی کے گوشت کے سلسلے میں حکم یہ ہے کہ اسے آدمی خود بھی کھا سکتا ہے اور دوسروں کو بھی دے سکتا ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا ہے:

كُلُوْا وَادَّخِرُوْا وَ تَصَدَّقُوْا (۱)

"(قربانی کا گوشت) کھاؤ، ذخیرہ کرو اور صدقہ کرو۔"

دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں:

كُلُوْا وَ اَطْعِمُوْا وَاحْبِسُوْا (۲)

"(قربانی کا گوشت) کھاؤ، دوسروں کو کھلاؤ اور (آیندہ کے لیے) روک لو۔"

قربانی کا گوشت ذخیرہ کرنے یا آئندہ کے لیے روک کر رکھنے کا پس منظر یہ ہے کہ ابتدا میں آں حضرت ﷺ نے حکم دیا تھا کہ قربانی کا گوشت تین دن سے زیادہ نہ کھایا جائے، یعنی استعمال کے لیے صرف اتنا گوشت روکا جائے جو تین دنوں کے لیے کفایت کرے، بقیہ صدقہ کر دیا جائے۔ لیکن بعد میں آپؐ نے یہ ممانعت اٹھالی اور تین دن سے زیادہ استعمال کرنے کی اجازت دے دی۔

کسی حدیث میں قربانی کا گوشت غیر مسلم کو دینے کی ممانعت مذکور نہیں ہے۔ اس کا حکم عام صدقات کا ہے۔ جس طرح زکوٰۃ کے علاوہ دیگر صدقات غیر مسلم کو دیے جا سکتے ہیں، اسی طرح قربانی کا گوشت بھی اسے دیا جا سکتا ہے۔

---

(۱) مسلم، کتاب الاضاحی، باب بیان ما کان من النهی عن اکل لحوم الاضاحی... ۱۹۷۱

(۲) مسلم، حوالہ سابق ۱۹۷۳

خطبۂ نکاح میں پڑھی جانے والی آیتیں

سوال: خطبۂ نکاح میں جو تین آیتیں (سورہ النساء: کی پہلی آیت، سورۂ آل عمران کی آیت نمبر ۱۰۲ اور سورۂ الاحزاب کی سترویں اور اکہترویں آیتیں) پڑھی جاتی ہیں، کیا ان کا تعلق نکاح سے نہیں ہے؟ یہاں ایک امام صاحب نے جمعے کے خطاب میں یہ بات کہی تو عجیب سی لگی۔ بہ راہِ کرم وضاحت فرمادیں۔

جواب: نکاح کے موقعے پر جو خطبہ پڑھا جاتا ہے، وہ حمد وثنا اور دعا کے ابتدائی کلمات کے بعد قرآن کریم کی چار آیتوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ اسے خطبۂ مسنونہ کہا جاتا ہے۔ اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ نکاح کے موقعے پر یہی خطبہ پڑھا کرتے تھے۔ یہ صراحت حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی زبانی سنن اربعہ میں موجود ہے۔(۱)

ان آیتوں کا تعلق نکاح سے اس معنی میں تو نہیں ہے کہ ان میں نکاح سے متعلق کوئی بات بتائی گئی ہو، لیکن ان میں جو باتیں کہی گئی ہیں، وہ انسانی زندگی میں ہر موقعے پر ملحوظ رکھنے کی ہیں اور زندگی کا ایک اہم موقع نکاح ہے۔ اس موقعے پر ان باتوں کی یاد دہانی بڑی معنیٰ خیز ہے۔ حضرت ابن مسعودؓ کی روایت میں اسے 'خطبۃ الحاجۃ' کا نام دیا گیا ہے، جسے آں حضرت ﷺ مختلف مواقع پر، خاص طور سے نکاح کے موقعے پر، پڑھا کرتے تھے۔(۲)

ان آیتوں میں بار بار اللہ سے ڈرنے اور تقویٰ کی زندگی اختیار کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔ زندگی کے آخری سانس تک راہِ اسلام پر قائم رہنے پر زور دیا گیا ہے اور ہمیشہ درست بات کہنے اور ہر معاملے میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ سورۂ نساء کی آیت میں نسل انسانی کی ابتدائی تاریخ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رشتوں کے پاس ولحاظ کی تاکید کی گئی ہے۔ ان باتوں کی یاد دہانی یوں تو ہر اہم موقعے پر ہونی چاہیے اور ہوتی بھی ہے، لیکن نکاح کے ذریعے جب ایک نیا خاندان تشکیل پا رہا ہو تو اس موقعے پر ان کی یاد دہانی کی اہمیت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

---

(۱) ابو داؤد، کتاب النکاح، باب فی خطبة النکاح، ۲۱۱۸، ترمذی: ۱۱۰۵، نسائی: ۳۲۷۹، ابن ماجہ: ۱۸۹۲

(۲) حوالہ سابق

محترم مولانا سید جلال الدین عمری کی کتاب 'اسلام کا عائلی نظام' میں ان آیات کی بڑی مؤثر تشریح کی گئی ہے۔آپ اسے ملاحظہ فرمالیں تو بات کی مزید وضاحت ہوجائے گی۔

ولیمہ کیسا ہو؟

سوال: شریعت میں نکاح کے موقع پر ولیمہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ حدیث میں ہے کہ اس موقع پر آدمی بکرا ذبح کرے اور گوشت کھلائے۔ اگر کسی شخص کا حلقۂ احباب بہت وسیع ہو اور وہ اتنی وسعت نہ رکھتا ہو کہ بڑے پیمانے پر دعوت کا اہتمام کرسکے تو کیا محض ٹی پارٹی کردینے سے اللہ کے رسول ﷺ کے حکمِ ولیمہ کا منشا پورا ہوجائے گا؟

جواب: حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کا نکاح ہوا۔ اس کا علم رسول اللہ ﷺ کو ہوا تو آپؐ نے انھیں مبارکباد دی اور فرمایا:

اَوَلِمْ وَلَوْ بِشَاةٍ[۱]

"ولیمہ کرو، خواہ ایک بکری کے ذریعے۔"

آپؐ نے خود بھی اس پر عمل کرکے دکھایا۔ چنانچہ روایات میں ہے کہ حضرت زینب بنت جحشؓ سے نکاح کے موقع پر آپؐ نے بکری ذبح کروائی تھی اور لوگوں نے شکم سیر ہوکر گوشت روٹی کھائی تھی[۲]

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ولیمہ میں گوشت کھلانا ضروری ہے۔ دعوت میں کچھ بھی کھلایا جاسکتا ہے۔ غزوۂ خیبر کے بعد آں حضرت ﷺ نے حضرت صفیہؓ سے نکاح کیا تو ولیمہ میں صحابہ کو 'حیس' کھلایا تھا[۳] 'حیس' اس کھانے کو کہتے تھے جسے کھجور، پنیر اور گھی ملاکر تیار کیا جاتا تھا۔ حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں کہ حضرت صفیہؓ سے نکاح کے موقع پر آں حضرت ﷺ نے مجھے حکم دیا کہ صحابہ کرامؓ کو ولیمہ کے لیے بلاکر لاؤ۔ اس موقع پر گوشت روٹی کا اہتمام نہیں کیا گیا تھا۔ صحابہ آئے تو دسترخوان بچھادیا گیا اور اس پر کھجور، پنیر اور گھی رکھ دیا گیا۔"[۴] حضرت صفیہ بنت شیبہؓ

---

(۱) بخاری، کتاب البیوع، باب ماجاء فی قول اللّٰہ فاذا قضیت الصلاۃ ...۲۰۴۸، مسلم:۱۴۲۷

(۲) بخاری، کتاب النکاح، باب من اولم علی بعض نسائه اکثر من بعض ۵۱۷۱، مسلم:۱۴۲۸

(۱) بخاری، کتاب النکاح، باب الولیمة ولو بشاة، ۵۱۶۹، مسلم:۱۳۶۵

(۲) بخاری، کتاب النکاح، باب اتخاذ السراری و من اعتق جاریته ثم تزوّجها ۵۰۸۵

بیان کرتی ہیں کہ بعض ازواج مطہرات سے آں حضرتؐ کے نکاح کے موقع پر ولیمہ میں صرف دو مد (ایک پیمانہ) جو کا استعمال کیا گیا تھا۔[۱]

نکاح ایک خوشی کا موقع ہوتا ہے۔ شریعت کی تعلیم یہ ہے کہ آدمی اس موقع پر اپنی خوشی میں اپنے اعزہ اور احباب کو شریک کرے۔ اب یہ اس کے اوپر ہے کہ وہ ان کی ضیافت اور لذتِ کام ودہن کے لیے اپنی حیثیت کے مطابق جو چاہے انتظام کرے۔

عورت کا حق مہر

سوال: ایک شخص اپنے اکاؤنٹ میں سے کچھ روپے نکالتا ہے اور اپنی بیوی سے یہ کہہ کر کہ اس میں سے کچھ روپے تمھارے مہر کے ہیں، وہ سارے روپے اپنے بڑے بھائی کو تجارت کے لیے دے دیتا ہے۔ بھائی نے وہ روپے کبھی واپس نہیں کیے اور بیوی کو وہ روپے کبھی واپس نہیں ملے۔ کیا یہ کہہ دینے سے کہ اس میں تمھارے مہر کے روپے بھی تھے، مہر کی ادائیگی ہوگئی، جب کہ اس بات کو، ۱۷، ۱۸ سال ہوگئے ہیں۔ یہ بھی بتائیں کہ اگر اب شوہر وہ روپے واپس کرتا ہے تو کیا وہ اسی وقت کے حساب سے واپس کرے گا جس وقت مہر طے کیا گیا تھا یا موجودہ زمانے کے حساب سے؟

جواب: مہر عورت کا قانونی اور شرعی حق ہے، جو اسے ہر حال میں ملنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَ اٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحۡلَةً ؕ (النساء: ۴)

''اور عورتوں کے مہر خوش دلی کے ساتھ (فرض جانتے ہوئے) ادا کرو۔''

شوہر کو حق نہیں کہ بیوی کو مہر ادا کرنے میں ٹال مٹول سے کام لے، یا رقم ہونے کے باوجود اسے بیوی کی ملکیت میں نہ دے اور اس پر خود قبضہ جمائے رہے، یا اسے محض خبر دے کر، اس کی مرضی معلوم کیے بغیر، اس رقم کو اپنے استعمال میں لے آئے یا کسی کو قرض دے دے۔ ہاں! اگر بیوی اپنی مرضی سے اپنی رقم مہر شوہر کو ہبہ کر دے، یا اسے عاریتاً دے دے کہ اپنے استعمال میں لائے یا اس سے تجارت کرے یا کسی کو قرض دے دے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ سورۂ نساء کی مذکورہ بالا آیت کے آگے ہی اس کی بھی صراحت موجود ہے:

فَاِنۡ طِبۡنَ لَكُمۡ عَنۡ شَىۡءٍ مِّنۡهُ نَفۡسًا فَكُلُوۡهُ هَنِيۡٓــًٔا مَّرِیۡٓـــًٔا۝

(النساء: ۴)

---

(۱) بخاری، کتاب النکاح، باب من اولم باقلّ من شاة ۵۱۷۲

’’البتہ اگر وہ خود اپنی خوشی سے مہر کا کوئی حصہ تمھیں معاف کردیں تو اسے تم مزے سے کھا سکتے ہو۔‘‘

اسلامی شریعت کا مزاج یہ ہے کہ عورت کا مہر نکاح کے وقت ہی ادا کردیا جائے، یا اگر اس وقت ممکن نہ ہو تو بعد میں جلد از جلد ادا کرنے کی کوشش کی جائے۔ احادیث میں صراحت ہے کہ جب کوئی شخص اللہ کے رسول ﷺ کے سامنے نکاح کی خواہش کا اظہار کرتا تو آپؐ اس سے دریافت کرتے کہ تمھارے پاس مہر میں دینے کے لیے کچھ ہے؟ ہندوستانی مسلمانوں میں جو یہ چیز رواج پاگئی ہے کہ نکاح کے وقت مہر ادا نہیں کیا جاتا، یا علامتی طور پر اس کا تھوڑا سا حصہ ادا کرکے بقیہ کو مؤجل (تاخیر سے ادا کیا جانے والا) کرالیا جاتا ہے، پھر بعد میں اسے ادا کرنے کے معاملے میں کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی جاتی، یہ طریقہ صحیح نہیں ہے۔ بہ طور مہر طے کی گئی رقم لازماً عورت کے حوالے کی جانی چاہیے یا اس کی مرضی کے مطابق اسے خرچ کیا جانا چاہیے۔

جہاں تک یہ سوال ہے کہ سترہ اٹھارہ سال قبل طے کی گئی رقم مہر اگر عورت کو اب مل رہی ہے تو کیا اتنی ہی ملے گی جتنی اس وقت طے ہوئی تھی، یا موجودہ مالیت کے حساب سے اس میں اضافہ کرکے ادا کیا جائے گا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جب تک شوہر رقم مہر اپنی بیوی کو ادا نہ کرے اس وقت تک وہ اس کے ذمے قرض ہے اور قرض کے بارے میں اصول یہ ہے کہ اتنی ہی رقم واپس کی جائے گی جتنی لی گئی تھی۔ اس لیے اٹھارہ سال قبل طے کردہ مہر میں موجودہ مالیت کے حساب سے اضافہ کرکے اس کی ادائی کا مطالبہ کرنا صحیح نہیں ہے۔

ام المؤمنین حضرت خدیجہؓ کا مہر

سوال: مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نئی دہلی سے شائع ہونے والی کتاب ’تذکار صحابیات‘ (طالب ہاشمی) میں حضرت خدیجہؓ کا مہر پانچ سو درہم درج ہے، جب کہ اسی ادارہ سے شائع شدہ کتاب ’محمد عربی ﷺ‘ میں ان کا مہر بیس اونٹ لکھا گیا ہے۔ بہ راہ کرم مطلع فرمائیں کہ دونوں میں سے کون سی بات صحیح ہے اور یہ فرق کیوں ہے؟

جواب: اُم المؤمنین حضرت خدیجہ بنت خویلدؓ کے مہر کے بارے میں سیرت کی قدیم کتابوں میں دونوں طرح کے بیانات ملتے ہیں:

بعض سیرت نگاروں نے بیس نوخیز اونٹنیاں (عشرین بکرۃ) مہر قرار دیا ہے۔ ان میں ابن ہشام، ابن کثیر، شمس الدین ذہبی، اور سہیلی رحمہم اللہ قابل ذکر ہیں۔ بعد کے بہت سے سیرت نگاروں نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ جب کہ بعض دیگر سیرت نگاروں نے مہر کی مقدار "اثنتی عشرۃ أوقیۃ و نشا" قرار دی ہے۔ اوقیہ اور نشا سونے کے سکے ہوتے تھے اور درہم چاندی کا۔ ایک اوقیہ چالیس درہم کے برابر ہوتا تھا اور نشا بیس درہم کے برابر۔ اس طرح مہر کی مذکور مقدار پانچ سو درہم کے برابر تھی۔ اس مہر کا تذکرہ بلاذری، دمیاطی اور محبّ الدین طبری وغیرہ نے کیا ہے اور بعد کے بعض سیرت نگاروں نے اس کو اختیار کیا ہے۔

بعض سیرت نگاروں نے دونوں بیانات میں جمع و تطبیق کی کوشش کی ہے۔ مثلاً محبّ الدین الطبری نے لکھا ہے: "دونوں بیانات میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ آپ کے چچا جناب ابو طالب نے آپ کی طرف سے نقد مہر ادا کیا ہو اور آپ نے اپنی طرف سے بیس اونٹنیاں مزید دی ہیں اور دونوں کا مجموعہ مہر قرار پایا ہو[1] اور علی بن برہان الدین الحلبی نے اپنی کتاب 'السیرۃ الحلبیۃ' میں لکھا ہے: "ممکن ہے کہ بیس اونٹنیاں طے شدہ مہر کی مالیت کی ہوں اور آپ نے مہر کو نقد ادا کرنے کے بجائے اونٹنیوں کی شکل میں ادا کیا ہو۔"[2]

اسی اختلاف کی بنا پر بعض جدید سیرت نگاروں نے اپنی کتابوں میں دونوں بیانات درج کر دیے ہیں۔[3]

مہر فاطمی کی حیثیت

سوال: مہر فاطمی کو مسنون قرار دیا جاتا ہے۔ اس کی کیا حقیقت ہے؟ موجودہ دور میں اس کے برابر کتنی رقم بنتی ہے؟ اگر کسی لڑکی کا مہر چاندی سونے کی شکل میں باندھا گیا، لیکن فوراً اس کی ادائی نہیں ہوئی، بلکہ اس پر دس پندرہ سال گزر گئے۔ اب مہر ادا کرنا ہو تو چاندی یا سونے کی موجودہ مالیت کے لحاظ سے حساب ہوگا یا اُس زمانے کے حساب سے جب مہر واجب ہوا تھا؟

---

(۱) السمط الثمین فی مناقب امہات المؤمنین، دار الحدیث القاھرۃ، ص:۲۸

(۲) السیرۃ الحلبیۃ، علی بن برھان الدین الحلبی، ۱/۳۰۱

(۳) مثلاً ملاحظہ کیجئے نسآء النبی، بنت الشاطی، دار الکتاب العربی، بیروت ۱۹۷۹، ص: ۴۰، زوجات الانبیاء، و امہات المؤمنین، محمد علی قطب، الدار الثقافیۃ للنشر القاھرۃ، ۲۰۰۴، ص ۱۱۵، معمار انسانیت، مولانا فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی، جامعہ دار السلام مالیر کوٹلہ پنجاب، ۱۹۹۱، ص:۷۶

جواب: نکاح کے دوران جن کاموں کی انجام دہی کی تاکید آئی ہے، ان میں سے ایک مہر بھی ہے۔ اگرچہ وہ نہ نکاح کے ارکان میں سے ہے نہ اس کی شرائط میں سے، لیکن اس کی ادائی پر بہت زور دیا گیا ہے۔

مہر اتنا ہی طے کرنا چاہیے جتنا شوہر آسانی سے ادا کر سکے۔ بہت زیادہ مہر مقرر کرنے کو فخر و مباہاۃ کی چیز سمجھ لیا گیا ہے، حالاں کہ یہ چیز شرعی اعتبار سے بھی غلط ہے اور عقلی اعتبار سے بھی۔ ایک مرتبہ حضرت عمر بن الخطابؓ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے درمیان خطبہ دیتے ہوئے فرمایا:

> ''لوگو! بہت زیادہ مہر مقرر کرنے سے اجتناب کرو۔ اگر یہ کوئی اعزاز واکرام کی چیز ہوتی تو رسول اللہ ﷺ ایسا ضرور کرتے۔ حالاں کہ آپؐ نے جن خواتین سے نکاح کیا ان میں سے کسی کو بارہ اوقیہ سے زیادہ مہر نہیں دیا اور آپؐ نے اپنی صاحب زادیوں میں سے بھی کسی کا مہر اس سے زیادہ مقرر نہیں فرمایا۔'' (۱)

امام ابوداؤد نے وضاحت کی ہے کہ ایک اوقیہ چالیس درہم کا ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے بارہ اوقیہ ۴۸۰ درہم کے برابر ہوئے۔

ایک دوسری روایت ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے۔ ان سے کسی نے دریافت کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی ازواج کا کیا مہر طے فرمایا تھا؟ انھوں نے جواب دیا: ساڑھے بارہ اوقیہ (۲) یہ مقدار پانچ سو درہم کے برابر ہوتی ہے۔

آں حضرت ﷺ نے اپنی دوسری صاحب زادیوں کے لیے جو مہر طے فرمایا تھا وہی حضرت فاطمہؓ کا بھی مہر تھا۔ اس کو الگ سے کوئی انفرادی اور امتیازی حیثیت حاصل نہیں ہے۔ مہر فاطمی کو سنت قرار دیا جاتا ہے، لیکن اسے اس معنی میں سنت سمجھنا غلط ہے کہ اس سے کم یا اس سے زیادہ مہر طے کرنا غیر افضل ہے۔ اس معاملے میں درست رویہ یہ ہے کہ مہر حیثیت کے مطابق متعین کرنا چاہیے۔ کم یا زیادہ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ صحابہ کرام جو اتباع سنت کے بہت زیادہ مشتاق رہتے تھے، ان کے بہ کثرت واقعات مروی ہیں کہ انھوں نے کم سے کم مہر پر نکاح کیا۔

ہندستانی وزن کے اعتبار سے ایک درہم ایک چوتھائی تولے سے کچھ زیادہ ہوتا ہے۔

---

(۱) سنن ابی داؤد، کتاب النکاح، باب الصداق ۲۱۰۷

(۲) سنن ابی داؤد، حوالہ سابق ۲۱۰۵

اس لحاظ سے مہر فاطمی ۵۰۰ درہم کی مقدار ۱۳۱ تولہ ۳ ماشہ چاندی کے برابر ہے۔ یہ تحقیق مشہور عالم دین مولانا مفتی محمد شفیع عثمانیؒ کی ہے۔(۱) یہ مقدار انگریزی وزن کے اعتبار سے ایک کلو پانچ سو اکتیس (۱۵۳۱) گرام کے برابر ہے۔ اگر کوئی شخص مہر فاطمی پر نکاح کرتا ہے تو اسے اس مقدار کی چاندی کی مالیت کے برابر روپیہ ادا کرنا ہوگا۔

مہر جس وقت طے کیا جائے، بہتر ہے کہ اسی وقت ادا کردیا جائے۔ لیکن اگر کسی شخص نے اس وقت ادا نہیں کیا اور بعد میں کچھ عرصہ گزر جانے پر وہ ادا کرنا چاہے تو وقتِ ادائی مذکورہ مقدار ایک کلو ۱۳۱ گرام کی چاندی کی مالیت کے بہ قدر روپیہ ادا کرنا اس پر لازم ہوگا۔ اس زمانے کے نرخ کا اعتبار نہ ہوگا جب اس پر مہر واجب ہوا تھا۔

نکاح ثانی کے لیے پہلی بیوی کی اجازت یا اطلاع

سوال: براہ کرم ایک مسئلے میں ہماری رہ نمائی فرمائیں:

ایک جوڑے (میاں بیوی) کے درمیان کئی سال سے تعلقات خراب چل رہے ہیں۔ تعلقات کی درستی کے لیے دونوں کے متعلقین کوشش بھی کر رہے ہیں۔ بیوی شوہر کی رضا مندی سے بہ سلسلۂ ملازمت بیرون ملک مقیم ہے، جہاں شوہر صاحب بھی کئی مرتبہ گئے ہیں اور چند ماہ قیام بھی کیا ہے۔ دونوں کے درمیان فون اور انٹرنیٹ کے ذریعے روزانہ گفتگو ہوتی رہتی ہے۔ ایک دن اچانک شوہر نے خاموشی کے ساتھ نکاح ثانی کرلیا۔ اس کی اطلاع نہ پہلی بیوی کو دی نہ اس کے ولی کو۔ ولی کو عین نکاح کے وقت پتا چلا تو اس نے نکاح کی مجلس میں پہنچ کر اس کو رکوانا چاہا۔ اس نے کہا کہ نکاح ثانی سے پہلے شوہر کو کم از کم اس کی اطلاع پہلی بیوی کو کرنی چاہیے۔ مگر نکاح خواں مولانا صاحب نے فرمایا کہ شریعت میں نکاح ثانی کے لیے شوہر کو اپنی پہلی بیوی کو اطلاع دینے کی قید نہیں رکھی گئی ہے، یہاں تک کہ اخلاقاً بھی اسے بتانا ضروری نہیں ہے۔

بہ راہ کرم رہ نمائی فرمائیں۔ کیا پہلی بیوی کو پوری طرح اندھیرے میں رکھ کر نکاح ثانی کرلینا شرعاً اور اخلاقاً درست ہے؟ یہ بھی بتائیں کہ نکاح ثانی کے لیے کیا شرائط، ضوابط اور آداب ہیں؟

---

(۲) ملاحظہ کیجیے اسلامی فقہ، مولانا مجیب اللہ ندوی، تاج کمپنی دہلی، ۱۹۹۲ء، ۲/ ۵۸

جواب: اسلامی شریعت میں مرد کو بہ یک وقت ایک سے زائد عورتوں سے نکاح کی اجازت دی گئی ہے، البتہ اس اجازت کو چار تک محدود کر دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَ اِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا تُقۡسِطُوۡا فِی الۡیَتٰمٰی فَانۡکِحُوۡا مَا طَابَ لَکُمۡ مِّنَ النِّسَآءِ مَثۡنٰی وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ ۚ فَاِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا تَعۡدِلُوۡا فَوَاحِدَۃً

(النساء:۳)

''اور اگر تم کو اندیشہ ہو کہ یتیموں کے ساتھ انصاف نہ کر سکو گے تو جو عورتیں تم کو پسند آئیں ان میں سے دو دو، تین تین، چار چار سے نکاح کر لو۔ لیکن اگر تمھیں اندیشہ ہو کہ ان کے ساتھ عدل نہ کر سکو گے تو پھر ایک ہی بیوی کرو۔''

اس آیت کی ابتدا میں یتیموں کے ساتھ انصاف نہ کر سکنے کی جو بات کہی گئی ہے اس کا پس منظر یہ ہے کہ عہد نبویؐ میں صاحبِ مال اور صاحب جمال یتیم لڑکی سے اس کا ولی اس کے مال و جمال کی وجہ سے نکاح تو کر لیتا تھا، لیکن دیگر عورتوں کی طرح اسے مہر اور دوسرے حقوق نہیں دیتا تھا۔ اس پر تنبیہ کی گئی کہ اگر یتیم لڑکیوں سے نکاح کرو تو انھیں پورا حق دو، ورنہ دیگر عورتوں سے نکاح کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ تم ایک سے زائد، چار عورتوں تک سے نکاح کر سکتے ہو[1] آیت کے آخری حصے میں اس اجازت کو بھی عدل سے مشروط کر دیا گیا ہے۔ یعنی ایک سے زیادہ عورتوں سے بہ یک وقت نکاح کی اجازت اسی صورت میں ہے، جب تم ان کے درمیان عدل کر سکو۔ اگر ان کے درمیان عدل نہ کر پانے کا اندیشہ ہو تو پھر ایک وقت میں ایک ہی عورت سے نکاح کرو۔

بیویوں کے درمیان عدل کا تذکرہ قرآن مجید کی ایک دوسری آیت میں بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَ لَنۡ تَسۡتَطِیۡعُوۡۤا اَنۡ تَعۡدِلُوۡا بَیۡنَ النِّسَآءِ وَلَوۡ حَرَصۡتُمۡ فَلَا تَمِیۡلُوۡا کُلَّ الۡمَیۡلِ فَتَذَرُوۡہَا کَالۡمُعَلَّقَۃِ ؕ (النساء:۱۲۹)

''بیویوں کے درمیان پورا پورا عدل کرنا تمھارے بس میں نہیں ہے۔ تم چاہو بھی تو اس پر قادر نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا (قانون الٰہی کا منشا پورا کرنے کے لیے یہ کافی ہے کہ) ایک بیوی کی طرف اس طرح نہ جھک جاؤ کہ دوسری کو ادھر لٹکتا چھوڑ دو۔''

بعض حضرات کہتے ہیں کہ سورۂ نساء کی تیسری آیت میں کہا گیا ہے کہ اگر بیویوں کے

(۱) بخاری، کتاب الشرکۃ باب شرکۃ الیتیم واھل المیراث ۲۴۹۴، ۴۵۷۳، ۴۵۷۴، مسلم: ۳۰۱۸

درمیان عدل نہ کر پانے کا اندیشہ ہو تو ایک ہی بیوی کرو اور اسی سورت کی آیت ۱۲۹ میں صراحت ہے کہ بیویوں کے درمیان عدل کر پانا کسی شخص کے لیے ممکن ہی نہیں، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بیک وقت ایک سے زیادہ عورتوں کو نکاح میں رکھنا جائز نہیں ہے۔ لیکن یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں ہے۔ آیت میں جس عدل کو ناممکن بتایا گیا ہے، اس کا تعلق قلبی تعلق اور محبت سے ہے۔ مختلف اسباب سے یہ چیز فطری ہے کہ آدمی ایک بیوی سے زیادہ محبت کرے اور دوسری بیوی یا بیویوں سے کم کرے۔ اور جس عدل کو ملحوظ رکھنے کا حکم دیا گیا ہے، اس کا تعلق نفقہ، کسوۃ، سکنیٰ اور شب باشی کے حقوق میں مساوات سے ہے۔ یعنی جس قدر ایک بیوی کا نان ونفقہ برداشت کرے، اس کے لیے لباس وزیورات فراہم کرے، اسے رہائش کی سہولت دے اور اس کے ساتھ رات گزارے، اسی قدر دوسری بیوی کے ساتھ بھی معاملہ کرے۔ جو شخص دو بیویوں کے درمیان معاملات میں فرق روا رکھتا ہے، اس کے لیے حدیث میں سخت وعید آئی ہے۔ آپؐ کا ارشاد ہے:

مَنْ كَانَتْ لَهُ امْرَأَتَانِ فَمَالَ اِلٰى اِحْدَاهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى جَاءَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَ شِقُّهُ مَائِلٌ(۱)۔

''جس شخص کی دو بیویاں ہوں اور وہ ایک بیوی کی حق تلفی کرتے ہوئے دوسری بیوی کی طرف جھک جائے تو وہ قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ اس کا ایک پہلو جھکا ہوا ہوگا۔''

اللہ کے رسول ﷺ نے بیویوں کے درمیان عدل ومساوات کا عملی نمونہ پیش فرمایا ہے۔ آپ کی منظور نظر زوجہ ام المومنین حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں:

''رسول اللہ ﷺ اپنی ازواج میں سے کسی کو کسی پر ترجیح نہیں دیتے تھے۔ یہاں تک کہ آپ ہم میں سے کسی کے پاس صرف اتنی ہی دیر ٹھہرتے تھے، جتنی دیر دوسری بیوی کے پاس ٹھہرتے تھے۔ آپؐ روزانہ ہم سب کے پاس تشریف لاتے تھے۔ ہر بیوی سے قریب ہوتے، لیکن اسے ہاتھ نہیں لگاتے تھے، یہاں تک کہ آخر میں اس بیوی کے پاس جاتے تھے جس کی باری ہوتی تھی اور اس کے یہاں رات گزارتے تھے۔'' (۲)

---

(۱) ابوداؤد، کتاب النکاح، باب فی القسم بین النساء ۲۱۳۳، ترمذی: ۱۱۴۱

(۲) ابوداؤد، حوالہ سابق، ۲۱۳۵

اس بنا پر شوافع اور حنابلہ کہتے ہیں کہ اگر ایک بیوی سے اعفاف کا مقصد پورا ہو رہا ہو، یعنی شوہر کی جنسی تسکین ہو رہی ہو اور دوسری کی کوئی خاص ضرورت نہ ہو تو ایک ہی بیوی پر اکتفا کرنا مستحب ہے۔ اس لیے کہ ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کی صورت میں ان کے درمیان عدل نہ کر پانے کا اندیشہ ہے۔ حنفیہ کہتے ہیں کہ اگر بیویوں کے درمیان عدل قائم رکھنے کی امید ہو تو ایک سے زائد (چار تک) عورتوں سے نکاح جائز ہے۔[1]

شریعت میں نکاح ثانی کو پہلی بیوی کی اجازت یا اطلاع پر موقوف نہیں کیا گیا ہے۔ اس لیے کہ نکاح کا بار شوہر کو اٹھانا ہوتا ہے۔ وہی نان ونفقہ اور دیگر حقوق کی ادائی کا ذمّے دار ہوتا ہے۔ ان معاملات میں سے کسی کا تعلق پہلی بیوی سے نہیں ہے۔

صورت مسئولہ میں متعدد تضادات پائے جاتے ہیں اور متعدد ابہامات موجود ہیں۔ ابتدا میں کہا گیا ہے کہ زوجین کے درمیان کئی سال سے تعلقات خراب چل رہے ہیں، جن کی درستی کی کوشش جاری ہے۔ معاً بعد یہ بھی کہا گیا ہے کہ بیوی شوہر کی رضامندی سے بہ سلسلۂ ملازمت بیرون ملک مقیم ہے۔ نکاح کا ایک مقصد اِعفاف ہے، یعنی زوجین پاکیزہ زندگی گزاریں اور ان کی جنسی ضروریات پوری ہوں۔ بیوی کے بیرون ملک ملازمت سے یہ مقصد پورا ہوتا ہوا نظر نہیں آتا۔ خاندان میں نان ونفقے کی ذمے داری شوہر پر ہے نہ کہ بیوی پر۔ یہاں یہ واضح نہیں ہے کہ بیوی نے ملازمت، وہ بھی بیرون ملک، عام حالات میں، محض معیار زندگی بلند کرنے کے لیے اختیار کی ہے، یا کسی مجبوری اور حقیقی ضرورت کی تکمیل کے لیے۔

نکاح ثانی کو پہلی بیوی کی اجازت یا اطلاع سے مشروط کرنے کے بجائے اس بات کی کوشش کرنی چاہیے کہ شوہر ایک سے زائد نکاح کرنے کی صورت میں بیویوں کے درمیان عدل سے کام لے اور ان میں سے کسی کی حق تلفی نہ کرے۔ یہی شریعت کا مطلوب ہے۔

شادی کے بعد بیوی کی کفالت

سوال: ہمارے ایک دوست ہیں، جن کی دو بہنیں ہیں۔ ایک بہن کی شادی ہوگئی ہے اور وہ اپنے شوہر کے ساتھ رہتی ہے۔ دوسری بہن غیر شادی شدہ ہے۔ والدین بھی باحیات ہیں۔ ایک ماہ قبل

---

(۱) الموسوعۃ الفقہیۃ کویت، ۲۲۰/۴۱، بہ حوالہ مغنی المحتاج، ۱۲۷/۲، ۱۲۸، احکام القرآن للجصاص، ۵۴/۲

ان صاحب کی شادی ہوئی ہے۔ یہ سعودی عرب میں ملازمت کرتے ہیں۔ پاسپورٹ اور ویزا کے مسائل کی وجہ سے ابھی ان کے لیے اپنی بیوی کو اپنے ساتھ لے جانا ممکن نہیں ہے، جب کہ ارادہ ہے۔

سوال یہ ہے کہ ان کے سعودی عرب جانے کے بعد ان کی بیوی اپنے میکے میں رہے یا سسرال میں؟ واضح رہے کہ دونوں خاندانوں کی معاشی اور سماجی حالت بہتر ہے اور ان میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ سسرال والے اپنی بہو کو اور میکے والے اپنی لڑکی کو اپنے یہاں رکھنے پر تیار ہیں۔ یہ بھی واضح فرمائیں کہ اگر ان کی بیوی اپنے میکے میں رہے تو کیا وہ ان سے نان ونفقہ پانے کی مستحق ہوگی؟ اگر ہاں تو اس کی مقدار کیا ہوگی؟

جواب: شادی کے بعد بیوی کی کفالت اور اس کا نان ونفقہ شوہر کی ذمے داری ہے۔ اگر کسی وجہ سے شوہر بیوی کو اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتا تو کہاں رکھے اس کا نظم کرنا اور اس کے مصارف برداشت کرنا شوہر کی ذمے داری ہے۔ اب بیوی چاہے اپنے میکے میں رہے یا سسرال میں، اس کے جملہ مصارف شوہر کے ذمے ہوں گے۔

نان ونفقہ کی کوئی مقدار متعین نہیں کی گئی ہے۔ قرآن حکیم کی رو سے شوہر کی مالی اور معاشی حیثیت کے مطابق وہ کم یا زیادہ ہوسکتی ہے۔ (الطلاق:۷)

شادی کے بعد شوہر کے والدین یا اس کی غیر شادی شدہ بہن کی خبر گیری بیوی کی ذمے داری نہیں ہے، لیکن اخلاقیات کا تقاضا ہے کہ شوہر کی خوش نودی اور محبت حاصل کرنے کے لیے وہ اس کے متعلقین اور گھر والوں کا خیال رکھے۔

ہونا یہ چاہیے کہ بیوی اس معاملے میں شوہر کی مرضی کے مطابق کام کرے۔ وہ اس کے گھر والوں کے ساتھ رہے اور شوہر کی اجازت سے کچھ دن اپنے میکے بھی چلی جایا کرے۔ اس پورے عرصے میں وہ شوہر سے نان ونفقہ پانے کی حق دار ہوگی۔

بیوی کی کمائی میں شوہر کا حصہ

سوال: بہ راہ کرم ایک مسئلے میں رہ نمائی فرمائیں:

شوہر بے روزگار ہے، بیوی ملازمت کرتی ہے۔ اس کی تنخواہ سے ہی گھر کے اخراجات

پورے ہوتے ہیں۔ شوہر کی سسرال والے اسے لعنت ملامت کرتے ہیں کہ تم حرام کھاتے ہو، بیوی کی کمائی پر جی رہے ہو۔ کیا بیوی کی کمائی سے شوہر کا کھانا پینا جائز ہے یا نہیں؟ بیوی کی کمائی شوہر کے لیے حلال ہے یا حرام؟ یہ بھی بتائیں کہ دونوں لاولد ہیں تو بیوی کے مرنے کے بعد اس کی جائداد کی تقسیم کس طرح ہوگی؟ کیا شوہر کے علاوہ بھی اس میں کسی کا حصہ ہوگا؟

جواب: عام حالات میں اسلامی شریعت نے گھر کا خرچ اٹھانے کی ذمے داری شوہر پر عائد کی ہے اور بیوی کو اس سے آزاد رکھا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْضٍ وَّ بِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ط (النساء:۳۴)

”مرد عورتوں پر قوام (یعنی نگہبان) ہیں۔ اس بنا پر کہ اللہ تعالیٰ نے ان میں سے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے اور اس بنا پر کہ مرد اپنے مال خرچ کرتے ہیں۔“

اس لیے اگر بیوی مال دار ہو تو بھی شوہر سے نان ونفقہ پانے کی مستحق ہے۔ لیکن ایسے حالات پیش آسکتے ہیں کہ بیوی کو کسب معاش کے لیے مجبور ہونا پڑے۔ مثلاً وہ مطلقہ یا بیوہ ہو جائے اور اس کی کفالت کرنے والا کوئی نہ ہو، یا شوہر بے روزگار ہو اور باوجود کوشش کے کسب معاش میں کامیاب نہ ہو پا رہا ہو، یا بچے زیادہ ہوں اور شوہر کی آمدنی کفایت نہ کرتی ہو۔ ان حالات میں عورت کسب معاش کے لیے جدوجہد کر سکتی ہے۔ اسلام نے اس کی اجازت دی ہے۔

اسلام کا امتیاز یہ ہے کہ اس نے عورت کا حق ملکیت تسلیم کیا ہے۔ بعض دیگر مذاہب اور تہذیبوں میں اسے یہ حق حاصل نہیں تھا۔ کافی جدوجہد کے بعد گزشتہ صدی میں وہ اس سے بہرہ ور ہو پائی ہے۔ بیوی جو کچھ کمائے اس میں اسے تصرف کرنے کی پوری آزادی ہے۔ شوہر کو حق نہیں کہ اس پر قبضہ جمائے، یا اپنی مرضی کے کاموں میں خرچ کرنے پر بیوی کو مجبور کرے۔ لیکن اگر بیوی اپنی خوشی سے اپنی کمائی گھر کے کاموں پر خرچ کرتی ہے، یا کچھ رقم شوہر کے حوالے کرتی ہے کہ اسے جس طرح چاہے خرچ کرے، تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ بغیر کسی کراہت کے شوہر وہ رقم لے سکتا ہے اور اپنی پسند کی جگہوں پر خرچ کر سکتا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَ اٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحۡلَةً ؕ فَاِنۡ طِبۡنَ لَكُمۡ عَنۡ شَیۡءٍ مِّنۡهُ نَفۡسًا فَكُلُوۡهُ هَنِیۡٓـًٔا مَّرِیۡٓـًٔا ۝ (النساء:۴)

''اور عورتوں کو ان کے مہر خوش دلی سے دے دو۔ البتہ اگر وہ خود اپنی خوشی سے مہر کا کوئی حصہ تمھیں معاف کر دیں تو تم خوشی کے ساتھ شوق سے کھا سکتے ہو۔''

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ مہر عورت کا حق ہے، جس کی ادائی شوہر پر لازم ہے۔ اگر وہ اس کے کچھ حصے سے بہ خوشی دستبردار ہو جائے تو شوہر اسے اپنے استعمال میں لا سکتا ہے۔ یہی حکم عورت کی ملکیت کی دوسری چیزوں کا بھی ہوگا۔ اگر بیوی اپنی خوشی سے اپنی کمائی شوہر کو دے رہی ہے اور اس کی بے روزگاری کی صورت میں ملازمت کر کے گھر کا خرچ اٹھانے میں اس کی مدد کر رہی ہے تو کسی دوسرے کو اس پر اعتراض کرنے اور شوہر کو لعنت ملامت کرنے کا کیا حق پہنچتا ہے!

عہد نبوی میں اس کی متعدد مثالیں ملتی ہیں۔ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ مالی اعتبار سے خوش حال نہ تھے۔ ان کی اہلیہ حضرت زینبؓ دست کاری میں ماہر تھیں، جس سے وہ اچھا خاصا کما لیتی تھیں۔ ان کی ساری کمائی شوہر اور بچوں پر خرچ ہو جاتی تھی اور صدقہ وخیرات کے لیے کچھ نہ بچتا تھا۔ ایک بار انھوں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر سوال کیا کہ میری ساری کمائی گھر ہی میں شوہر اور بچوں پر خرچ ہو جاتی ہے، اس بنا پر میں دوسروں میں کچھ صدقہ نہیں کر پاتی۔ کیا مجھے اپنے شوہر اور بچوں پر خرچ کرنے کا اجر ملے گا؟ آپؐ نے جواب دیا:

اَنۡفِقِی عَلَیۡهِمۡ، فَاِنَّ لَكِ فِیۡ ذٰلِكَ اَجۡرُ مَا اَنۡفَقۡتِ عَلَیۡهِمۡ[۱]

''ہاں تم ان پر خرچ کرو، تمھیں اس کا اجر ملے گا۔''

خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ میں ہمارے لیے نمونہ موجود ہے۔ ام المؤمنین حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ایک مال دار خاتون تھیں۔ آں حضرت ﷺ سے نکاح کے بعد انھوں نے اپنی پوری دولت آپؐ کے قدموں میں ڈھیر کر دی اور آپؐ اس میں سے خرچ کرتے رہے۔

جہاں تک یہ سوال ہے کہ بیوی کے مرنے کے بعد اس کی جائداد کس طرح تقسیم ہوگی تو

(۱) مسند احمد:۱۶۰۸۶

اس کے تفصیلی احکام قرآن وحدیث میں مذکور ہیں۔ اگر بیوی لاولد ہو تو نصف جائداد کا وارث شوہر ہوگا (النساء: ۱۲)۔ بقیہ کی تقسیم دیگر مستحقین وراثت (ذوی الفروض، عصبہ وغیرہ) میں ان کے حصوں میں مطابق ہوگی۔ اس کی تفصیل کتب فقہ میں دیکھی یا علماء سے معلوم کی جاسکتی ہے۔

انفاق کے لیے شوہر کی اجازت

سوال: ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر عورت اپنے شوہر کے مال میں سے صدقہ وخیرات کرتی ہے تو اسے نصف اجر ملے گا اور نصف اجر اس کے شوہر کو ملے گا۔ دوسری جگہ حضور اکرمؐ سے مروی ہے کہ ''عورت اپنے شوہر کی اجازت کے بغیر اپنے گھر سے کچھ خرچ نہ کرے۔''

ان دونوں احادیث سے یہ بات صاف ہوجاتی ہے کہ عورت کو اگر پورا اجر چاہیے تو اس کو نوکری کرنی ہوگی، تاکہ کچھ مال اس کی ملکیت میں ہو اور اس پر اس کو پورا اختیار ہو، کہ جس کو چاہے دے سکے اور جب چاہے صدقہ وخیرات کر سکے۔

دشواری یہ پیش آتی ہے کہ کوئی بہت ضرورت مند ہمارے پاس آیا۔ اس کو فوری طور پر کچھ امداد کی ضرورت ہے تو کیا اس صورت میں ہم شوہر کے آنے کا انتظار کریں؟ اس طرح کی چھوٹی موٹی ضروریات روزمرہ کی زندگی میں پیش آتی رہتی ہیں۔ اس دوران شوہر گھر پر موجود نہیں ہیں، تو کیا ہر بات کے لیے ان سے اجازت لینی پڑے گی؟ یا انتظار کرنا پڑے گا کہ وہ آئیں، تب ان سے اجازت لے کر فلاں کام کریں؟

عام طور پر لوگوں کو یہ کہتے سنا ہے کہ جو زیور عورت اپنے میکے سے لے کر آتی ہے وہ اس کی ملکیت ہے، اس لیے اس کی زکوٰۃ اسی پر واجب ہے۔ جب عورت کہیں نوکری نہیں کرتی تو زکوٰۃ کس طرح ادا کرے۔ شوہر نام دار یہ کہہ کر پلّہ جھاڑ لیتے ہیں کہ تمھاری ملکیت ہے، تم جانو۔ اس طرح زیورات کی زکوٰۃ ادا نہیں ہو پاتی۔ بہ راہ کرم اس مسئلے میں ہماری رہ نمائی فرمائیں:

جواب: قرآن وحدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ازدواجی زندگی میں عورت کو گھر کے معاملات کی اور خاص طور پر شوہر کی غیر حاضری میں، ذمے دار اور نگراں بنایا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَیْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰہُ ط (النساء: ۳۴)

''پس نیک عورتیں فرماں بردار اور پیٹھ پیچھے اللہ کی حفاظت کی بدولت حفاظت کرنے والی ہوتی ہیں۔''

اس آیت میں اس چیز کی صراحت نہیں ہے کہ وہ کس کے پیٹھ پیچھے اور کس چیز کی حفاظت کرنے والی ہیں؟ مفسرین کرام نے اس کی تشریح میں لکھا ہے کہ اس سے مراد بیوی کا شوہر کی غیر حاضری میں اپنی آبرو اور اس کے مال کی حفاظت کرنا ہے۔(۱)

ایک حدیث میں ہے کہ ایک موقع پر اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

كُلُّكُمْ رَاعٍ وَ كُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ۔

''تم میں سے ہر شخص نگراں ہے اور تم میں سے ہر شخص سے اس کی رعیت کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔''

پھر آپؐ نے بہ طور مثال چند اشخاص کا تذکرہ کیا، اس میں آپؐ نے یہ بھی فرمایا:

اَلْمَرْاَةُ رَاعِيَةٌ عَلٰى بَيْتِ بَعْلِهَا وَ وَلَدِهٖ وَ هِيَ مَسْئُوْلَةٌ عَنْهُمْ۔(۲)

''عورت اپنے شوہر کے گھر اور اس کے بچوں کی نگراں ہے اور اس سے ان کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔''

نگرانی اور حفاظت کا مطلب یہی ہے کہ بیوی شوہر کے غائبانے میں اس کی اجازت کے بغیر اس کے مال میں کوئی تصرف نہ کرے، ورنہ وہ خیانت کی مرتکب ہوگی۔ ایک حدیث سے اس کی وضاحت ہوتی ہے۔ حضرت ابو امامۃ الباہلیؓ کہتے ہیں کہ میں نے حجۃ الوداع کے موقع پر رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے:

لَا تُنْفِقُ الْمَرْاَةُ شَيْئًا مِنْ بَيْتِ زَوْجِهَا اِلَّا بِاِذْنِ زَوْجِهَا۔

''عورت اپنے شوہر کے گھر سے اس کی اجازت کے بغیر کچھ خرچ نہ کرے۔''

اس پر ایک شخص نے دریافت کیا: اے اللہ کے رسولؐ! کیا وہ کھانا بھی کسی کو نہیں دے سکتی؟ آپؐ نے فرمایا: ذٰلِكَ اَفْضَلُ اَمْوَالِنَا (۳) (کھانا تو بہترین مال ہے۔)

---

(۱) ملاحظہ کیجیے طبری، زمخشری، بیضاوی، رازی، ابوحیان، ابن کثیر، آلوسی اور دیگر مفسرین کی کتابوں میں متعلقہ آیت کی تفسیر

(۲) بخاری، کتاب العتق، باب کراهية التطاول على الرقيق ۲۴۱۶ و دیگر مقامات، مسلم: ۱۸۲۹

(۳) ترمذی، کتاب الزکاۃ باب فی نفقة المرأة من بيت زوجها: ۶۷۰

بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت کو شوہر کے مال میں سے اپنے طور پر خرچ کرنے کی اجازت ہے۔ اگر وہ ایسا کرتی ہے تو اسے بھی اجر ملے گا اور اس کے شوہر کو بھی۔

ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ روایت کرتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

اِذَا اَطْعَمَتِ الْمَرْأَۃُ مِنْ بَیْتِ زَوْجِھَا غَیْرَ مُفْسِدَۃٍ کَانَ لَھَا اَجْرُھَا وَلَہٗ مِثْلُہٗ...... لَہٗ بِمَا اکْتَسَبَ وَلَھَا بِمَا اَنْفَقَتْ(۱)

''اگر عورت اپنے شوہر کے گھر میں سے بغیر بدنیتی کے کسی کو کھلائے تو اسے بھی اجر ملے گا اور اس کے شوہر کو بھی......شوہر کو کمانے کا اجر اور اسے خرچ کرنے کا اجر۔''

بعض روایات میں اَطْعَمَتْ کی جگہ 'تَصَدَّقَتْ' یا 'اَنْفَقَتْ' (خرچ کرنے) کے الفاظ ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مال خرچ کرنا مراد ہے، چاہے کھانا کھلانے کی صورت میں ہو یا نقد کی صورت میں۔ اس حدیث میں 'غَیْرَ مُفْسِدَۃٍ' کی قید لگی ہوئی ہے۔ یعنی عورت کا خرچ کرنا نیک نیتی سے اور اجر و ثواب کے لیے ہو، محض شوہر کے مال کو بے دردی سے اڑانا پیش نظر نہ ہو۔

اس حدیث میں 'شوہر کی اجازت' کا تذکرہ نہیں ہے، لیکن دیگر احادیث کے پیش نظر شارحین حدیث نے صراحت کی ہے کہ شوہر کی اجازت کے بغیر بیوی کے لیے اس کے مال میں سے کچھ بھی خرچ کرنا جائز نہیں ہے۔ یہ اجازت صریح الفاظ میں بھی ہوسکتی ہے اور عرف کے اعتبار سے بھی۔ صحیح مسلم کے شارح علامہ نوویؒ نے اس پر مفصل بحث کی ہے۔ لکھتے ہیں:

''شوہر کے مال میں سے خرچ کرنے کے لیے بیوی کو اس سے اجازت لینا ضروری ہے۔ اگر اجازت نہ ہو، تو نہ صرف یہ کہ اسے کوئی اجر نہیں ملے گا، بلکہ دوسرے کے مال میں بغیر اس کی اجازت کے تصرف کرنے کا گناہ ہوگا۔ اجازت کی دو قسمیں ہیں: ایک صریح اجازت اور دوسری عرف و عادت سے سمجھ میں آنے والی اجازت۔ مثلاً کسی مانگنے والے کو روٹی کا ٹکڑا یا کوئی اور چیز دے دینا، جس کا عموماً چلن ہوتا ہے اور یہ عرف میں شامل ہوتا ہے۔ اس معاملے میں عموماً شوہر کی اجازت ہوتی ہے، اس لیے صریح الفاظ میں اجازت لینے کی ضرورت نہیں۔ لیکن اگر کسی جگہ اس کا عرف نہ ہو اور عورت کو شبہ ہو کہ پتہ نہیں شوہر کی رضامندی ہے یا نہیں، یا شوہر لالچی ہو اور صدقہ و انفاق کو

---

(۱) بخاری، کتاب الزکاۃ، باب اجر المرأۃ اذا تصدقت...: ۱۴۴۰، مسلم: ۱۰۲۴

پسند نہ کرتا ہو تو عورت کو صدقہ وخیرات کرنے کے لیے صاف الفاظ میں شوہر سے اجازت لینی ضروری ہے۔'' (۱)

بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت کے لیے شوہر کے مال میں سے خرچ کرنے کے لیے اس سے اجازت لینی ضروری نہیں ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

اِذَا اَنْفَقَتِ الْمَرْأَةُ مِنْ كَسْبِ زَوْجِهَا عَنْ غَيْرِ أَمْرِهِ فَلَهُ نِصْفُ اَجْرِهِ (۲)

''اگر عورت شوہر کے مال میں سے اس کی اجازت کے بغیر خرچ کرے تو شوہر کو نصف اجر ملے گا۔''

اس حدیث میں 'اجازت' سے مراد صریح الفاظ میں اجازت ہے، یعنی شوہر کی طرف سے اس متعین مال کو خرچ کرنے کے معاملے میں صریح اجازت نہ ہو، لیکن اس نے عمومی اجازت دے رکھی ہو، یا عرف میں بیوی کو اس قدر مال خرچ کرنے کی اجازت ہو۔ (۳)

'نصف اجر' کا مطلب یہ نہیں ہے کہ شوہر کے اجر میں کچھ کمی ہو جائے گی اور اتنا اجر بیوی کو مل جائے گا۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ بیوی کو مال خرچ کرنے کا اجر ملے گا اور شوہر کو اس کا مالک ہونے کا۔ بعض احادیث میں اس کی صراحت ہے:

لاَ يَنْقُصُ بَعْضُهُمْ اَجْرَ بَعْضٍ شَيْئًا (۴)

''ان میں سے ایک کی وجہ سے دوسرے کے اجر میں کچھ بھی کمی نہیں آئے گی۔''

امام نوویؒ نے لکھا ہے:

''ان احادیث کا مطلب یہ ہے کہ نیک کام میں شریک شخص اجر میں بھی شریک رہے گا۔ شرکت سے مراد یہ ہے کہ جس طرح ایک کو اجر ملے گا اسی طرح دوسرا بھی اجر کا مستحق ہوگا۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ایک کی وجہ سے دوسرے کے اجر میں کمی آجائے گی،

---

(۱) نووی، شرح صحیح مسلم، دار الکتب المصریۃ بیروت، ۲۰۰۵، جلد ۴، جزء ۷، ص: ۹۸-۹۹

(۲) بخاری، کتاب البیوع، باب قول اللّٰہ تعالیٰ انفقوا من طیبات ما کسبتم ۲۰۶۶، مسلم: ۱۰۲۶

(۳) نووی، حوالہ سابق

(۴) بخاری، کتاب الزکاۃ، باب من امر خادمہ بالصدقۃ ۱۴۲۵ ودیگر مقامات، مسلم: ۱۰۲۴

بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ دونوں ثواب میں شریک ہوں گے، اس کو بھی ثواب ملے گا اور اس کو بھی۔ خواہ کسی کو کم ثواب ملے کسی کو زیادہ۔'' (۱)

اسلامی نظام خاندان میں کمانے اور گھر کا خرچ چلانے کی ذمے داری مرد پر ڈالی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّ بِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ؕ (النساء: ۳۴)

''مرد عورتوں کے نگہبان ہیں، اس بنا پر کہ اللہ نے ان میں سے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے اور اس بنا پر کہ مرد اپنے مال خرچ کرتے ہیں۔''

لیکن ساتھ ہی اسلام نے عورت کا حقِ ملکیت تسلیم کیا ہے۔ جس مال کی وہ مالک ہو اس میں تصرف کرنے کی اسے پوری آزادی ہے، اس میں وہ کسی سے، حتیٰ کہ شوہر سے بھی اجازت لینے کی پابند نہیں ہے۔

ایک بات یہ بھی یاد رکھنے کی ہے کہ صاحبِ مال ہونے کے لیے نوکری کرنا ضروری نہیں ہے۔ عورت تجارت کے ذریعے مال دار ہو سکتی ہے، خواہ براہ راست تجارت کرے یا اس میں اپنا سرمایہ لگائے۔ اسے اپنے والدین یا دیگر رشتے داروں کے انتقال پر ان کی میراث میں سے حصہ مل سکتا ہے، اور ان کی زندگی میں ان سے تحائف مل سکتے ہیں، جن میں نقد رقم بھی ہو سکتی ہے، خود شوہر کی جانب سے وقتاً فوقتاً مختلف ضروریات کے لیے خرچ ملتا ہوگا، جس میں سے وہ پس انداز کر سکتی ہے۔ غرض عورت کے صاحبِ مال ہونے کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں۔ جہاں تک نوکری کا معاملہ ہے تو فقہاء نے صراحت کی ہے کہ اس کے لیے شوہر کی اجازت ضروری ہے۔ شوہر کی اجازت کے بغیر یا اس کی مرضی کے علی الرغم عورت کے لیے نوکری کرنا جائز نہیں ہے۔

عورت اپنے زیورات کی مالک ہے تو ظاہر ہے کہ ان کی زکوٰۃ بھی اسے ہی ادا کرنی چاہیے اور زیورات کی زکوٰۃ ادا کرنے کے لیے عورت کا کہیں نوکری کرنا ضروری نہیں ہے۔ وہ دیگر ذرائع سے ـــــ جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ـــــ مال کی مالک بن سکتی ہے اور بنتی ہے، اس لیے

(۳) نووی، حوالہ سابق

اسے اسی میں سے زکوٰۃ نکالنی ہوگی۔ شوہر پر الزام دھر کر کوئی عورت اپنی ذمے داری سے راہِ فرار نہیں اختیار کرسکتی۔

عقیقہ کی دعا

سوال: بعض کتابوں میں درج ہے کہ عقیقہ کا جانور ذبح کرنے کے بعد یہ دعا پڑھنی چاہیے:

اَللّٰهُمَّ هٰذِهٖ عَقِيقَةُ (بچی یا بچے کا نام) تَقَبَّلْهُ كَمَا تَقَبَّلْتَ مِنْ حَبِيْبِكَ مُحَمَّدٍ وَ خَلِيْلِكَ اِبْرَاهِيْمَ عَلَيْهِمَا الصَّلاَةُ وَالسَّلاَمُ دَمُهَا بِدَمِهٖ، لَحْمُهَا بِلَحْمِهٖ، شَعْرُهَا بِشَعْرِهٖ، عَظْمُهَا بِعَظْمِهٖ۔

کیا یہ دعا مسنون ہے؟ اگر ہاں تو حدیث کی کس کتاب میں مذکور ہے؟

جواب: عقیقہ کی مذکورہ بالا دعا مجھے حدیث کی کسی کتاب میں نہیں ملی۔ ایک حدیث ام المومنین حضرت عائشہؓ سے مروی ہے۔ وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حسنؓ اور حسینؓ کا ان کی پیدائش کے ساتویں دن عقیقہ کیا، سر کے بال منڈوائے اور جانور ذبح کرتے وقت یہ دعا پڑھنے کی ہدایت فرمائی:

بِسْمِ اللّٰهِ، اَللّٰهُ اَكْبَرُ، اَللّٰهُمَّ مِنْكَ وَلَكَ، هٰذِهٖ عَقِيقَةُ فُلاَنٍ۔

''اللہ کے نام سے، اللہ سب سے بڑا ہے۔ اے اللہ! یہ تیری ہی طرف سے ہے اور تیرے ہی لیے ہے۔ یہ فلاں کا عقیقہ ہے۔'' (فلاں کی جگہ بچے یا بچی کا نام لے)

یہ حدیث السنن الکبریٰ للبیہقی (۱۹۰۷۷)، مصنف عبدالرزاق (۷۹۶۳) اور مصنف ابن ابی شیبہ (۲۴۲۷۰) میں مروی ہے۔ اس کے علاوہ ابن المنذر، ابویعلی اور بزّار نے بھی اس کی روایت کی ہے۔ امام نوویؒ اور دیگر محدثین نے اس حدیث کی سند کو حسن قرار دیا ہے۔[۱]

عقیقے کا وقت

سوال: میری پوتی کی پیدائش کے بعد اس کا عقیقہ نہیں ہوسکا، یہاں تک کہ اب اس کی عمر تین سال ہونے کو ہے۔ کیا اب اس کا عقیقہ کرایا جاسکتا ہے؟ یہ بھی واضح فرمادیں کہ عقیقے کی شرعی

---

(۱) المجموع، ۸/ ۴۲۸

حیثیت کیا ہے؟ اگر کسی بچے کا عقیقہ نہ ہو سکے تو کیا اس کے والدین یا جن کے زیر کفالت وہ ہو، ان پر گناہ ہوگا۔

جواب: عقیقے کا وقت کسی بچے کی پیدائش کے بعد سے شروع ہوتا ہے، چنانچہ پیدائش سے قبل کیا گیا عقیقہ صحیح نہ ہوگا اور فقہاء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ساتویں دن عقیقہ کرنا مستحب ہے۔ اگر ساتویں دن نہ ہو سکے تو بعض فقہاء نے چودھویں دن اور اس دن بھی نہ ہو سکے تو اکیسویں دن عقیقہ کرنے کو مسنون قرار دیا ہے۔ اس کے بعد وہ مباح کے درجے میں آجاتا ہے۔ بعض فقہاء کے نزدیک بالغ ہونے سے پہلے تک عقیقہ کیا جا سکتا ہے۔

عقیقہ کرنا اصلاً باپ کی ذمے داری ہے۔ اگر کوئی دوسرا کر دے تو بھی ہو جائے گا۔ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے نواسوں حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کی پیدائش پر ان کا عقیقہ کیا تھا(۱)

احادیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے عقیقہ کرنے کا حکم دیا ہے۔ لیکن اس کے لیے جو مختلف تعبیرات اختیار کی گئی ہے ان کی بنا پر حکم کی نوعیت میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے۔ شوافع اور حنابلہ کے نزدیک سنت مؤکدہ، مالکیہ کے نزدیک مستحب اور احناف کے نزدیک مباح ہے(۲)

احناف کے نزدیک چوں کہ عقیقے کا تاکیدی حکم نہیں ہے، اس لیے نہ کرنے پر کوئی گناہ نہیں ہوگا۔

لڑکی کی پیدائش اور سماجی رویّہ

سوال: میں الحمدللہ ایک دین دار گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں۔ میری سسرال میں بھی دین کا خوب چرچا ہے۔ میری پانچ بچیاں ہیں۔ جب میری پہلی بچی ہوئی تو سسرال میں خوب جشن منایا گیا، مٹھائیاں تقسیم کی گئیں، دوسری اور تیسری بچی کی ولادت کے موقع پر بھی خوشی کا اظہار کیا گیا، لیکن کم کم، پھر جب چوتھی بچی ہوئی تو سسرال کے لوگوں کا انداز بدلنے لگا۔ کسی نے کھلے الفاظ

---

(۱) ابو داؤد، کتاب الضحایا، باب فی العقیقۃ ۲۸۴۱

(۲) الموسوعۃ الفقہیۃ کویت، ۲۷۶/۳۰-۲۷۷

میں کچھ کہا تو نہیں، لیکن دبی زبان میں اس خواہش کا اظہار ہونے لگا کہ اب لڑکا چاہیے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے پھر لڑکی دے دی۔ اب میرے ساتھ اس طرح برتاؤ کیا جانے لگا، گویا لڑکیوں کی پیدائش کی میں ہی قصوروار ہوں۔ اس طرح کے مشورے بھی میرے کانوں میں پڑنے لگے کہ اگر لڑکا چاہیے تو میرے شوہر کو دوسری شادی کر لینی چاہیے۔ اب میں پھر امید سے ہوں۔ مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ اگر پھر لڑکی ہوئی تو سسرال میں میں کہیں کی نہیں رہوں گی۔ کبھی جی میں آتا ہے کہ اسقاط کروالوں۔ لیکن یہ سوچ کر رک جاتی ہوں کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے ایسا کرنے سے منع کیا ہے۔ میں ان دنوں بہت پریشان ہوں۔ بہ راہِ کرم میری رہ نمائی فرمائیں۔ میں کیا کروں؟

جواب: اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس دنیا میں جن نعمتوں سے نوازا ہے ان میں سے ایک نعمت اولاد کی ہے۔ اولاد انسان کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہوتی ہے۔ انھیں پاکر وہ خوشی محسوس کرتا ہے۔ ان کے دم سے اس کی زندگی کی رنگینیاں قائم رہتی ہیں۔ ان کی کفالت کے لیے معاشی جدو جہد کرنا اس پر بار نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ کا قانون قدرت یہ ہے کہ وہ بعض انسانوں کو اولاد عطا کرتا ہے۔ ان میں سے بعض کو لڑکے اور لڑکیاں دونوں دیتا ہے، بعض کو صرف لڑکے اور بعض کو صرف لڑکیاں۔ کوئی مرد صاحب اولاد ہوگا یا نہیں، کوئی عورت بچہ جنے گی یا بانجھ ہوگی، کسی کے یہاں لڑکے اور لڑکیاں دونوں ہوں گی یا صرف لڑکے یا صرف لڑکیاں، کسی کے صرف ایک اولاد ہوگی، وہ بھی لڑکا یا لڑکی، کسی کے ایک سے زائد بچے ہوں گے، یہ سب اللہ تعالیٰ کی طے کی ہوئی تقدیر پر منحصر ہے۔ اس میں کسی مرد یا عورت کی خواہش یا کوشش کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔ سورۃ الشوریٰ میں اس بات کو قطعی اور دوٹوک الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ يَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ اِنَاثًا وَّ يَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ الذُّكُوْرَ ۙ اَوْ يُزَوِّجُهُمْ ذُكْرَانًا وَّ اِنَاثًا ۚ وَ يَجْعَلُ مَنْ يَّشَآءُ عَقِيْمًا ؕ اِنَّهٗ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ ۝

(الشوریٰ:۴۹،۵۰)

”اللہ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی کا مالک ہے، جو کچھ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔ جسے

چاہتا ہے لڑکیاں دیتا ہے، جسے چاہتا ہے لڑکے دیتا ہے، جسے چاہتا ہے لڑکے اور لڑکیاں ملا جلا کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے بانجھ کر دیتا ہے۔ وہ سب کچھ جانتا اور ہر چیز پر قادر ہے۔''

بعض سماجوں میں لڑکیوں کو لڑکوں سے کم تر حیثیت دی جاتی ہے۔ اسی بنا پر ان کی پیدائش پر نہ صرف یہ کہ خوشی کا اظہار نہیں کیا جاتا، بلکہ انھیں بوجھ سمجھا جاتا ہے۔ زمانۂ نزول قرآن میں عرب کے بعض قبیلوں کا یہی حال تھا۔ ان کے یہاں لڑکی پیدا ہوتی تو وہ بڑی خفت محسوس کرتے تھے اور ان میں سے بعض اسے زندہ زمین میں گاڑ دیتے تھے۔ قرآن نے اس کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے:

وَ اِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰی ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّ هُوَ كَظِیْمٌۚ۝ یَتَوَارٰی مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ ؕ اَیُمْسِكُهٗ عَلٰی هُوْنٍ اَمْ یَدُسُّهٗ فِی التُّرَابِ ؕ (النحل: ۵۸-۵۹)

''جب ان میں سے کسی کو بیٹی کے پیدا ہونے کی خوش خبری دی جاتی ہے تو اس کے چہرے پر کلونس چھا جاتی ہے اور وہ بس خون کا سا گھونٹ پی کر رہ جاتا ہے۔ لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے کہ اس بری خبر کے بعد کیا کسی کو منہ دکھائے۔ سوچتا ہے کہ ذلت کے ساتھ بیٹی کو لیے رہے یا مٹی میں دبا دے؟''

لڑکیوں کے معاملے میں عہد جاہلیت کے بعض قبیلوں کی جو سوچ تھی، موجودہ دور کے بہت سے سماجوں کی سوچ اس سے مختلف نہیں ہے۔ ان کے یہاں لڑکی کو بوجھ سمجھا جاتا ہے، اسی بنا پر اس کی پیدائش کی خبر سن کر ان پر پہاڑ ٹوٹ پڑتا ہے۔ نکاح کے مسائل اور اس کے ہوش ربا مصارف، جہیز کی فراہمی کے لیے مطلوبہ خطیر رقم وغیرہ کے بارے میں سوچ کر آدمی کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کے یہاں لڑکی پیدا ہی نہ ہو۔ لڑکی پیدا ہونے پر قدیم زمانے میں اسے زندہ درگور کر کے اس سے پیچھا چھڑا لیا جاتا تھا۔ جدید جاہلیت نے اس کام کے لیے نئی نئی تکنیکیں دریافت کر لی ہیں، جن کی مدد سے دورانِ حمل ہی جنین کی جنس معلوم کر لی جاتی ہے اور لڑکی ہونے کی صورت میں ولادت کی نوبت ہی نہیں آنے دی جاتی، پہلے ہی اسقاط (Abortion) کروا دیا جاتا ہے۔ لڑکیوں کو لڑکوں سے کم تر سمجھنے کی سوچ، افسوس ہے کہ دیگر سماجوں سے مسلمانوں میں

بھی سرایت کر رہی ہے۔ کسی خاندان میں کئی لڑکیاں پیدا ہو جائیں تو عموماً اس کا ذمہ دار عورت کو سمجھا جاتا ہے۔ یہ تصور کر لیا جاتا ہے کہ یہ عورت صرف لڑکیاں جننے والی ہے۔ اسی بنا پر اس طرح کا مشورہ دیا جاتا ہے کہ اگر لڑکا چاہیے تو مرد کو دوسری شادی کر لینی چاہیے۔ اب دوسری عورت آئے گی تبھی لڑکا پیدا ہو سکتا ہے، حالاں کہ لڑکا پیدا ہونے میں نہ مرد کا اختیار ہوتا ہے نہ عورت کا اور لڑکی پیدا ہونے میں عورت کا کوئی قصور نہیں ہے۔ اسی طرح یہ بھی ایک خام تصور ہے کہ موروثی طور پر کوئی عورت صرف لڑکیاں پیدا کرنے والی ہوتی ہے اور کسی عورت سے لڑکے زیادہ پیدا ہو سکتے ہیں۔ اوپر قرآن کریم کی صراحت گزری کہ کسی کے لڑکا یا لڑکی پیدا ہونا محض اللہ تعالیٰ کی قدرت، توفیق اور تقدیر پر منحصر ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں جدید میڈیکل سائنس سے جو معلومات حاصل ہوئی ہیں وہ بہت سوں کے لیے حیرت واستعجاب کا باعث ہوں گی۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ لڑکا یا لڑکی پیدا ہونے میں اصل کردار عورت کا نہیں، بلکہ مرد کا ہوتا ہے۔

جسم انسانی کے تولیدی خلیات (Reproductive cells) میں ایک جوہر پایا جاتا ہے، جسے Chromosomes کہتے ہیں۔ ان میں تمام موروثی خصوصیات موجود ہوتی ہیں، حتی کہ انھی کے ذریعے بالوں کے رنگ، آنکھوں کے رنگ اور جنس کی تعیین ہوتی ہے۔ تولیدی خلیہ میں کروموزوم کے ۲۳ جوڑے پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک جوڑا جنس (Sex) کی تعیین کے لیے مخصوص ہوتا ہے۔ اسے Sex Chromosome کہا جاتا ہے۔ یہ جوڑا دو طرح کے کروموزوم پر مشتمل ہوتا ہے۔ ایک کو X کروموزوم اور دوسرے کو Y کروموزوم کہتے ہیں۔

عورت کے بیضہ (Ovum) میں سیکس کروموزوم کا جو جوڑا پایا جاتا ہے اس کے دونوں کروموزوم X نوعیت کے ہوتے ہیں، اسی بنا پر انھیں Homogametic کہا جاتا ہے، جب کہ مرد کے نطفہ (Sperm) میں پایا جانے والا سیکس کروموزوم کا جوڑا دو الگ الگ نوعیت کے (X اور Y) کروموزوم پر مشتمل ہوتا ہے۔ اسی بنا پر انھیں Hetrogametic کہا جاتا ہے۔

استقرار حمل (Fertilization) کے وقت عورت کے بیضہ سے ایک کروموزوم نکلتا ہے، اسی طرح مرد کے نطفے سے ایک کروموزوم نکلتا ہے اور دونوں کے اتصال و اتحاد سے استقرار کا عمل انجام پاتا ہے۔ عورت کے بیضہ سے نکلنے والا کروموزوم ہر حال میں X ہوتا ہے، جب کہ اس سے ملنے والا نطفۂ مرد کا کروموزوم X بھی ہو سکتا ہے اور Y بھی۔ اگر عورت کے X کروموزوم سے مرد کا X کروموزوم ملتا ہے تو اس صورت میں لڑکی پیدا ہوتی ہے۔ اور اگر اس سے

مرد کا Y کروموزوم ملتا ہے تو لڑکا پیدا ہوتا ہے۔ اب عورت کے X کروموزوم سے مرد کا (X اور Y میں سے) کون سا کروموزوم ملے؟ اس میں انسانی کوشش کا کچھ بھی دخل نہیں ہوتا، یہ محض تقدیرِ الٰہی پر منحصر ہوتا ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ جو کروموزوم جنین (Foetus) کی جنس متعین کرتا ہے اور جس سے طے ہوتا ہے کہ آئندہ پیدا ہونے والا بچہ لڑکا ہوگا یا لڑکی، وہ مرد سے حاصل ہوتا ہے، نہ کہ عورت سے۔ قرآن کریم نے اس سلسلے میں جو لطیف تعبیر اختیار کی ہے اس سے مذکورہ بالا سائنسی بیان کی تصدیق ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ ۖ (البقرۃ: ۲۲۳) ''تمھاری عورتیں تمھاری کھیتی ہیں۔''

کھیتی کا کام یہ ہوتا ہے کہ اس میں جو بیج ڈالا جائے اسے پروان چڑھائے اور اس کی اچھی پیداوار کرے۔ اگر کسی کھیت میں گیہوں کے بیج ڈالے جائیں گے تو اس سے گیہوں ہی پیدا ہوگا۔ اگر اس میں چنا یا جوار کے بیج ڈالے جائیں گے تو چنا یا جوار ہی اگے گا۔ یہ ناممکن ہے کہ بیج تو چنا یا جوار کا ڈالا جائے اور امید گیہوں اگنے کی رکھی جائے اور جب گیہوں نہ اگے تو کھیت کو قصوروار قرار دیا جائے۔ مفسرین کرام نے آیت مذکورہ کی تفسیر میں یہی بات کہی ہے۔ علامہ زمخشریؒ (م ۵۳۸ھ) فرماتے ہیں:

> ''یہ مجاز ہے۔ اس آیت میں عورتوں کو کھیت سے تشبیہ دی گئی ہے اور ان کے رحم میں ڈالے جانے والے نطفہ کو، جس سے نسل انسانی کا سلسلہ چلتا ہے، بیج کے مشابہ قرار دیا گیا ہے۔'' (۱)

امام فخر الدین رازیؒ (م ۶۰۶ھ) نے لکھا ہے:

> ''اس آیت میں عورتوں کو کھیتی بہ طور تشبیہ کہا گیا ہے۔ گویا عورت زمین کے مثل ہے جس میں کاشت کی جاتی ہے، نطفہ بیج کے مثل ہے اور پیدا ہونے والا بچہ پیداوار کے مثل ہے۔'' (۲)

یہی تشریح بعض دیگر مفسرین، مثلاً علامہ قرطبی (م ۶۷۱ھ) اور علامہ ابو حیان (م ۷۴۵ھ) نے بھی کی ہے۔(۳)

---

(۱) الکشاف، مکتبۃ العبیکان، الریاض، ۱۹۹۸ء، ۱/ ۴۳۴

(۲) التفسیر الکبیر، دار الفکر، بیروت، ۱۹۸۱ء، ۶/ ۷۵

(۳) ملاحظہ کیجیے الجامع لاحکام القرآن للقرطبی، مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت، ۲۰۰۶ء، ۴/ ۷، البحر المحیط لابی حیان الاندلسی، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، ۱۹۹۳ء، ۲/ ۱۸۱

علامہ راغب اصفہانی (م ۵۰۲ھ) نے اس موقع پر ایک نکتہ کی بات کہی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے: ''کھیتی کے لیے عربی زبان میں دو الفاظ مستعمل ہیں: ایک حرث اور دوسرا زرع۔ دونوں الگ الگ معنوں میں مستعمل ہیں۔ حرث کہتے ہیں زمین میں بیج ڈالنے اور اسے کاشت کے لیے تیار کرنے کو۔ اور زرع کہتے ہیں زمین سے جو کچھ آگے اس کی دیکھ بھال کرنے کو۔ سورۂ واقعہ کی آیات: ۶۳، ۶۴ میں یہ دونوں الفاظ الگ الگ معنوں میں آئے ہیں۔ یہاں سورۂ بقرہ کی آیت میں اللہ تعالیٰ نے زرع کا لفظ نہیں، بلکہ حرث کا لفظ استعمال کیا ہے۔ گویا عورتیں کھیتی کے مثل ہیں، جس میں مرد بیج ڈالتے اور پیداوار چاہتے ہیں۔'' (۱)

لڑکیوں کا وجود ان کے والدین کے لیے باعث خیر و برکت ہوتا ہے۔ اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ وہ زمانہ گیا جب تعلیم کو صرف لڑکوں کا حق سمجھا جاتا تھا اور لڑکیوں کو اس سے محروم رکھا جاتا تھا۔ یہ خیال کیا جاتا تھا کہ لڑکے بڑے ہوں گے تو کما کر لائیں گے اور لڑکیاں بڑی ہوں گی تو خود ان پر خرچ کرنا پڑے گا۔ اب لڑکیاں تعلیم کے میدان میں آگے بڑھ رہی ہیں تو وہ دنیاوی اعتبار سے اپنے والدین کے لیے بسا اوقات لڑکوں کے مقابلے میں زیادہ فائدہ مند ثابت ہو رہی ہیں اور جہاں تک آخرت کا معاملہ ہے، لڑکیوں کی پرورش و پرداخت پر ان کے والدین کو جنت کی بشارت دی گئی ہے، جب کہ لڑکوں کی پرورش پر ایسی کوئی بشارت نہیں ہے۔ حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

مَنْ عَالَ جَارِيَتَيْنِ حَتّٰى تَبْلُغَا جَاءَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ اَنَا وَ هُوَ (وَ ضَمَّ اَصَابِعَهٗ) (۲)

''جس شخص نے دو لڑکیوں کی ان کے بالغ ہونے تک کفالت کی وہ روزِ قیامت مجھ سے اتنا قریب ہوگا (یہ فرماتے ہوئے آپؐ نے اپنی دو انگلیاں ملائیں)''

اور حضرت ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا:

مَا مِنْ رَجُلٍ تُدْرِكُ لَهٗ ابْنَتَانِ فَيُحْسِنُ اِلَيْهِمَا مَا صَحِبَتَاهُ اَوْ صَحِبَهُمَا اِلَّا اَدْخَلَتَاهُ الْجَنَّةَ (۳)

---

(۱) تفسیر الراغب الاصفہانی، کلیۃ الآداب طنطا، ۱۹۹۹ء، ۱/ ۴۵۸

(۲) صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ والآداب، باب فضل الاحسان الی البنات: ۲۶۳۱

(۳) سنن ابن ماجہ، کتاب الادب، باب برّ الوالد والاحسان الی البنات، ۳۶۷۰

’’جس شخص کی دو لڑکیاں ہوں اور وہ جب تک اس کے پاس رہیں وہ ان کے ساتھ اچھا سلوک کرتا رہے تو وہ اس کے جنت میں داخلہ کا ذریعہ بنیں گی۔‘‘

جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے صرف لڑکیوں سے نوازا ہو اور وہ لڑکوں کے بھی خواہش مند ہوں انھیں اپنی بیویوں کو قصور وار ٹھہرانے کے بجائے اللہ تعالیٰ سے دعا کرنی چاہیے کہ وہی حقیقی عطا کرنے والا ہے۔ وہ جس کو چاہتا ہے صرف لڑکے دیتا ہے، جس کو چاہتا ہے صرف لڑکیاں دیتا ہے، جس کو چاہتا ہے لڑکے اور لڑکیاں دونوں دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے اولاد سے محروم رکھتا ہے۔

کیا تعلیم جاری رکھنے کے مقصد سے اسقاط کروایا جاسکتا ہے؟

سوال: ایک خاتون کا تعلیمی سلسلہ جاری تھا کہ اس کا نکاح ہوگیا۔ شوہر سعودی عرب میں ملازمت کرتے ہیں۔ بیوی کی خواہش پر انھوں نے اسے تعلیم جاری رکھنے کی اجازت دے دی ہے۔ کورس پورا ہونے میں ابھی ڈیڑھ سال باقی ہے۔ اس عرصے میں ہر چھ ماہ میں ایک بار امتحان کی غرض سے آنا ہوگا۔ ایک ماہ ہونے کو ہے، بیوی کو معلوم ہوا کہ وہ حمل سے ہے۔ وہ دورانِ تعلیم حمل و وضع حمل کے بکھیڑوں سے آزاد رہنا چاہتی ہے، اس لیے بچے کی پیدائش اور پرورش کو ڈیڑھ سال کے لیے مؤخر کرنا چاہتی ہے۔ ایسی صورت میں کیا موجودہ حمل کا اسقاط کروایا جاسکتا ہے؟

جواب: اللہ تعالیٰ نے تخلیقِ انسانی کا ایک فطری طریقہ مقرر کیا ہے۔ مرد اور عورت رشتۂ ازدواج میں بندھتے ہیں، ان کے درمیان جنسی تعلق قائم ہوتا ہے، اس کے نتیجے میں وہ اولاد کی نعمت سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔ اولاد دنیوی زندگی کی زینت ہے۔ اس سے خاندان کی رونق قایم رہتی ہے۔ مزید یہ کہ اس کے ذریعے نسل انسانی کا تسلسل جاری رہتا ہے۔ اس لیے عام حالات میں شریعت نے اس فطری طریقے کے کسی بھی مرحلے میں رکاوٹ ڈالنے کی اجازت نہیں دی ہے۔ نکاح انبیاء اور خاص طور پر خاتم النبیین ﷺ کی سنت ہے۔ محرکات ہونے کے باوجود اس سے باز رہنا پسندیدہ نہیں، اسی طرح نکاح ہوجانے کے بعد اولاد کی پیدائش میں کوئی رکاوٹ ڈالنا بھی جائز نہیں۔ عہد جاہلیت میں لوگ اس کی بڑی بھونڈی تدبیر اختیار کرتے تھے کہ پیدائش کے بعد وہ

ناپسندیدہ بچوں کو قتل کردیتے تھے۔ اسلام نے ایسا کرنے سے سختی سے روکا اور اس کی شدید مذمت کی۔ اب سائنسی ایجادات کے نتیجے میں پیدائش سے قبل ہی ناپسندیدہ بچوں کو مختلف تدابیر سے ہلاک کردیا جاتا ہے۔ یہ عمل فطرت سے بغاوت ہے، اس لیے شریعت کی نظر میں وہ بھی ناجائز ہے۔

دوسری طرف اسلامی شریعت میں احکام پر عمل آوری کے سلسلے میں 'عذر' کا اعتبار کیا گیا ہے۔ جو شخص جس درجے میں معذور ہے اسی درجے میں اس سے احکام ساقط ہوجاتے ہیں۔ کوئی مرد یا عورت کسی وجہ سے حقوقِ زوجیت ادا کرنے پر قادر نہ ہو تو وہ حکم نکاح کی مخاطب نہیں ہے۔ عورت کسی ایسے مرض میں مبتلا ہو کہ وہ حمل کو ولادت کے مرحلے تک پہنچانے کی متحمل نہ ہو یا اس سے اس کے مرض میں اضافے کا ظن غالب ہو تو استقرار حمل کے بعد بھی شریعت نے اسے اسقاط کروانے کی اجازت دی ہے۔ عورت ایڈز کا شکار ہو اور یہ یقینی ہو کہ حمل کو جاری رکھنے کی صورت میں بچہ بھی ایڈز زدہ پیدا ہوگا، ایسی صورت میں حمل کو ساقط کروایا جاسکتا ہے۔ تشخیصی آلات کے ذریعے معلوم ہوگیا ہو کہ رحم مادر میں پرورش پانے والا جنین ناقص الخلقت ہے، پیدائش کے بعد وہ طبعی زندگی نہیں گزار سکے گا، تو اس کا اسقاط کروانے کی اجازت دی گئی ہے۔ اس طرح کی اور بھی دیگر صورتیں سوچی جاسکتی ہیں۔ خلاصہ یہ کہ کوئی بھی صورت، جس میں عورت یا جنین کی زندگی کو ضرر پہنچنے کا ظن غالب ہو، اس میں اسقاط کروایا جاسکتا ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا تعلیمی سلسلہ جاری رکھنے کی خواہش اسی طرح کا کوئی عذر ہے جس کی بنا پر اسقاط جائز ہوجائے؟ اس سوال کا جواب دینے سے قبل چند نکات پر غور کرلینا چاہیے:

۱- اللہ تعالیٰ کی نوازش کے الگ الگ پیمانے ہیں۔ وہ کسی کو صرف لڑکے دیتا ہے، کسی کو صرف لڑکیاں، کسی کو دونوں اور کسی کو کسی مصلحت سے اولاد سے محروم رکھتا ہے (الشوریٰ: ۴۹، ۵۰) کسی کو بہت سی اولادوں سے نوازتا ہے، کسی کو دو اور کسی کو صرف ایک لڑکی یا لڑکا عطا کرتا ہے۔ کیا خبر کہ اس نے کسی عورت کی تقدیر میں صرف ایک مرتبہ استقرارِ حمل لکھا ہو اور وہ اس کا اسقاط کرواکے خود کو ہمیشہ کے لیے اولاد کی نعمت سے محروم کرلے۔

۲- فطری نظام میں چھیڑ چھاڑ بسا اوقات ضرر رساں ہوتی ہے۔ حمل چاہے ابتدائی ایام کا

ہو یا آخری ایام کا اور اسقاط چاہے دواؤں کے ذریعے کروایا جائے یا صفائی کے آلات (D&C) کے ذریعے، کسی نہ کسی درجے میں اس کا امکان موجود رہتا ہے کہ اس چھیڑ چھاڑ کے نتیجے میں رحم میں آئندہ استقرارِ حمل نہ ہو پائے۔ پھر کیا یہ عمل معقولیت پر مبنی ہوگا کہ کوئی عورت استقرار شدہ حمل کا اسقاط کروا کے خود کو اس خطرے میں ڈال لے۔

۳- مناسب ہے کہ تعلیمی سلسلے کو وضع حمل تک کے لیے موقوف کر دیا جائے۔ تعلیم جاری رکھنے کی خواہش چاہے محض علمی صلاحیت میں اضافے کے لیے ہو یا اس کے بعد ملازمت کرنے کا ارادہ ہو، دونوں صورتوں میں ایک ڈیڑھ سال کا وقفہ اتنا زیادہ نہیں ہے کہ اسے انگیز نہ کیا جاسکے۔ یونی ورسٹیوں میں ایسی سہولیات موجود ہوتی ہے کہ کوئی کورس کرتے ہوئے کسی عذر کی بنا پر درمیان میں وقفہ کیا جاسکتا ہے۔ اس سہولت سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔

جو شخص بھی ان نکات کو اپنے پیش نظر رکھے گا اس کا جواب یہی ہوگا کہ تعلیمی سلسلہ جاری رکھنے کی خواہش کوئی شرعی عذر نہیں ہے۔ اس بنا پر اس کے لیے استقرار شدہ حمل کا اسقاط کروانا جائز نہیں ہے۔

جنسی خواہش کی تکمیل کا جائز طریقہ

سوال: مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نئی دہلی سے 'اسلامی خاندان' کے نام سے ایک مجموعۂ مقالات شائع کیا گیا ہے۔ اس کے ص ۵۲ پر یہ حدیث درج ہے:

> ''حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے، فرماتے ہیں کہ ایک بار رسول اللہ ﷺ نے ایک عورت کو دیکھا جو آپ کو اچھی لگی۔ آپؐ اسی وقت زوجۂ مطہرہ حضرت سودہؓ کے پاس تشریف لائے۔ وہ اس وقت خوشبو تیار کر رہی تھیں اور ان کے پاس دوسری خواتین بیٹھی ہوئی تھیں۔ آپؐ نے تنہائی حاصل کی اور اپنی ضرورت پوری کی، پھر فرمایا: جو شخص کسی عورت کو دیکھے اور وہ اس کو بھلی لگے، اسے چاہیے کہ اپنی بیوی کے پاس جائے، کیوں کہ اس کے پاس وہی ہے جو اس کے پاس ہے۔''

اس حدیث کو پڑھ کر میں سخت پریشانی اور الجھن میں پڑ گیا ہوں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ نے غیر محرم عورت پر نگاہ ڈالی اور اتنی دیر تک ڈالی کہ وہ ان کو اچھی لگی۔ کیا واقعی پیغمبر غیر محرم عورت پر نگاہ جماتے تھے؟ کیا واقعی پیغمبر کی شان یہ ہے کہ وہ غیر محرم عورتوں کو دیکھے اور دوسروں کو بھی دیکھنے کی ترغیب دے اور کہے کہ اگر کوئی عورت تم دیکھو اور وہ بھلی لگے تو فوراً اپنی بیوی کے پاس جاؤ۔ اگر کوئی مرد کنوارا یا بغیر بیوی کے (رنڈوا) ہو تو وہ کہاں جائے؟ اس حدیث سے یہ مطلب بھی نکالا جا سکتا ہے کہ اس وقت عورتیں بے پردہ رہتی تھیں یا ہو سکتا ہے کہ یہ احکامِ پردہ سے پہلے کا واقعہ ہو۔

میری اس الجھن کو رفع فرمائیں۔ عنایت ہوگی۔

جواب: جو حدیث اوپر بیان کی گئی ہے، اس کا حوالہ 'اسلامی خاندان' میں مشکوٰۃ المصابیح کا دیا گیا ہے۔ مشکوٰۃ میں اسے سنن دارمی کے حوالے سے نقل کیا گیا ہے[1] دارمی کے علاوہ یہ بیہقی کی شعب الایمان میں بھی مروی ہے۔ اسی مضمون کی ایک حدیث حضرت جابرؓ سے مروی ہے۔ البتہ اس میں ام المومنین حضرت زینبؓ کا نام آیا ہے۔ اس کی تخریج مسلم، ابوداؤد، بیہقی اور احمد نے کی ہے[2] اس سے ملتا جلتا مضمون ایک اور حدیث میں آیا ہے، جو حضرت ابو کبشہ الانماریؓ سے مروی ہے اور اس کی روایت احمد اور طبرانی نے (الاوسط میں) کی ہے اور ہیثمی نے مجمع الزوائد میں بھی اسے نقل کیا ہے۔ علامہ محمد ناصر الدین البانیؒ نے اس حدیث کو سلسلۃ الاحادیث الصحیحۃ میں جگہ دی ہے اور اس کے تمام طرق نقل کر کے ان پر بحث کی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ حدیث سند کے اعتبار سے صحیح ہے۔

درایت کے اعتبار سے بھی اس حدیث میں کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ اس پر کوئی اشکال یا شبہ وارد ہو، بلکہ اس سے چند اہم نکات کا استنباط ہوتا ہے۔

۱- اس حدیث سے رسول اللہ ﷺ کی بشریت نمایاں ہوتی ہے۔ آپؐ نے دوسرے انسانوں کی طرح شادی شدہ زندگی گزاری۔ آپؐ دوسرے انسانوں کی طرح بازاروں میں چلتے پھرتے، کھاتے پیتے اور دیگر انسانی ضروریات پوری کرتے تھے،

---

(۱) سنن الدارمی، کتاب النکاح، باب الرجل یری المرأۃ فیخاف علی نفسہ، ۲۲۱۵

(۲) مسلم، کتاب النکاح، باب ندب من رأی امرأۃ، ۱۴۰۳، ابوداؤد: ۲۱۵۱

دوسرے انسانوں کی طرح آپؐ پر بشری جذبات طاری ہوتے تھے اور آپ جواز کی حدود میں رہتے ہوئے ان کی تکمیل فرمایا کرتے تھے۔

۲- کسی غیر محرم عورت پر کسی مرد کی نظر پڑ جائے تو شریعت کی تعلیم یہ ہے کہ وہ فوراً اپنی نظریں پھیر لے۔ ایک موقع پر اللہ کے رسول ﷺ نے حضرت علیؓ کو مخاطب کر کے فرمایا:

يَا عَلِيّ! لاَ تُتبِعِ النَّظْرَةَ النَّظْرَةَ فَاِنَّ لَكَ الْاُوْلٰى وَلَيْسَتْ لَكَ الْآخِرَةَ(۱)

''اے علی! (کسی غیر محرم عورت پر) ایک بار نظر پڑ جائے تو دوبارہ نہ دیکھو۔ اس لیے کہ پہلی نظر تو معاف ہے، لیکن دوسری مرتبہ دیکھنے کا تمھیں حق نہیں۔''

حضرت جریر بن عبد اللہؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ اگر کسی غیر محرم عورت پر اچانک نگاہ پڑ جائے تو کیا کروں؟ آپؐ نے فرمایا: ''اپنی نگاہ پھیر لو۔''(۲)

زیرِ بحث حدیث سے بھی اتنی ہی بات معلوم ہوتی ہے۔ جس بات کا حدیث سے اظہار نہ ہوتا ہے اسے ہم اپنی طرف سے فرض کرلیں، پھر اس پر اعتراض جڑ دیں، یہ کوئی درست اور معقول رویہ نہیں ہے۔ نعوذ باللہ اس حدیث میں کہاں یہ بات آئی ہے کہ آں حضرت ﷺ نے کسی غیر محرم عورت پر دیر تک نظر ڈالی یا یہ کہ آپ غیر محرم عورتوں پر نگاہ جماتے تھے۔ کوئی چیز دل کو بھلی لگ جائے اس کے لیے اسے بار بار دیکھنا، ٹکٹکی باندھ کر دیکھنا یا گھورنا ضروری نہیں ہے، یہ ایک بار دیکھنے سے بھی ہوسکتا ہے۔

۳- اس حدیث میں غیر محرم عورتوں کو دیکھنے کی ترغیب نہیں دی گئی ہے، بلکہ اگر کبھی کسی غیر محرم عورت پر نگاہ پڑ جائے اور اس کے نتیجے میں دل میں نفسانی خواہش پیدا ہو تو اس کا علاج بتایا گیا ہے۔

جنس (Sex) کے تعلق سے اسلام کا نقطۂ نظر اعتدال اور توازن پر مبنی ہے۔ وہ نہ تو جنسی خواہش کو کچلنے کی ترغیب دیتا ہے اور نہ اسے بے مہار چھوڑ دیتا ہے کہ بغیر حدود و قیود کے جس طرح

---

(۱) ترمذی، کتاب الادب، باب ماجاء فی نظر المفاجأة ۲۷۷۷

(۲) مسلم، کتاب الآداب، باب نظر الفجاءة ۲۱۵۹

بھی کوئی شخص چاہے، اس کی تکمیل کرلے۔ بلکہ اسلام جنسی خواہش کی تکمیل کا جائز طریقہ اختیار کرنے کی ترغیب دیتا ہے اور اس کے لیے ہر ممکن سہولیات فراہم کرتا ہے۔ حضرت ابوکبشہؓ سے مروی حدیث کے آخر میں ہے کہ آں حضرت ﷺ نے صحابہ کرام کو مخاطب کرکے فرمایا:

فَاِنَّهُ مِنْ اَمَاثِلِ اَعْمَالِكُمْ اِتْيَانُ الْحَلَالِ(۱)

''تمھارے بہترین اعمال میں سے یہ ہے کہ تم (جنسی خواہش پوری کرنے کا) جائز طریقہ اختیار کرو۔''

۴۔ کوئی شخص کنوارا یا بغیر بیوی کے (رنڈوا) ہو تو اسے چاہیے کہ وہ اپنی جنسی خواہش پوری کرنے کے لیے نکاح کرے۔ اسلام نہیں چاہتا کہ کوئی بالغ مرد بغیر بیوی کے اور کوئی بالغ عورت بغیر شوہر کے رہے۔ وہ سرپرستوں کو حکم دیتا ہے کہ اپنے ماتحتوں کے نکاح کا جلد از جلد انتظام کریں۔ اس کے باوجود جو لوگ سماج میں غیر شادی شدہ ہوں اور کسی وجہ سے ان کا نکاح نہ ہو پایا ہو انھیں اسلام اپنے جنسی جذبات پر قابو رکھنے کی مختلف تدابیر بتاتا ہے۔ مثلاً ایک حدیث میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

مَنِ اسْتَطَاعَ مِنْكُمُ الْبَاءَةَ فَلْيَتَزَوَّجْ فَاِنَّهُ اَغَضُّ لِلْبَصَرِ وَ اَحْصَنُ لِلْفَرْجِ وَ مَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَعَلَيْهِ بِالصَّوْمِ فَاِنَّهُ لَهُ وِجَاءٌ(۲)

''تم میں سے جو شخص نکاح کی استطاعت رکھتا ہو اسے نکاح کرلینا چاہیے، اس لیے کہ یہ نگاہ کی پاکیزگی اور شرم گاہ کی حفاظت کا بہترین طریقہ ہے۔ اور جو شخص اس پر قادر نہ ہو وہ روزہ رکھے۔ اس سے اس کی جنسی خواہش کنٹرول میں رہے گی۔''

۵۔ عہد نبوی کے متعدد واقعات اور احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں بعض خواتین اپنے چہرے ڈھکے رکھتی تھیں اور بعض اپنے چہرے کھلے رکھتی تھیں۔ اس لیے زیر بحث حدیث کو احکام پردہ کے نزول سے پہلے کا ماننا ضروری نہیں۔

ٹیسٹ ٹیوب تکنیک کے ذریعے استقرار حمل

سوال: ایک صاحب کی شادی کو تین سال ہوچکے ہیں، لیکن اب تک وہ بچے سے محروم ہیں۔ میاں بیوی دونوں نے اپنا ٹیسٹ کروایا ہے، دونوں میں کوئی خرابی نہیں ہے۔ پھر بھی

---

(۱) احمد: ۱۸۰۵۷

(۲) بخاری، کتاب الصوم، باب الصوم لمن خاف علی نفسه العزوبة ۱۹۰۵، مسلم: ۳۴۶۴

استقرارِ حمل نہیں ہوسکا ہے۔ اب کسی نے انھیں مشورہ دیا ہے کہ وہ بچہ حاصل کرنے کے لیے ٹیسٹ ٹیوب بے بی کی تکنیک اختیار کریں۔ بہ راہ کرم آگاہ فرمائیں۔ کیا ٹیسٹ ٹیوب بے بی کی تکنیک اختیار کرنا شرعی اعتبار سے جائز ہے؟

جواب: تخلیقِ انسانی کا عمل کس طرح انجام پاتا ہے اس کی طرف قرآن کریم کی ایک آیت میں یوں اشارہ کیا گیا ہے:

اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ ۖ (الدہر:۲)

''ہم نے انسان کو ایک مخلوط نطفے سے پیدا کیا ہے۔''

یہ مخلوط نطفہ مرد کے مادۂ منویہ (Sperm) اور عورت کے بیضہ (Ovum) کے اتصال سے ترکیب پاتا ہے۔ دونوں کا اتصال رحم (Uterus) کے بالائی دونوں سروں پر پائے جانے والے ٹیوب (جسے قاذفین (Fallopian tubes) کہتے ہیں) میں ہوتا ہے، جس کے نتیجے میں عمل بارآوری (Fertilization) انجام پاتا ہے۔ پھر یہ بارآور بیضہ مختلف مراحل سے گزر کر رحم میں داخل ہوتا ہے، جہاں جنین کی شکل میں اس کی نشو ونما ہوتی ہے۔

بسا اوقات جنسی اعضاء میں سے کسی عضو میں کوئی نقص ہوتا ہے جس کی بنا پر مرد کے مادۂ منویہ اور عورت کے بیضہ کا اتصال و امتزاج نہیں ہو پاتا، مثلاً مرد کے مادۂ منویہ کو خصیوں سے عضو تناسل تک لانے والی رگیں مسدود ہوگئی ہوں یا عورت کے خصیۃ الرحم سے کسی سبب سے بیضہ کا اخراج نہ ہو پا رہا ہو، یا قاذفین پیدائشی طور پر موجود نہ ہوں یا کسی مرض کے سبب مسدود ہوگئے ہوں۔ اس صورت میں مرد کا مادۂ منویہ اور عورت کا بیضہ حاصل کرکے دونوں کو ایک ٹیسٹ ٹیوب میں بارآور کیا جاتا ہے، پھر ایک متعین مدت کے بعد اس مخلوط نطفہ کو عورت کے رحم میں منتقل کردیا جاتا ہے۔ اگر فطری طریقے سے استقرارِ حمل نہ ہو پا رہا ہو تو ٹیسٹ ٹیوب بے بی کی تکنیک اختیار کی جاسکتی ہے، بشرطے کہ صرف شوہر کے نطفہ اور بیوی کے بیضہ کے اختلاط و امتزاج سے بارآوری کا عمل انجام دیا جائے۔

جدید میڈیکل سائنس نے اس تکنیک کو بہت ترقی دی ہے۔ مثلاً اگر شوہر کا مادۂ منویہ ناکارہ ہو تو کسی دوسرے کا مادۂ منویہ حاصل کرلیا جاتا ہے، اس کے لیے 'اسپرم بینک' قائم ہوگئے ہیں۔ اگر بیوی کے خصیۃ الرحم سے بیضہ خارج نہ ہو رہا ہو تو دوسری عورت سے بیضہ حاصل کیا جاتا ہے۔ اگر بیوی کے رحم میں کسی خرابی کی بنا پر اس میں استقرارِ حمل اور جنین کی پرورش ممکن نہ ہو تو

کسی دوسری عورت کا رحم اس کام کے لیے کرایہ پر لے لیا جاتا ہے۔اس چیز نے عالمی سطح پر ایک منافع بخش انڈسٹری کی شکل اختیار کر لی ہے۔ اسلامی شریعت کی رو سے یہ تمام صورتیں ناجائز ہیں۔ اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے:

لَا يَحِلُّ لِامْرِئٍ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ اَنْ يَّسْقِيَ مَاءَهُ زَرْعَ غَيْرِهٖ (۱)

''کسی شخص کے لیے جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتا ہو، جائز نہیں کہ اپنے پانی (مادۂ تولید) سے کسی دوسرے کے کھیت (یعنی غیر عورت) کو سیراب کرے۔''

خلاصہ یہ کہ ٹیسٹ ٹیوب کے ذریعے عمل بار آوری کی صرف وہ صورت جائز ہے جس میں شوہر کے نطفہ اور بیوی کے بیضہ کو استعمال کیا گیا ہو۔

اگر شوہر جنسی تعلق پر قادر نہ ہو

سوال: ایک لڑکی کی شادی کو دو سال ہو گئے ہیں۔ اس کے والد کا انتقال ہو چکا ہے۔ والدہ زندہ ہیں۔ اس عرصے میں حمل کے آثار ظاہر نہ ہوئے تو لڑکی کی ماں کے بہ اصرار پوچھنے پر لڑکی نے بتایا کہ اس کا شوہر جنسی تعلق پر قادر نہیں ہے۔ اس عرصے میں لڑکے نے کافی علاج کرایا، لیکن کچھ فائدہ نہیں ہوا۔ لڑکی اب بھی شوہر کے ساتھ رہنے کو تیار ہے، لیکن اس کی ماں خلع کروانا چاہتی ہے۔

اس مسئلے میں بہ راہ کرم رہ نمائی فرمائیں۔ اگر کوئی مرد جنسی تعلق کے قابل نہ ہو تو کیا زوجین کے درمیان جدائی کروادی جائے گی؟ اگر اس صورت میں بھی دونوں میاں بیوی ساتھ زندگی گزارنا چاہتے ہوں تو کیا اس کی گنجائش ہے؟ شریعت میں اس مسئلے کے بارے میں کیا احکام ہیں؟ براہ کرم جواب مرحمت فرمائیں، تاکہ دونوں خاندانوں میں تنازع نہ ہو اور خیر کا پہلو نکل آئے۔

جواب: (۱) شادی کے بعد انکشاف ہو کہ شوہر نامرد ہے اور ہم بستری پر قادر نہیں ہے، تو علیحدگی کا معاملہ اٹھانے سے قبل اسے علاج کا موقع دیا جانا چاہیے۔ فقہا نے اس کے لیے ایک سال کی مدت متعین کی ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ یہ کوئی حتمی اور قطعی مدت نہیں ہے۔ اس کا فیصلہ کسی ماہر ڈاکٹر کی رائے پر ہونا چاہیے۔ اگر وہ تمام متعلقہ ٹیسٹ کرنے کے بعد ایک دو ماہ میں ہی یہ رائے دے دے کہ مرض پیدائشی ہے اور شوہر کبھی ہم بستری کے قابل نہیں ہو سکتا تو ایک سال تک انتظار

(۱) ابو داؤد، کتاب النکاح، باب فی وطی السبایا ۲۱۵۸

کرنے کی ضرورت نہیں ہے اور اگر علاج میں ایک سال سے زائد مدت درکار ہو تو اس کا موقع دیا جانا چاہیے۔ ہم بستری پر قادر نہ ہو سکنا بسا اوقات نفسیاتی اسباب سے ہوتا ہے اور کبھی اس کا سبب کوئی جسمانی مرض ہوتا ہے۔ نفسیاتی اسباب ہوں تو مناسب کونسلنگ (Counselling) ہونی چاہیے اور کوئی مرض ہو تو اس کا علاج ہونا چاہیے۔

(۲) علاج سے کوئی فائدہ نہ ہو، شوہر ہم بستری کے قابل نہ ہو سکے اور بیوی اس سے علیٰحدگی چاہے تو انصاف کا تقاضا ہے کہ علیٰحدگی کروا دینی چاہیے۔ ایسی صورت میں فقہاء نے لکھا ہے کہ عورت پورے مہر کی حق دار ہوگی اور اسے عدت بھی گزارنی ہوگی۔ بہتر ہے کہ شوہر خود ہی طلاق دے دے۔ اگر وہ طلاق دینے پر آمادہ نہ ہو تو اس پر دباؤ ڈالنے کی دوسری تدابیر اختیار کی جائیں۔ خلع کی بات بھی کی جا سکتی ہے۔

(۳) اگر بیوی اپنے شوہر کی نامردی کے باوجود اس کے ساتھ رہنے پر رضامند ہے تو اس کی رضامندی کا خیال رکھا جانا چاہیے۔ البتہ اس چیز کو ضرور دیکھنا چاہیے کہ اس کی رضامندی کسی دباؤ کا نتیجہ تو نہیں ہے۔

نکاح کا مقصد مرد اور عورت دونوں کی عفت و عصمت کی حفاظت اور توالد و تناسل ہے۔ شوہر کی نامردی سے یہ دونوں مقاصد فوت ہوتے نظر آتے ہیں۔ اولاد کی خواہش ہر جوڑے کو ہوتی ہے۔ اسی طرح ہر جوان مرد اور عورت میں جنسی خواہش بھی فطری ہے۔ اگر کوئی دوشیزہ اپنی ان دونوں خواہشوں کو قابو میں رکھنے پر قادر ہو اور وہ اپنے شوہر کے ساتھ رہنے پر مصر ہو تو اس کی بات مان لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اس سلسلے میں شوہر اور بیوی دونوں کے خاندان والوں کو مل کر معاملے کے تمام پہلوؤں کو سامنے رکھ کر، کسی نتیجے تک پہنچنا چاہیے۔

طلاق واقع ہونے کے لیے عورت کا سننا ضروری نہیں

سوال: زوجین میں اختلاف اور تنازع ہونے کے بعد بیوی شوہر سے لڑ جھگڑ کر اپنے میکے چلی گئی۔ اس واقعے کو ڈیڑھ سال ہو گئے۔ اس عرصے میں اس نے کوئی ربط وضبط رکھا نہ شوہر کے گھر آئی۔ کچھ عرصہ پہلے چھ مقامی حضرات نے درمیان میں پڑ کر صلح صفائی کروانی چاہی۔ وہ شوہر کے گھر اکٹھا ہوئے اور وہاں اس کی موجودگی میں موبائل سے اس کی بیوی سے رابطہ کیا گیا، اس کو کافی سمجھایا بجھایا گیا، مگر وہ آنے کے لیے تیار نہ ہوئی اور طلاق کا مطالبہ کرنے لگی۔ بالآخر اسی

مجلس میں شوہر نے اس کو طلاق دے دی۔ اس وقت موبائل آن تھا۔ طلاق کے الفاظ سن کر بیوی نے 'بہت اچھا' کہا، جسے وہاں موجود تمام لوگوں نے سنا۔ وہیں طے پایا کہ دورانِ عدت لڑکی کو ہر ماہ تین ہزار روپے بھیجے جائیں۔ چنانچہ لڑکی کے کپڑے وغیرہ ایک اٹیچی میں رکھ کر اور عدت کے ایک ماہ کا خرچ تین ہزار روپے بھیج دیے گئے، جسے لڑکی والوں نے قبول کرلیا۔ دوسرے ماہ بھی تین ہزار روپے بھیجے گئے، جو قبول کر لیے گئے۔ اب ڈھائی ماہ بعد لڑکی کہہ رہی ہے کہ اس نے طلاق سنی ہی نہیں۔

براہ کرم قرآن وحدیث کی روشنی میں مطلع فرمائیں کہ کیا اس صورت میں طلاق واقع ہوئی یا نہیں؟

جواب: جہاں تک مذکورہ مسئلے کا تعلق ہے، تو اس سلسلے میں عرض ہے کہ طلاق ہونے کے لیے عورت کا سننا ضروری نہیں ہے۔ اس کی غیر حاضری میں شوہر طلاق دے دے تو طلاق ہو جائے گی اب جبکہ شوہر نے چھے لوگوں کی موجودگی میں طلاق دی ہے تو اس کے واقع ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ شریعت نے طلاق کا اختیار شوہر کو دیا ہے۔ اگر اس نے اس اختیار کو استعمال کیا ہے تو اس کا انعقاد ہو جائے گا۔ قرآن و حدیث میں کہیں صراحت ہے نہ اشارہ کہ طلاق بیوی کی موجودگی میں یا اس کو سنا کر دینی ضروری ہے۔ دوسری بات یہ کہ ایک طلاق ہونے کی صورت میں دورانِ عدت (تین حیض کی مدت) شوہر کو رجوع کرنے کا حق رہتا ہے۔ وہ زبان سے کہہ دے یا عمل سے ظاہر کر دے کہ اس نے رجوع کرلیا ہے تو نکاح باقی رہے گا اور عورت اس کی بیوی رہے گی۔ اگر عدت گزر گئی تو نئے مہر کے ساتھ دوبارہ نکاح کر کے دونوں میاں بیوی کی حیثیت سے رہ سکتے ہیں۔

پوجا پاٹ میں استعمال ہونے والی چیزوں کی تجارت

سوال: میری ایک دوکان ہے، جس میں اسٹیل، تانبہ اور سلور کے برتن اور گھریلو استعمال کی چیزیں فروخت کی جاتی ہیں۔ کیا ہم اس میں وہ چیزیں اور برتن، جو خاص کر ہندوؤں اور مشرکوں کے یہاں پوجا پاٹ میں استعمال ہوتے ہیں، مثلاً چراغ اور مندروں اور گھروں میں استعمال ہونے والے گھنٹے وغیرہ، انھیں فروخت کر سکتے ہیں؟

جواب: وہ چیزیں جو صرف پوجا پاٹ اور مشرکانہ مراسم کی ادائی میں استعمال کی جاتی ہیں ان کی تجارت کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں ہے، اس لیے کہ یہ ایک اعتبار سے شرک و بت پرستی میں تعاون ہے۔ البتہ وہ چیزیں، جنھیں غیر مسلم پوجا پاٹ کے کاموں میں استعمال کرتے ہیں اور ان کے دیگر عام استعمالات بھی ہیں، انھیں دوکان میں رکھ کر فروخت کیا جاسکتا ہے۔

مشترکہ رہائش اور مشترکہ کاروبار کا مسئلہ

سوال: ہم چھے بھائی اور دو بہنیں ہیں۔ تین بھائیوں اور دو بہنوں کی شادی ہوچکی ہے۔ تین بھائیوں کی ابھی شادی ہونی باقی ہے۔ ایک بھائی نے شادی کے بعد الگ رہنا شروع کردیا تھا۔ باقی ہم پانچ بھائی (دو شادی شدہ اور تین غیر شادی شدہ) ایک ساتھ رہتے ہیں۔ اس پس منظر میں ہمارے سوالات درج ذیل ہیں:

(۱) کیا مشترکہ خاندان کی اسلام میں اجازت ہے؟ اگر ہاں تو گھریلو اخراجات کی تقسیم کس طرح ہو؟ اگر نہیں تو کیا شادی کے بعد فوراً الگ رہنا چاہیے؟ اگر کوئی بھائی گھر سے الگ خانگی طور پر رہتا ہو تو کیا مشترکہ خاندان میں اسے ماہانہ خرچ دینا ہوگا؟

(۲) جو بھائی غیر شادی شدہ یا بے روزگار ہیں ان کا خرچ کس کے ذمے ہیں؟

(۳) ہمارے دو بھائی سلائی کا کارخانہ چلاتے ہیں۔ پہلے وہ الگ الگ کام کرتے تھے۔ بعد میں بڑے بھائی کے کہنے پر چھوٹے بھائی نے اپنی مشینیں بڑے بھائی کے کارخانے میں منتقل کردیں اور دونوں ساتھ میں کام کرنے لگے۔ کسی نے بھی اپنی حیثیت متعین نہیں کی، نہ کام کی تفصیل سمجھی۔ جس طرح مشترک رہتے تھے، اسی طرح مشترک کارخانہ چلنے لگا۔ لیکن اب چھوٹا بھائی خود کو کارخانے میں پارٹنر سمجھتا ہے اور بڑے بھائی اس کے ساتھ کاریگر جیسا معاملہ کرتے ہیں۔ اس مسئلے کو کیسے حل کیا جائے؟

جواب: (۱) کسی شخص کی زندگی میں اس کے لڑکوں کی شادی ہوجائے تو وہ اپنی اپنی فیملی کے ساتھ باپ کے گھر بھی رہ سکتے ہیں اور الگ بھی اپنا گھر بسا سکتے ہیں۔ اسلام میں مشترکہ خاندان کی صرف وہ صورت ناپسندیدہ ہے جس میں کسی جوڑے کا اس کی مرضی سے آزادانہ رہن سہن (Privacy) متاثر ہو۔ لیکن اگر ہر جوڑے کے لیے گھر کا ایک

حصہ خاص کر دیا جائے، جس میں کسی دوسرے کا دخل نہ ہو تو تمام لڑکوں کے لیے اپنی اپنی فیملی کے ساتھ ایک بڑے گھر میں رہنے کی گنجائش ہے۔ اس صورت میں گھریلو اخراجات کی تقسیم باہم افہام و تفہیم سے کر لینی چاہیے۔ تاکہ کسی ایک پر بار نہ ہو اور اسے ناگوارِ خاطر نہ ہو۔ اگر کوئی لڑکا شادی کے بعد الگ رہنے لگے اور مشترکہ خاندان میں شامل نہ ہو تو مشترکہ خاندان کے گھریلو مصارف کے لیے ماہانہ خرچ دینا اس کی ذمے داری نہیں ہے۔

(۲) نابالغ اولاد کی کفالت کی ذمے داری یوں تو باپ پر ہے، لیکن جو لڑکے کمانے لگے ہوں ان کا فرض بنتا ہے کہ باپ کا ہر ممکن تعاون کریں اور اگر اس کی آمدنی کم ہو اور زیر کفالت افراد کی کفالت میں اسے دشواری ہو رہی ہو تو اسے سہارا دیں۔ اسی طرح اگر باپ کا انتقال ہو گیا ہو تو شادی شدہ اور روزگار سے لگے بڑے بھائیوں کا اخلاقی فرض ہے کہ اپنے چھوٹے اور بے روزگار بھائیوں سے منھ نہ موڑلیں اور انھیں ان کے پیروں پر کھڑا کرنے میں مدد کریں۔

(۳) مشترکہ کاروبار کی صورت میں ضروری ہے کہ ابتدا ہی میں معاملات طے کر لیے گئے ہوں۔ ایسا نہ کرنے کی صورت میں آگے چل کر بڑے نزاعات شروع ہو جاتے ہیں۔ شریعت کی تعلیم تو یہ ہے کہ اگر باپ کے کاروبار میں اولاد شریک ہو رہی ہو تو ان کی حیثیت شروع ہی میں متعین کر دی جائے کہ وہ کاروبار میں پارٹنر ہیں یا کاریگر یا معاون۔ بھائیوں کے مشترکہ کاروبار میں تو بدرجۂ اولیٰ تمام معاملات صاف ہونے چاہئیں اور ہر فریق کی حیثیت متعین ہونی چاہیے۔ اگر پہلے حیثیتوں کی تعیین اور معاملات کی صفائی نہ ہو پائی ہو تو اب باہم مل بیٹھ کر ہمدردانہ غور کر کے معاملات فیصل کر لینے چاہئیں۔

زندگی میں وراثت کی تقسیم

سوال: کیا ایک شخص اپنی حیات ہی میں اپنی وراثت تقسیم کروا سکتا ہے یا یہ اس کے ورثا ہی کے ذمے ہے؟

جواب: کسی شخص کا انتقال ہوجائے تو اس کی میراث کی تقسیم شریعت کے بنائے ہوئے ضوابط کے مطابق ہونی چاہیے۔ یہ اس کے ورثاء کا کام ہے کہ وہ عدل وانصاف کے مطابق میراث تقسیم کریں اور کسی مستحق کو محروم نہ کریں۔

آدمی اپنی زندگی میں اپنے مال کا مالک ہے۔ وہ اس میں سے جتنا چاہے کسی کو دے سکتا ہے۔ اسے قانوناً اس کی اجازت حاصل ہے۔ وہ ان لوگوں کو بھی دے سکتا ہے، جو اس کے مرنے کے بعد اس کی میراث کے مستحق ہوں گے اور اسی تناسب سے دے سکتا ہے، جس تناسب سے ان کا استحقاق ہوگا۔ لیکن یہ میراث کی تقسیم نہیں کہلائے گی۔ بلکہ اس کی طرف ہبہ ہوگا۔

اگر کسی شخص کے بیٹے بیٹیاں ہوں تو میراث کی تقسیم اس طرح ہوگی کہ ہر بیٹے کو ہر بیٹی کے مقابلے میں دوگنا ملے گا۔ لیکن اگر کوئی شخص اپنی زندگی میں اپنی جائداد وغیرہ اپنے بیٹوں بیٹیوں میں تقسیم کر رہا ہو تو اسے سب کے درمیان برابر برابر تقسیم کرنا چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ نے ایسا ہی کرنے کی ہدایت فرمائی ہے۔ ایک صحابیؓ اللہ کے رسول ﷺ کی خدمت میں اپنے ایک بیٹے کو لے کر حاضر ہوئے اور عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ! آپ گواہ رہیے، میں نے اپنے اس بیٹے کو ایک غلام ہبہ کیا ہے۔ آپؐ نے دریافت فرمایا: کیا تم نے اس طرح اپنے ہر بیٹے کو غلام دیا ہے۔ انھوں نے جواب دیا: نہیں۔ تو آپؐ نے فرمایا: میں ظلم وزیادتی کے معاملے میں گواہ نہیں بنوں گا۔(۱)

مکان وجائیداد کی وصیت اور تقسیم میراث

سوال: میرے تین لڑکے اور تین لڑکیاں ہیں۔ سب کی شادی ہوچکی ہے۔ بڑا لڑکا اور اس کی فیملی میرے ساتھ رہتی ہے۔ باقی دو لڑکے اپنا الگ الگ مکان بنوا کر رہ رہے ہیں۔ میں نے انھیں الگ نہیں کیا ہے، بلکہ وہ اپنی مرضی سے الگ رہ رہے ہیں۔ میں ریٹائرڈ پنشنر ہوں۔ میرے ساتھ میری اہلیہ بھی ہیں۔ بڑا لڑکا ہی ہمارے تمام اخراجات برداشت کرتا ہے۔ میری اہلیہ چار پانچ سال سے بیمار چل رہی ہیں۔ بڑا لڑکا اور اس کی بیوی بچے دیکھ بھال کرتے ہیں اور آئندہ بھی کرتے رہنے کی امید ہے۔ دونوں لڑکے کبھی کبھی صرف دیکھنے آجاتے ہیں، بس۔

میرے دو کشادہ مکان ہیں۔ میں نے مکان کا تہائی حصہ اپنی بڑی بہو کے نام وصیت

(۱) مسلم، كتاب الهبات، باب كراهة تفضيل بعض الاولاد فى الهبة، ۱۶۲۳

رجسٹرڈ کردیا ہے۔ میں اپنے بڑے لڑکے کی مزید مدد کرنا چاہتا ہوں۔ کیا حقِ خدمت کے طور پر میں یہ وصیت کرسکتا ہوں کہ جب سے میرے دوسرے لڑکے الگ ہوئے ہیں اس وقت سے میرے انتقال تک وہ میرے بڑے لڑکے کو بیس ہزار روپیہ سالانہ کے حساب سے دے کر ہی وہ مکان تقسیم کریں اور اپنا حصہ لیں۔

بہ راہ کرم درج بالا مسئلہ میں رہ نمائی فرمائیں۔ عین نوازش ہوگی۔

جواب: مکان، زمین جائیداد اور دیگر مملوکہ چیزوں کی تقسیم و تملیک کے سلسلے میں تین اصطلاحات مستعمل ہیں: ہبہ، وصیت اور وراثت۔ ہبہ یہ ہے کہ آدمی اپنی زندگی میں اپنی کسی چیز کا دوسرے کو بلاعوض مالک بنا دے۔ اور اگر وہ اپنی موت کے بعد ملکیت منتقل کرے، مثلاً کہے کہ میرے مرنے کے بعد میری فلاں جائیداد فلاں شخص کی ہوگی تو یہ وصیت ہے۔ اس تقسیم و تملیک کا اختیار صاحبِ مال کو حاصل رہتا ہے۔ تیسری صورت وراثت کی ہے۔ یعنی کسی شخص کے انتقال کے بعد اس کی جائیداد کس طرح تقسیم ہوگی، یہ اللہ تعالیٰ نے طے کردیا ہے۔

ہبہ میں آدمی کو قانونی لحاظ سے اختیار ہوتا ہے کہ وہ جس کو چاہے اور جس قدر چاہے دے دے۔ اس لیے کہ مال اس کا ہے اور اپنے مال میں تصرف کرنے کا اسے پورا اختیار ہے۔ وہ اس میں سے جتنا چاہے صدقہ و خیرات کرسکتا ہے، یا اپنے کسی ایسے رشتہ دار کو، جو مستحقینِ وراثت میں سے نہ ہو، دے سکتا ہے، یا اپنے کسی وارث کو بھی مالک بنا سکتا ہے۔ یہ قانونی اعتبار سے ہے، ورنہ اخلاق کا تقاضا ہے کہ وہ بلا کسی شدید ضرورت کے کسی مستحق وراثت کو اپنے مال سے محروم کرنے کی کوشش نہ کرے، مثال کے طور پر اگر کوئی شخص اپنا مال، مکان، زمین جائیداد وغیرہ اپنی زندگی میں اپنی اولاد کے درمیان تقسیم کرنا چاہے تو اگرچہ اسے قانونی حق حاصل ہے کہ کسی کو کم دے کسی کو زیادہ، لیکن اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ سب کے درمیان برابر برابر تقسیم کرے۔ ایک حدیث حضرت نعمان بن بشیرؓ سے مروی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ان کے والد انھیں لے کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی: اے اللہ کے رسول، میں نے اپنے اس بیٹے کو فلاں چیز ہبہ کردی ہے۔ آپ گواہ رہیے۔ آپؐ نے دریافت کیا: کیا تم نے یہ چیز اپنے تمام بیٹوں کو دی ہے۔ انھوں نے جواب دیا: نہیں۔ تب آپؐ نے ارشاد فرمایا: میں ظلم پر گواہ نہیں بنتا۔ اللہ سے ڈرو اور اپنی اولاد کے درمیان انصاف سے کام لو۔'' (۱)

---

(۱) بخاری، کتاب الھبۃ، باب الھبۃ للولد۲۵۸۶، ۲۵۸۷، ۲۶۵۰، مسلم: ۱۶۲۳

وصیت کے بارے میں شریعت کا حکم یہ ہے کہ کسی مستحقِ وراثت کے لیے وصیت نہیں کی جاسکتی۔ اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے:

اِنَّ اللّٰہَ قَدْ اَعْطٰی کُلَّ ذِیْ حَقٍّ حَقَّہٗ، فَلاَ وَصِیَّۃَ لِوَارِثٍ(۱)

''اللہ نے ہر مستحق وراثت کا حق بتا دیا ہے، اس لیے کسی وارث کے حق میں وصیت نہ کی جائے۔''

اسی طرح کسی کے حق میں ایک تہائی سے زیادہ کی وصیت نہیں کی جاسکتی(۲)

آپ نے اپنی بڑی بہو کے حق میں اپنے مکان کے ایک تہائی حصے کی وصیت کر دی ہے۔ آپ کا یہ وصیت کرنا صحیح ہے، لیکن اپنے بڑے لڑکے کے حق میں آپ جو وصیت کرنا چاہتے ہیں وہ صحیح نہیں ہے۔

آپ کے بیٹے بہو آپ کی اور اپنی ماں کی جو بھی خدمت کر رہے ہیں، وہ اپنا فرض سمجھتے ہوئے کر رہے ہیں۔ انھیں ایسا کرنا ہی چاہیے۔ قرآن و حدیث میں والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کی بہت تاکید آئی ہے اور ان کے حقوق کی پامالی کو بڑے گناہوں میں شمار کیا گیا ہے۔ اس پر نہ وہ آپ سے حقِ خدمت کے طالب ہوں گے اور نہ آپ کو اس کی فکر کرنی چاہیے۔ لیکن اگر آپ محسوس کرتے ہیں کہ آپ کے بڑے بیٹے کثیر العیال یا تنگ حال ہیں اور باقی دونوں بیٹے فارغ البال ہیں تو آپ اپنی جائیداد میں سے حسبِ ضرورت اپنے بڑے بیٹے کو اپنی زندگی میں ہبہ کر سکتے ہیں۔ اس کا آپ کو قانونی طور پر حق حاصل ہے۔

تقسیم میراث کی اہمیت

سوال: میرے والد صاحب کا انتقال ہوئے تین سال ہو گئے ہیں۔ والدہ الحمد للہ ابھی حیات ہیں۔ ہم پانچ بھائی اور دو بہنیں ہیں۔ سبھی کی شادی ہو چکی ہے۔ ہم سب بھائی مشترکہ خاندان میں رہتے ہیں۔ والد صاحب کے انتقال کے بعد ان کی میراث تقسیم نہیں ہوئی۔

براہ کرم رہ نمائی فرمائیں کہ کیا میراث تقسیم کرنی ضروری ہے؟ نہ تقسیم کرنے پر کیا

---

(۱) ابو داؤد، کتاب الوصایا، باب ماجاء فی الوصیۃ للوارث ۲۸۷۰

(۲) بخاری، کتاب الوصایا، باب الوصیۃ بالثلث ۲۷۴۴، مسلم: ۱۶۲۸

وعیدیں ہیں؟ میراث میں کس کا کتنا حصہ ہوگا؟ ہمارے تین مکانات ہیں۔ کیا ایک یا دو مکانات فروخت کرکے ورثاء میں تقسیم کرسکتے ہیں؟

جواب: (ا) کسی شخص کا انتقال ہوجائے تو اسلامی شریعت کی رو سے اس کی میراث لازماً تقسیم ہونی چاہیے۔ میراث میں وہ تمام چیزیں شامل ہیں جو میت کی ملکیت میں رہی ہوں۔ مثلاً مکان، گھریلو سامان، دکان اور اس کا سامان، زمین و جائداد، کارخانہ اور اس کی مشینیں اور آلات، اکاؤنٹ میں محفوظ رقم اور نقدی وغیرہ۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ ۠ وَ لِلنِّسَآءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ ؕ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا ۝ (النساء:۷)

''مردوں کے لیے اس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور قریبی رشتے داروں نے چھوڑا ہو اور عورتوں کے لیے بھی اس مال میں حصہ ہے، جو ماں باپ اور قریبی رشتے داروں نے چھوڑا ہو، خواہ تھوڑا ہو یا بہت اور یہ حصہ (اللہ کی طرف سے) مقرر ہے۔''

اس آیت میں صاف الفاظ میں کہا گیا ہے کہ میراث چاہے کم ہو یا زیادہ، اس کی تقسیم کا اللہ تعالیٰ کی جانب سے تاکیدی حکم ہے۔ اگر کوئی وارث پورے مال پر قبضہ کرلیتا ہے اور اپنے بھائیوں بہنوں اور دیگر رشتے داروں کو ان کے حق سے محروم رکھتا ہے تو اس کی حیثیت غاصب اور حرام مال کھانے والے کی ہے۔ روز قیامت اس کا وبال اس کے سر پر ہوگا۔

مذکورہ مسئلے میں میت کے یہ ورثاء موجود ہیں: بیوی، پانچ لڑکے اور دو لڑکیاں۔ قرآن مجید میں ہے کہ کسی شخص کا انتقال ہوجائے اور اس کی بیوی موجود ہو تو اولاد ہونے کی صورت میں وہ آٹھویں حصے کی مستحق ہوگی۔'' (النساء: ۱۲) اس سے پہلے کی آیت میں یہ بیان بھی موجود ہے کہ اولاد کے درمیان میراث اس طرح تقسیم ہوگی کہ ایک مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہوگا۔'' (النساء: ۱۱) اس کے مطابق میراث کے پہلے آٹھ حصے کیے جائیں گے۔ آٹھواں حصہ میت کی بیوی کو دینے کے بعد باقی میراث کے بارہ (۱۲) حصے کیے جائیں گے۔ ایک ایک حصہ ہر لڑکی کو دیا جائے گا اور ہر لڑکا دو دو حصوں کا مستحق ہوگا۔

میراث کے مال کو اس کی اصل شکل میں باقی رکھتے ہوئے بھی تقسیم کیا جاسکتا ہے اور اگر کسی وجہ سے اس میں دشواری ہو تو اسے فروخت کر کے موصولہ رقم کو باہم تقسیم کر لینا چاہیے۔

میراث کے چند مسائل

(۱)

سوال: ایک صاحب کا انتقال ہو گیا ہے۔ ان کے وارثوں میں صرف ان کی بیوی، ایک بیٹی اور ماں ہے۔ ان کے علاوہ اور کوئی رشتے دار نہیں ہے۔ ان کا ترکہ کیسے تقسیم ہوگا؟

براہِ کرم مطلع فرمائیے؟

جواب: (۱) میراث کے احکام قرآن کریم کی سورہ النساء آیات: ۱۱، ۱۲، ۱۷۶ میں تفصیل سے مذکور ہیں۔ ان میں درج ذیل جزئیات کا بھی بیان ہے:

(الف) 'کسی شخص کا انتقال ہو جائے تو اگر وہ صاحب اولاد ہو تو بیوی کا حصہ آٹھواں ہوگا اور اگر لاولد ہو تو بیوی کا حصہ ایک چوتھائی ہوگا۔' (النساء: ۱۲)

(ب) 'اگر اولاد میں اس کی صرف ایک لڑکی ہو تو وہ نصف ترکے کی مستحق ہوگی۔' (النساء: ۱۱)

(ج) 'صاحب اولاد ہونے کی صورت میں اس کے والدین میں سے ہر ایک کو ترکے کا چھٹا حصہ ملے گا۔' (النساء: ۱۱)

(۲) جن رشتے داروں کے حصے متعین ہیں انھیں اصحاب الفرائض کہا جاتا ہے۔ دوسرے رشتے دار عصبہ اور ذوی الارحام کہلاتے ہیں۔ ان کی ایک ترتیب بنا دی گئی ہے۔ ترکہ اصحابِ فرائض میں تقسیم کر دیے جانے کے بعد اگر اس میں سے کچھ بچتا ہے تو حسب ترتیب اس میں سے دوسرے رشتے داروں عصبہ و ذوی الارحام کو حصہ ملے گا۔ فقہ کی کتابوں میں اس کی تفصیل دیکھی جاسکتی ہے۔ آپ نے صراحت کی ہے کہ میت کے مذکورہ تین وارثوں کے علاوہ اس کا اور کوئی رشتے دار نہیں ہے۔

(۳) ترکہ اصحاب الفرائض میں تقسیم ہونے کے بعد اگر کچھ حصہ بچ رہے اور اسے لینے والا کوئی رشتے دار (عصبہ وغیرہ) موجود نہ ہو تو اسے دوبارہ اصحاب الفرائض کے درمیان ان کے حصوں کی نسبتوں کے اعتبار سے تقسیم کر دیا جائے گا۔ اسے فقہی اصطلاح میں 'رد' کہا جاتا ہے۔ دوبارہ تقسیم کی صورت میں فقہ حنفی میں بیوی اور شوہر کو حصہ پانے سے محروم رکھا گیا ہے۔ اس لیے کہ ان کے درمیان نسبی رشتہ نہیں ہوتا ہے۔

صورت مسئولہ میں بھی یہی معاملہ ہے۔ بیوی، بیٹی اور ماں کے درمیان ترکے کی تقسیم اس طرح ہوگی:

$$\frac{۱}{۸} + \frac{۱}{۲} + \frac{۱}{۶} = \frac{۳+۱۲+۴}{۲۴} = \frac{۱۹}{۲۴}$$

پھر باقی ماندہ حصہ ($\frac{۵}{۲۴}$) اس طرح تقسیم ہوگا کہ اس میں سے بیوی کو کچھ نہ ملے گا۔

بیٹی اور ماں کے حصوں میں ۱:۳ کی نسبت ہے۔ اسی اعتبار سے یہ باقی ماندہ حصہ بھی ان کے درمیان تقسیم کر دیا جائے گا۔

(۲)

سوال: ایک شخص کا انتقال ہوگیا۔ اس کے رشتے داروں میں صرف اس کی بیوی، باپ اور تین بھائی تھے۔ اس کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ پندرہ دن کے بعد اس کے باپ کا بھی انتقال ہوگیا۔ اس کا ترکہ کیسے تقسیم ہوگا؟

جواب:

۱- میت کی اولاد نہ ہونے کی صورت میں بیوی کا حصہ ایک چوتھائی (۱/۴) ہے۔

۲- میت کی اولاد نہ ہونے کی صورت میں باپ دوسرے درجے کا عصبہ ہے اور بھائی تیسرے درجے کے عصبہ ہیں۔ یعنی باپ کی موجودگی میں بھائیوں کو کچھ نہ ملے گا۔ بیوی کا حصہ نکالنے کے بعد کل ترکہ باپ کا ہوگا۔

۳- اب چوں کہ باپ کا بھی انتقال ہوگیا ہے، اس لیے باپ کا کل ترکہ اس کے بیٹوں (سوال میں مذکور میت کے بھائیوں) میں تقسیم ہو جائے گا۔

(۳)

سوال: میری اہلیہ کا چند دنوں قبل انتقال ہوگیا ہے۔ اس کے بینک اکاؤنٹ میں کچھ رقم ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ شرعی اعتبار سے اس کی تقسیم ہوجائے۔ ہمارا ایک لڑکا اور دو لڑکیاں ہیں۔ لڑکے اور بڑی لڑکی کی شادی ہوچکی ہے۔ چھوٹی لڑکی ابھی زیر تعلیم ہے۔ اہلیہ کے والدین کا انتقال ہوچکا ہے۔ بہ راہ کرم مطلع فرمائیں کہ بینک کی رقم کو کس طرح تقسیم کیا جائے؟

جواب: میراث کے احکام قرآن کریم میں مذکور ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ اَزْوَاجُكُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُنَّ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْنَ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ۭ (النساء:۱۲)

’’اور تمھاری بیویوں نے جو کچھ چھوڑا ہو، اس کا آدھا تمھیں ملے گا، اگر وہ بے اولاد ہوں، ورنہ اولاد ہونے کی صورت میں ترکہ کا ایک چوتھائی تمھارا ہے، جب کہ وصیت جو انھوں نے کی ہو، پوری کردی جائے اور قرض جو انھوں نے چھوڑا ہو ادا کردیا جائے۔‘‘

اور اس سے اوپر کی آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ ۤ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ۚ

(النساء:۱۱)

’’تمھاری اولاد کے بارے میں اللہ تمھیں ہدایت کرتا ہے کہ مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہے۔‘‘

اول الذکر آیت سے معلوم ہوا کہ اگر بیوی کا انتقال ہوجائے اور اس کی اولاد ہو تو شوہر کو ترکے کا ایک چوتھائی ملے گا اور موخر الذکر آیت سے معلوم ہوا کہ اولاد میں اگر لڑکے لڑکیاں دونوں ہوں تو بقیہ ترکہ ان کے درمیان اس طرح تقسیم ہوگا کہ ایک لڑکے کو دو لڑکیوں کے برابر حصہ ملے۔

فرض کیجیے، آپ کی اہلیہ کے اکاؤنٹ میں چار لاکھ روپے ہیں تو اس کا چوتھائی، یعنی

ایک لاکھ روپے آپ کو ملیں گے، بقیہ تین لاکھ میں سے ڈیڑھ لاکھ لڑکے کا اور پچھتر پچھتر ہزار روپے دونوں لڑکیوں کا حصہ ہوگا۔

میراث کی تقسیم کو اللہ تعالیٰ نے فرض قرار دیا ہے۔ (النساء: ۷) عموماً اس حکم پر عمل کرنے میں کوتاہی کی جاتی ہے، یا صحیح تقسیم نہیں کی جاتی۔ قابل مبارک باد ہیں وہ لوگ جو تقسیم میراث کو بھی حکمِ الٰہی سمجھ کر اس کی صحیح تقسیم کرتے ہیں اور حق داروں تک ان کا حق پہنچاتے ہیں۔

(۴)

سوال: ہمارے ماما جان غلام رسول صوفی کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے۔ ان کے اپنی کوئی اولاد نہیں ہے۔ انھوں نے کئی سال پہلے ایک بچی کو گود لیا تھا۔ اس کی پرورش کی اور جوان ہونے پر اس کی شادی اپنے بھانجے الطاف احمد سے کی۔ الطاف احمد کی بیوی طاہرہ کے ہاں دو لڑکے اقبال اور عامر پیدا ہوئے۔ طاہرہ شادی کے چند سال بعد فوت ہوگئی۔ چوں کہ غلام رسول اور ان کی بیوی عمر رسیدہ اور بیمار ہونے کی وجہ سے گھریلو کام کاج کرنے سے قاصر تھے، لہٰذا وہ دونوں میاں بیوی الطاف احمد کے یہاں رہنے لگے۔ تقریباً سات سال تک الطاف احمد کے گھر میں رہنے کے بعد غلام رسول کا انتقال ہوگیا۔ پس ماندگان میں ان کی بیوی سندری بیگم، اکلوتی بہن فاطمہ، جو کہ الطاف احمد کی ماں ہے اور ایک بھائی غلام محی الدین صوفی ہے۔ اس کے علاوہ غلام رسول کے دو مرحوم بھائیوں کی بھی اولادیں ہیں، جو الگ سے اپنا گھر اور کاروبار چلاتے ہیں۔ مرحوم غلام رسول نے اپنے پیچھے کچھ ملکیت چھوڑی ہے۔ از روئے شریعت یہ ملکیت کس طرح تقسیم ہوگی؟ اس سلسلے میں آپ کی رہ نمائی درکار ہے۔ امید ہے قرآن وسنت کے مطابق اس بارے میں رہ نمائی فرمائیں گے۔

جواب: آپ کی بیان کردہ تفصیل کے مطابق میت (غلام رسول صوفی) کے درج ذیل پس ماندگان ہیں:

(۱) بیوی (سندری بیگم) جو لاولد ہیں۔ (۲) بہن (فاطمہ۔ الطاف احمد کی ماں)

(۳) بھائی (غلام محی الدین صوفی) (۴) بھتیجے (تعداد مذکور نہیں)

شریعت کی رو سے:

۔۔اولاد نہ ہونے کی صورت میں بیوی کو میراث کا چوتھائی حصہ ملے گا۔ (النساء:۱۲)

۔۔بقیہ میراث بھائی بہن کے درمیان اس طرح تقسیم ہوگی کہ بہن کو ایک حصہ ملے گا اور بھائی کو دو حصہ۔ (النساء:۱۷۶)

۔۔بھائی بہن کی موجودگی میں بھتیجوں کو کچھ نہ ملے گا۔

خلاصہ یہ کہ پورے موروثہ مال کے چار حصے کیے جائیں۔ چوتھائی چوتھائی حصہ بیوی اور بہن کو دیا جائے اور نصف بھائی کو۔

(۵)

سوال: ہمارے ایک عزیز کا ابھی حال میں انتقال ہوا ہے۔ ان کی جائداد ان کے وارثوں میں کس نسبت سے تقسیم کی جائے گی؟

وہ لاولد تھے۔ ان کی اہلیہ اور ماں باپ کا انتقال پہلے ہو چکا ہے۔ ایک بھائی اور دو بہنیں اور ایک ماں شریک بہن تھیں۔ وہ سب بھی فوت ہوگئے ہیں۔ پس ماندگان میں صرف چار بھتیجے، چھ بھتیجیاں، نو بھانجے اور دو بھانجیاں زندہ ہیں۔ مرحوم نے اپنی زندگی میں ایک لڑکی کو گود لے لیا تھا، جس سے کوئی خونی رشتہ نہیں ہے۔ اس کے حق میں ایک تہائی سے کم کی وصیت موجود ہے۔

براہ کرم مندرجہ بالا تفصیل کے مطابق وراثت کی شرعی تقسیم سے مطلع فرمائیں۔

جواب: شریعت نے میراث کی تقسیم سے قبل قرض کی ادائی اور وصیت کے نفاذ کا حکم دیا ہے:

مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْنَ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ط (النساء:۱۲)

مستحقین میراث کے تین درجات ہیں: (۱) ذوی الفروض (۲) عصبہ (۳) ذوی الارحام۔ ذوی الفروض میں میراث تقسیم ہونے کے بعد اگر کچھ بچے گا تو وہ عصبہ میں تقسیم ہوگا اور عصبہ نہ ہوں تو ذوی الارحام کو ملے گا۔

آپ کی بیان کردہ تفصیل کے مطابق میت کے چار بھتیجے، چھ بھتیجیاں، ان کے علاوہ متعدد بھانجے بھانجیاں ہیں۔ ان میں سے صرف بھتیجے عصبہ ہیں۔ بھتیجیاں، بھانجے اور بھانجیاں ذوی الارحام میں سے ہیں۔

اس بنا پر میت کی وصیت نافذ کرنے کے بعد بقیہ ترکہ اس کے چاروں بھتیجوں میں برابر برابر تقسیم کردیا جائے گا۔

(۶)

سوال: میری پھوپھی کا ابھی حال میں انتقال ہوا ہے۔ ان کے ذاتی اکاؤنٹ میں کچھ رقم تھی۔ اس کی تقسیم کیسے عمل میں لائی جائے؟ واضح رہے کہ ان کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ ان کے شوہر اور دو بہنیں حیات ہیں۔ بھائیوں کا انتقال ہوچکا ہے، البتہ بھتیجے اور بھانجے ہیں۔

جواب: قرآن میں ہے کہ ''اگر کسی عورت کا انتقال ہوجائے تو اس کے شوہر کو اولاد ہونے کی صورت میں ایک چوتھائی اور اولاد نہ ہونے کی صورت میں نصف میراث ملے گی۔'' (النساء: ۱۲) اسی طرح قرآن میں یہ بھی مذکور ہے کہ اگر ورثاء میں دو بہنیں ہوں تو وہ دو تہائی میراث کی حق دار ہوں گی۔ (النساء: ۱۷۶) بھتیجے عصبہ ہیں۔ میراث اصحاب الفرائض میں تقسیم ہونے کے بعد اگر کچھ بچے گی تو پائیں گے، ورنہ محروم رہیں گے۔

مذکورہ بالا صورت میں میراث برابر تقسیم نہیں ہو پا رہی ہے، اس لیے کہ شوہر کا حصہ نصف اور بہنوں کا حصہ دو تہائی ہے۔ اسے فقہ کی اصطلاح میں 'عول' کہا جاتا ہے۔ اس میں حسابی قاعدہ کے مطابق تقسیم کا خلاصہ یہ ہے کہ کل میراث کے سات حصے کیے جائیں گے۔ ان میں سے تین حصے شوہر کو اور دو دو حصے بہنوں کو ملیں گے۔

میراث کی عدم تقسیم سے پیدا ہونے والے مسائل

سوال: میرے والد صاحب نے اپنے ذاتی سرمایے سے ایک دوکان لگائی۔ اس سے پورے گھر کا خرچ چلتا تھا۔ انھوں نے اپنی معاونت کے لیے میرے ایک بھائی کو اور کچھ دنوں کے بعد دوسرے بھائی کو شریک کیا۔ چند سال قبل والد صاحب کا انتقال ہوگیا۔ ترکے کی تقسیم عمل میں نہیں آئی۔ بڑے بھائی اس دوکان کی آمدنی سے پورے گھر کا خرچ اٹھاتے رہے۔ لیکن اب وہ گھر کا خرچ اٹھانے سے انکار کررہے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ دوکان سے ہونے والے منافع کے صرف وہی حق دار ہیں، دوسرے بھائیوں کا اس میں کوئی حصہ نہیں ہے۔

دریافت طلب مسئلہ یہ ہے کہ کیا جو بھائی دوکان چلا رہا ہے صرف وہی کل منافع کا حق دار ہے یا وہ صرف اجرت کا مستحق ہے اور منافع میں تمام ورثاء شریک ہوں گے؟ وہ دوکان ایسی ہے کہ اگر اسے صرف کرایے پر اٹھا دیا جائے تو ماہانہ پچاس ہزار روپے کرایہ آسکتا ہے۔

جواب: اسلامی شریعت پر عمل نہ کرنے کے نتیجے میں انسانی زندگی میں کتنی پیچیدگیاں پیدا ہوجاتی ہیں، آپ کا کیس اس کا ایک نمونہ ہے۔ اس پر غور کرنے سے چند باتیں سمجھ میں آتی ہیں:

(۱) کوئی شخص اپنی زندگی میں اپنی ملکیت کی چیزوں میں سے کوئی چیز کسی کو دینا چاہے تو دے سکتا ہے۔ اسی طرح باپ اپنی زندگی میں اپنے بیٹے کو اپنی کسی چیز کا مالک بنا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں حدیث سے یہ تعلیم ملتی ہے کہ اگر کسی شخص کی کئی اولادیں ہوں اور وہ کوئی چیز دینا چاہے تو سب کو برابر برابر دے، تاکہ ان میں سے کسی کو اپنی حق تلفی کا احساس نہ ہو۔ حتیٰ کہ لڑکوں اور لڑکیوں کے درمیان بھی فرق نہ کرنا چاہیے۔ آپ کے بیان کے مطابق آپ کے والد نے ایسا نہیں کیا۔ یعنی اپنے کسی بیٹے کو اپنی زندگی میں اپنی کسی چیز کا مالک نہیں بنایا۔

(۲) کاروبار میں اگر سرمایہ باپ کا لگا ہے، لڑکوں نے کاروبار بڑھانے میں باپ کا تعاون کیا ہے تو مناسب یہ ہے کہ ابتداء ہی میں لڑکوں کی حیثیت متعین کرلی جائے۔ اگر ایسا نہ ہو تو باپ کے زیر کفالت ہونے کی صورت میں وہ باپ کے معاون شمار ہوں گے، منافع میں ان کا الگ سے حصہ نہیں لگایا جائے گا۔

(۳) باپ کے انتقال کے بعد فوراً اس کی پوری ملکیت (مکان، دوکان، زمین، جائداد، کاروبار وغیرہ) ورثاء کے درمیان تقسیم ہوجانی چاہیے تھی۔ اگر اس وقت تقسیم نہیں ہوئی تو اب جتنی جلد ممکن ہو، اسے تقسیم کرلینا چاہیے۔

(۴) آپ کا جو بھائی دوکان چلا رہا ہے، ظاہر ہے وہ دوکان اس کی ملکیت نہیں ہے، کیوں کہ باپ نے اپنی زندگی میں اسے دوکان کا مالک نہیں بنایا۔ محض یہ بات کہ وہ باپ کی زندگی میں ان کے ساتھ دوکان پر بیٹھتا تھا، اس کا مالک ثابت کرنے کے لیے کافی نہیں ہے۔ اس کی تقسیم شرعی اعتبار سے ہونی چاہیے۔ اس کی ایک قابل عمل صورت یہ ہوسکتی ہے کہ اس کی مالیت متعین کرکے اس میں دوسرے بھائیوں اور دیگر ورثاء کا جو

حصہ بنتا ہو اسے وہ ادا کر دے، اس طرح دوکان کا مالک بن جائے، بہ شرط یہ کہ دیگر ورثاء اس پر تیار ہو جائیں، یا کسی اور صورت پر تمام ورثاء اتفاق کرلیں۔ بہر حال کسی ایک بھائی کا اپنے باپ کی پوری میراث پر قبضہ کر لینا اور دیگر ورثاء کو محروم رکھنا کسی طور پر بھی جائز نہیں ہے۔ ایسا کرنا اللہ تعالیٰ کے غضب کو دعوت دینا ہے۔

کیا قرض کی واپسی اضافہ کے ساتھ جائز ہے؟

سوال: ایک حدیث نظر سے گزری، جس کا مضمون کچھ یوں ہے:

''حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ میرا رسول اللہ ﷺ پر کچھ قرض تھا۔ جب آپ نے وہ واپس کیا تو کچھ بڑھا کر دیا۔''

کیا اس سے سود کا جواز نہیں نکل رہا ہے؟ یا اس کا مطلب یہ ہے کہ قرض کی واپسی کے وقت اگر بغیر فی صد طے کیے زیادہ دیا جائے تو وہ سود نہیں ہے۔ اگر رسول اللہ ﷺ اپنی خوشی سے حضرت جابرؓ کو کچھ ہدیہ دینا چاہتے تھے تو کیا اسے قرض کی واپسی کے وقت ہی دینا ضروری تھا؟ میں اس حدیث کو قرآن کے مطابق تسلیم کروں یا اس کے خلاف؟

بہ راہ کرم میرے اس اشکال کو رفع فرما دیں۔

جواب: حدیثِ رسول اگر صحیح ہو تو اس کے بارے میں توجیہ اور تطبیق کا ذہن بنانا چاہیے، نہ کہ اس پر اعتراض کرنے، شبہ وارد کرنے اور اسے قرآن کے خلاف سمجھ کر رد کر دینے کا۔

یہ حدیث سنن ابی داؤد(۱) میں جس سند سے مروی ہے، اسے علامہ البانیؒ نے صحیح قرار دیا ہے۔ اس کے علاوہ یہ صحیح بخاری صحیح مسلم اور سنن بیہقی میں بھی آئی ہے(۲) اس مضمون کی اور بھی احادیث دیگر صحابہ سے مروی ہیں۔ مثلاً ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کسی موقع پر ایک شخص سے ایک اونٹ قرض لیا تھا۔ اس نے آپؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر اس کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ آپ نے اس کی ادائی کا حکم دیا۔ آپ کو بتایا گیا کہ ویسا اونٹ تو نہیں ہے، ہاں، اس سے اچھا اونٹ ہے۔ آپؐ نے فرمایا: اسی کو دے دو، ساتھ ہی یہ بھی فرمایا:

---

(۱) ابو داؤد کتاب البیوع، باب فی حسن القضاء، ۳۳۴۷

(۲) بخاری، کتاب الصلاۃ، باب الصلاۃ اذا قدم من سفر، ۴۴۳، مسلم: ۷۱۵، بیہقی، ۱۱۲۶۱، ۱۲۳۰۸

فَاِنَّ خَیرَکُم اَحسَنُکُم قَضَاءً ا (۱)

''تم میں سے بہتر لوگ وہ ہیں جو ادائیگی بہتر طریقے سے کریں۔''

دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں:

فَاِنَّ مِنْ خِیَارِ النَّاسِ اَحسَنُھُم قَضَاءً ا (۲)

''بہترین لوگ وہ ہیں جو ادائیگی بہتر طریقے سے کرتے ہیں۔''

حضرت جابرؓ سے مروی حدیث کی شرح میں حافظ ابن حجر عسقلانیؒ اور علامہ شوکانیؒ دونوں نے لکھا ہے:

> ''اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جتنا قرض لیا گیا ہو اس سے بڑھا کر واپس کرنا جائز ہے، اگر معاملہ میں اسے مشروط نہ کیا گیا ہو۔ لیکن اگر قرض لیتے وقت اس میں اضافہ کے ساتھ واپسی کی شرط لگائی گئی ہو تو یہ حرام ہے۔ اس پر جمہور علماء کا اتفاق ہے۔'' (۳)

اس سے معلوم ہوا کہ سود کا اطلاق اس زیادتی پر ہوتا ہے جسے قرض کے لین دین کے وقت طے کر لیا گیا ہو اور اس کی ادائیگی قرض لینے والے پر لازم ہو۔ لیکن اگر زیادتی کے ساتھ قرض کی واپسی مشروط نہ ہو اور قرض لینے والا اپنی خوشی سے اس میں کچھ بڑھا کر واپس کرے تو یہ نہ صرف جائز، بلکہ رسول اللہ ﷺ کے اسوہ سے پسندیدہ ہے۔

مردوں اور عورتوں کے مشترکہ دینی اجتماعات

سوال: زندگیِ نو میں 'رسائل و مسائل' کالم میں کچھ عرصہ پہلے 'تحریکی خواتین کا دائرۂ عمل' کے عنوان کے تحت آپ نے جو جواب تحریر کیا تھا، وہ یقیناً تحریکی خواتین کے بہت سے خدشات دور کرنے والا تھا۔ اس سلسلے میں کچھ اور سوالات ذہن میں ابھرے ہیں۔ بہ راہ کرم ان کے جوابات سے نوازیے۔

---

(۱) بخاری، کتاب فی الاستقراض، باب استقراض الابل، مسلم: ۱۶۰۱، ۲۳۹۰

(۲) بخاری، کتاب الاستقراض، باب ھل یعطی اکبر من سنّہ ۲۳۹۲

(۳) فتح الباری، بشرح صحیح البخاری، دار المعرفۃ بیروت، ۵/۵۷، نیل الاوطار

ہمارے تحریکی اجتماعات عموماً مسجدوں میں ہوتے ہیں۔ خواتین مسجد کے ایک کمرے میں بیٹھتی ہیں اور Sound Box کے ذریعے درس قرآن یا تقریر سنتی ہیں۔ بعض اجتماعات دوسرے مقامات پر ہوتے ہیں۔ وہاں پردے کے ذریعے خواتین کی نشست الگ کردی جاتی ہے۔ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ مرد شرکاء کے پیچھے ایک بڑا پردہ لگا دیا گیا۔ خواتین اس کے پیچھے برقع میں بیٹھیں۔ اجتماع کے اختتام پر ایک ذمے دار نے کہا کہ یہ پردہ نہیں، بلکہ پردہ در پردہ ہے۔ ابھی حال میں میقاتی پروگرام کی تفہیم کے لیے صرف خواتین کا اجتماع منعقد ہوا۔ اس میں کوئی مرد شریک نہیں تھا، سوائے حلقے کے دو ذمے داروں اور مقامی امیر کے۔ یہ تینوں حضرات کرسیوں پر بیٹھے، ان کے رُو برُو خواتین برقعے میں بیٹھیں۔ یہ پروگرام مسجد میں صبح گیارہ بجے سے شام چار بجے تک چلتا رہا۔ آپ چاہے انبیائے کرام علیہم السلام کے اوصاف کے حامل کیوں نہ ہوں اور چاہے آپ کا دل و دماغ کتنا ہی پاک صاف اور شیطان کے شر سے کتنا ہی محفوظ کیوں نہ ہو، لیکن اس کے باوجود ایسی نشست کہاں تک تحریکی مزاج سے مطابقت رکھتی ہے۔

میرے ناقص خیال میں چہرے کے پردے میں آنکھیں بھی شامل ہیں اور آج کل کے پردے میں آنکھوں کا کوئی پردہ نہیں ہوتا۔ اگر ہم نفسیاتی طور پر جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ آنکھیں دراصل انسانی جذبات و کیفیات کی ترجمان ہوتی ہیں۔ انسان کے غصے، خوف، نفرت، عداوت اور محبت سب کا اظہار اس کی آنکھوں سے ہوتا ہے۔ امام غزالیؒ نے اپنی تصنیف 'احیاء علوم الدین' میں لکھا ہے کہ ''انسان کے دل میں شیطان آنکھوں کی راہ سے داخل ہوتا ہے'' اور آج کل کا پردہ دیگر دروں کو بند کرتا ہے، لیکن اصل در کو کھلا چھوڑ دیتا ہے۔

تحریک میں پہلے کی بہ نسبت اب خواتین کی تعداد بڑھنے کے ساتھ اجتماعات کی شکل اور نوعیت بھی بدلتی جارہی ہے۔ اس لیے ضروری ہوگیا ہے کہ مشترکہ اجتماعات کی شکل و صورت متعین کی جائے۔ بہ راہ کرم وضاحت فرمائیں کہ مشترکہ تحریکی اجتماعات میں خواتین کی نشست کہاں پر ہو؟ وہ اجتماع گاہ سے متصل کمرے میں بیٹھیں، یا مرد شرکاء کے پیچھے برقعے میں بیٹھیں، یا پھر مردوں کے پیچھے ایک بڑا پردہ باندھ دیا جائے، جس کے پیچھے خواتین کی نشست ہو؟

جواب: یہ بات بڑی خوش آیند ہے کہ اب مردوں کی طرح خواتین میں بھی دینی بیداری آرہی

ہے اور دین کی جانب ان کا میلان بڑھ رہا ہے۔ یہ بات جہاں بہ حیثیت مجموعی پورے مسلم معاشرے کے بارے میں درست ہے وہیں تحریک اسلامی کے اندر بھی اس کا مشاہدہ ہو رہا ہے۔ چنانچہ اجتماعات میں ان کی شرکت میں اضافہ ہو رہا ہے اور ان کی سرگرمیاں بڑھ رہی ہیں۔

خواتین کے علاحدہ اجتماعات منعقد کیے جاسکتے ہیں اور مشترکہ اجتماعات میں بھی وہ شریک ہوسکتی ہیں۔ یہ اجتماعات مساجد میں بھی ہوسکتے ہیں اور دیگر مقامات پر بھی۔ علاحدہ اجتماعات میں بہتر یہ ہے کہ تقریر کرنے یا درس دینے والی بھی خواتین ہی ہوں، لیکن بہ وقت ضرورت مرد بھی یہ کام انجام دے سکتے ہیں۔ صدر اول میں اس طرح کی تمام مثالیں موجود ہیں۔ عہد نبویؐ اور عہد خلفائے راشدین میں مسجد نبویؐ اور دیگر مساجد میں جمعہ کے جو خطبے ہوتے تھے ان سے خواتین بھی استفادہ کرتی تھیں۔ ایک مرتبہ بعض خواتین نے اللہ کے رسول ﷺ سے درخواست کی کہ ان کے لیے الگ سے کوئی وقت اور جگہ متعین کر دیں، کہ ان کے بعض مسائل ایسے ہوتے ہیں جنھیں وہ مشترکہ مجلسوں میں نہیں بیان کرسکتیں۔ آپ ﷺ نے ان کی درخواست قبول فرمائی۔(۱)

ایک مرتبہ آپؐ نے عید کا خطبہ دیا۔ آپؐ کو محسوس ہوا کہ آپؐ کی آواز خواتین تک نہیں پہنچی ہے، جو کہ کچھ فاصلے پر اکٹھا تھیں۔ آپؐ ان کے پاس تشریف لے گئے اور ان کو وعظ و تلقین فرمائی۔ اس موقع پر حضرت بلالؓ بھی آپؐ کے ساتھ تھے(۲) فتح مکہ کے اگلے دن آپؐ نے حضرت عمر بن الخطابؓ کو ذمے داری دی کہ وہ اس جگہ جائیں جہاں خواتین اکٹھا ہیں اور ان سے بیعت لیں۔ حضرت عمرؓ نے یہ خدمت انجام دی۔

ایسے اجتماعات، جن میں مرد حضرات اور خواتین دونوں شریک ہوں، ان میں دو باتوں کا خاص طور پر خیال رکھنا چاہیے، کہ قرآن و حدیث میں ان کی تاکید آئی ہے:

(۱) **مردوں اور عورتوں کے درمیان اختلاط نہ ہو:** اسلامی شریعت کا مزاج یہ ہے کہ وہ اجنبی مردوں اور عورتوں کا اختلاط پسند نہیں کرتی۔ اللہ کے رسول ﷺ نے خواتین کو

---

(۱) بخاری، کتاب العلم باب ھل یجعل للنساء یوم علی حدۃ فی العلم،۱۰۱

(۲) مسلم، کتاب صلاۃ العیدین :۸۸۵

مسجد آکر باجماعت نماز پڑھنے کی اجازت دی تو ساتھ ہی اس کا بھی اہتمام فرمایا کہ ان کی صفیں پیچھے رکھیں اور ان کے اور مردوں کی صفوں کے درمیان بچوں کی صفیں بنائیں۔ ساتھ ہی مسجد میں عورتوں کے داخلے کے لیے ایک دروازہ خاص کر دیا، جس سے مردوں کو داخل ہونے کی اجازت نہ تھی۔ یہ بھی حکم دیا کہ نماز ختم ہونے کے بعد خواتین پہلے چلی جائیں، مرد بعد میں نکلیں۔ ایک مرتبہ آپؐ نے راستے میں مردوں اور عورتوں کو خلط ملط چلتے دیکھا تو ایسا کرنے سے منع کیا اور عورتوں کو حکم دیا کہ وہ کنارے ہوکر چلا کریں[1] اس لیے مشترکہ اجتماعات میں مردوں اور عورتوں کی نشستیں الگ الگ ہونی چاہئیں۔ جہاں اجتماع ہو رہا ہو وہاں اگر داخلے کے دو یا دو سے زیادہ دروازے ہوں تو ایک دروازے کو عورتوں کے لیے خاص کر دینا چاہیے۔ خلاصہ یہ کہ ایسی تدبیریں اختیار کرنی چاہئیں کہ اجتماع کے دوران اور اس سے پہلے اور بعد میں بھی مردوں اور عورتوں کے درمیان اختلاط نہ ہو۔

(۲) **خواتین کی جانب سے زینت کا اظہار نہ ہو:** خواتین کے لیے گھروں سے باہر نکلنے کے جو آداب قرآن وحدیث میں بیان کیے گئے ہیں ان میں سے ایک ادب یہ بھی ہے کہ وہ اپنی زینت کا اظہار نہ کریں۔'' (النور: ۳۱) اس کے لیے انھیں 'جلباب' (چادر وغیرہ) استعمال کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ (الاحزاب: ۵۹) اللہ کے رسول ﷺ نے انھیں مسجد میں آنے کی اجازت دی تو ساتھ ہی یہ بھی حکم دیا کہ وہ خوشبو لگا کر اور بناؤ سنگار کرکے نہ آئیں[2] اس لیے مشترکہ اجتماعات میں شریک ہونے والی خواتین کو چاہیے کہ وہ اپنی زینت کا دکھاوا نہ کریں، خوشبو لگا کر نہ آئیں اور ان کا لباس ساتر ہو۔

خواتین کو پردہ کرنے کا جو حکم دیا گیا ہے اس میں چہرہ شامل ہے یا نہیں؟ اس معاملے میں شروع سے علمائے امت کا اختلاف رہا ہے۔ سورۂ النور اور سورۂ الاحزاب میں اس سلسلے میں

---

(۱) سنن ابی داؤد، کتاب الادب، باب فی مشی النساء مع الرجال فی الطریق، ۵۲۷۲

(۲) مسلم، کتاب الصلاۃ، باب خروج النساء الی المساجد.... ۴۴۳، ۴۴۴

جو احکام ہیں ان میں چہرے کے پردے کے سلسلے میں صریح الفاظ نہیں ہیں۔ اسی بنا پر جہاں بہت سے علماء چہرے کے بھی پردے میں شامل ہونے کے قایل ہیں وہیں بعض چہرے کو پردے میں شامل نہیں سمجھتے۔ ایسے لوگوں میں بعض صحابہ کرامؓ اور تابعین عظام بھی ہیں اور بعد کے محدثین اور علماء بھی۔ ہم یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ چہرے کا پردہ کرنے کی صورت میں عورت کا اچھی طرح پردہ ہوجاتا ہے، یا یہ کہ موجودہ دورِ فتنہ میں بہتر ہے کہ عورت چہرے کا بھی پردہ کرے، لیکن اپنے نقطۂ نظر پر اصرار کرنے اور اسی کو روحِ شریعت قرار دینے کا ہمیں حق نہیں۔ جو خواتین ساتر لباس استعمال کرتی ہیں اور پردے کے دیگر آداب کا بھی خیال رکھتی ہیں، لیکن شریعت کی اس گنجایش کی بنا پر چہرے کا پردہ نہیں کرتیں انھیں بے پردہ اور روحِ شریعت سے نابلد کہنا مناسب نہیں۔

یہ بات صحیح ہے کہ آنکھوں میں کشش پائی جاتی ہے، ان سے مثبت یا منفی جذبات کا اظہار ہوتا ہے اور بہت سے فتنے ان کی راہ سے برپا ہوتے ہیں، لیکن اس کا علاج آنکھوں یا چہرے کو چھپانا نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو صریح الفاظ میں اس کا حکم دیا جاتا۔ لیکن اس کے بجائے نگاہیں نیچی رکھنے اور فتنے کے مقامات سے انھیں بچا کر رکھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

> قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَ يَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ؕ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ ○ وَ قُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَ يَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ
>
> (النور: ۳۰،۳۱)
>
> ’’اے نبیؐ، مومن مردوں سے کہو کہ اپنی نظریں بچا کر رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں، یہ ان کے لیے زیادہ پاکیزہ طریقہ ہے۔ جو کچھ وہ کرتے ہیں اللہ اس سے باخبر رہتا ہے۔ اور اے نبیؐ، مومن عورتوں سے کہہ دو کہ اپنی نظریں بچا کر رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں۔‘‘

یہ حکم مردوں اور عورتوں دونوں کے لیے ہے۔ احادیث میں اس کی تشریح وتفصیل

موجود ہے۔ اس کے مطابق کسی عورت یا مرد پر اچانک نگاہ پڑ جانا قابل مواخذہ نہیں، اصلاً ممانعت ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے، گھورنے اور نظر بازی کرنے کی ہے۔ خلاصہ یہ کہ شریعت میں نگاہ کی آوارگی سے روکا گیا ہے۔

مردوں اور عورتوں کے مشترکہ دینی اجتماعات کی کوئی مخصوص شکل وصورت متعین کرنا ضروری ہے نہ مناسب۔ شریعت کے بتائے ہوئے آداب اور حدود کی رعایت کرتے ہوئے کوئی بھی صورت اختیار کی جاسکتی ہے۔

لباس کے حدود وقیود

سوال: لباس کے بارے میں ایک مضمون نظر سے گزرا جس میں لکھا گیا ہے کہ لباس میں اصل پہلو جواز کا ہے، ایک مسلمان اپنے علاقے کی عادات واطوار کی رعایت کے ساتھ کوئی بھی لباس پہن سکتا ہے۔'' بہ راہ کرم وضاحت فرمائیں، کیا یہ معاملہ پینٹ شرٹ کے ضمن میں بھی ہے، جب کہ یہ لباس مسلم غیر مسلم سب کے لیے عام ہے؟ لباس کے بارے میں ایک ہدایت یہ ملتی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ ٹخنوں تک رہے۔ یہ بھی ملتا ہے کہ جو لباس تکبر کی نیت سے ٹخنوں سے نیچے ہو وہ حرام ہے۔ آج کے دور میں عام مسلمان مقامی ماحول اور رواج کے مطابق جو پینٹ پہنتے ہیں وہ عموماً ٹخنوں سے نیچے ہوتا ہے، اس میں فخر اور تکبر کی نیت یا علامت نہیں ہوتی۔ اسے خاص وعام، امیر وغریب، مسلم غیر مسلم سب استعمال کرتے ہیں۔ کیا اسے استعمال کرنا جائز ہے؟

جواب: اسلامی شریعت میں لباس کے سلسلے میں چند حدود متعین کردی گئی ہیں۔ ان کی پابندی ضروری ہے۔ اس کے بعد آزادی ہے کہ علاقے کی عادات واطوار کے مطابق کوئی بھی لباس پہنا جاسکتا ہے۔

اول: لباس ستر چھپانے والا ہو۔ مرد کے لیے ستر ناف اور گھٹنے کے درمیان کا حصۂ جسم ہے اور عورت کے لیے اس کے چہرے اور ہاتھوں کے علاوہ مکمل جسم ستر ہے۔ اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ لباس اتنا باریک اور چست نہ ہو کہ اعضائے جسم نمایاں ہوں۔

دوم: مردوں کے لیے عورتوں کے لباس پہننا اور عورتوں کے لیے مردوں کے لباس

پہننا ممنوع ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے عورت جیسا لباس پہننے والے مرد اور مرد جیسا لباس پہننے والی عورت پر لعنت فرمائی ہے[۱] ۔ اور حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ "رسول اللہ ﷺ نے مردوں سے مشابہت اختیار کرنے والی عورتوں اور عورتوں سے مشابہت اختیار کرنے والے مردوں پر لعنت کی ہے۔"[۲] احادیث میں مردوں کے لیے ریشم اور سرخ رنگ کا لباس، اسی طرح سونے کا زیور، زنجیر، انگوٹھی وغیرہ پہننے کی ممانعت آئی ہے۔

سوم: ایسا لباس پہننے کی بھی ممانعت ہے جو کسی غیر مسلم قوم کا شعار ہو، یا اسے پہن کر آدمی غیر مسلم قوم کا فرد معلوم ہو، مثلاً گیروا رنگ کا لباس، جسے ہندو سادھو پہنتے ہیں، مخصوص طرز کی پگڑی، جو سکھوں کی پہچان ہے، یا اس طرح کا لباس جو عیسائی راہب پہنتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

مَنۡ تَشَبَّہ بِقَوۡمٍ فَھُوَ مِنۡھُمۡ[۳]۔

"جس نے کسی قوم سے مشابہت اختیار کی وہ انہی میں سے ہے۔"

چہارم: احادیث میں مردوں کے لیے اس کی بھی ممانعت آئی ہے کہ ان کا زیریں لباس ٹخنوں سے نیچے ہو۔ اس سلسلے میں سخت وعید آئی ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

مَا اَسۡفَلَ مِنَ الۡکَعۡبَیۡنِ مِنَ الۡاِزَارِ فِی النَّارِ[۴]۔

"تہبند کا جتنا حصہ ٹخنوں سے نیچے ہوگا وہ آگ میں ہوگا۔"

ایک حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ روزِ قیامت تین طرح کے آدمیوں سے نہ بات کرے گا، نہ ان کی طرف نظر کرم کرے گا، نہ ان کا تزکیہ کرے گا، بلکہ انھیں دردناک عذاب دے گا۔ ان میں سے ایک وہ شخص ہوگا جو اپنا زیریں لباس ٹخنوں سے نیچے لٹکاتا ہوگا[۵]۔

اگرچہ بعض احادیث میں یہ سخت وعید اس شخص کے لیے آئی ہے جو ایسا تکبر کی وجہ سے

---

(۱) ابو داؤد، کتاب اللباس، باب فی لباس النساء، ۴۰۹۷، ۴۰۹۸، احمد، ۲/ ۳۲۵

(۲) بخاری، کتاب اللباس، باب المتشبھون بالنساء والمتشبھات بالرجال ۵۸۸۵

(۳) ابو داؤد، کتاب اللباس، باب فی لبس الشھرۃ، ۴۰۳۱

(۴) بخاری، کتاب اللباس، باب ما اسفل من الکعبین... ۵۷۸۷

(۵) مسلم، کتاب الایمان، باب غلظ تحریم اسبال الازار ۱۰۶، ابوداؤد: ۴۰۸۷

کرے گا۔ مثلاً حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

لَا یَنْظُرُ اللّٰہُ اِلٰی مَنْ جَرَّ اِزَارَہٗ بَطَرًا (۱)

"اللہ اس شخص کی جانب نگاہ نہیں اٹھائے گا جو تکبر کی وجہ سے اپنا تہبند گھسیٹ کر چلے گا۔"

مگر دیگر احادیث میں یہ وعید عمومی انداز میں آئی ہے، اس لیے زیریں لباس کو ٹخنوں سے نیچے رکھنا کراہت سے خالی نہیں۔ پینٹ شرٹ ایسا لباس نہیں، جو کسی غیر مسلم قوم کے ساتھ خاص ہو، اس لیے مذکورہ بالا حدود و قیود کے ساتھ اسے بھی پہنا جا سکتا ہے۔

مصافحے کا مسنون طریقہ

سوال: مصافحے کا صحیح اور مسنون طریقہ کیا ہے؟ بعض حضرات دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کرنے پر اعتراض کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ سنت سے ثابت نہیں ہے۔ بہ راہ کرم وضاحت فرمائیں، مصافحہ دونوں ہاتھوں سے ہونا چاہیے یا ایک ہاتھ سے؟

جواب: سلام کرتے وقت مصافحہ کا ثبوت احادیث سے ملتا ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "دو مسلمان باہم ملاقات کے وقت مصافحہ کرتے ہیں تو ان کے جدا ہونے سے پہلے ان کی مغفرت کر دی جاتی ہے۔"(۲) ایک دوسری حدیث میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا: "مصافحہ کرو، دل کا کینہ دور ہو جائے گا۔" (۳) حضرت انسؓ کے شاگرد نے ان سے پوچھا: کیا اصحابِ نبی ﷺ مصافحہ کرتے تھے؟ انھوں نے جواب دیا: ہاں(۴)

مصافحہ ایک ہاتھ سے بھی کیا جا سکتا ہے اور دونوں ہاتھوں سے بھی۔ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے تشہد سکھائی، اس حال میں کہ میرا ہاتھ آپؐ کے دونوں ہاتھوں کے درمیان تھا(۵) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصافحہ میں حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ نے اپنا ایک ہاتھ استعمال کیا اور رسول اللہ ﷺ نے دونوں ہاتھ۔ حضرت عبید اللہ بن بسرؓ اپنے شاگردوں سے بیان کرتے ہیں: "میں نے بیعت کے وقت اپنے اس ہاتھ کو حضرت محمد ﷺ

---

(۱) بخاری، کتاب اللباس، باب من جرّ ثوبہ من الخیلاء ۵۷۸۸، مسلم: ۲۰۸۷

(۲) ترمذی، کتاب الاستئذان، باب ماجاء فی المصافحة، ۲۷۲۷

(۳) مؤطا: ۳۳۶۵

(۴) بخاری، کتاب الاستئذان، باب المصافحة، ۶۲۶۳

(۵) بخاری، کتاب الاستئذان، باب المصافحة

کے دستِ مبارک پر رکھا تھا۔‘‘ (۱) اس روایت کے مطابق دونوں طرف سے ایک ہاتھ ہی کا استعمال ہوا تھا۔ حضرت سلمہ بن اکوعؓ نے ایک موقع پر حاضرین سے بیان کیا: ’’میں نے اپنے ان دونوں ہاتھوں سے اللہ کے نبی ﷺ سے بیعت کی ہے۔‘‘ (۲) امام بخاری نے نقل کیا کہ ایک موقع پر حضرت حماد بن زید نے حضرت عبداللہ بن مبارکؒ سے دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کیا (۳) اس تفصیل سے واضح ہوتا ہے کہ مصافحہ ایک ہاتھ سے بھی کیا جا سکتا ہے اور دونوں ہاتھوں سے بھی۔

بینک لون سے بنوائے گئے مکان کی افتتاحی پارٹی

سوال: ہمارے ایک رشتے دار نے بینک سے لون لے کر اپنا مکان بنوایا ہے۔ اب مکان بن کر تیار ہوا تو وہ اس کی افتتاحی پارٹی کر رہے ہیں۔ مجھے اس میں شرکت میں تردد ہے، اس لیے کہ انٹرسٹ کی بنیاد پر بینک سے لون لینے کو میں جائز نہیں سمجھتا ہوں، دوسری طرف اس کا بھی اندیشہ ہے کہ اگر میں اس پارٹی میں شرکت نہیں کروں گا تو وہ ناراض ہو جائیں گے۔ بہ راہ کرم مشورہ دیں۔ میں کیا کروں؟

جواب: بینک انٹرسٹ کو علماء نے حرام قرار دیا ہے، اس بنا پر مکان کی تعمیر کے لیے لون لینا عام حالات میں جائز نہیں ہے، لیکن اگر کسی کو مکان کی سخت ضرورت ہے اور کسی دوسرے ذریعے سے وہ رقم کا انتظام نہیں کر سکتا تو اضطراری صورت میں بینک سے لون لے کر مکان تعمیر کرنا اس کے لیے جائز ہوگا۔ اب یہ فیصلہ کرنا متعلق فرد کا کام ہے کہ وہ بینک سے لون عام حالات میں لے رہا ہے یا اضطراری صورت میں۔

آپ کو پارٹی کا دعوت نامہ موصول ہوا ہے۔ اب اگر آپ کو متعین طور سے معلوم ہے کہ مکمل طور پر حرام کمائی سے پارٹی پر خرچ کیا جائے گا تب تو آپ اس میں شرکت نہ کریں، بہ صورت دیگر اس میں شرکت کی جا سکتی ہے۔

کوئی کام جائز ہو، لیکن کسی وجہ سے آپ کو اسے کرنے میں جھجک ہو تو کسی نے آپ کو مجبور تو نہیں کیا ہے کہ اسے ضرور انجام دیں۔ آپ کوئی خوبصورت عذر کر سکتے ہیں۔

---

(۱) احمد، ۴/۱۸۹

(۲) بخاری، الادب المفرد، باب تقبیل الید، ۹۷۳

(۳) بخاری، کتاب الاستئذان باب الاخذ بالیدین

موبائل فون میں قرآنی آیات کی ریکارڈنگ یا رِنگ ٹون

سوال: فی زمانہ سیل فونس (Cell Phones) کا استعمال بہت عام ہوگیا ہے۔ بعض مسلمان اپنے فون میں پورا قرآن مجید یا اس کا کچھ حصہ آواز کی شکل میں ریکارڈ رکھتے ہیں، نیز قرآن لکھا ہوا بھی محفوظ کرلیا جاتا ہے۔ کیا ایسے فون کو بیت الخلاء میں لے جایا جاسکتا ہے؟ اس سے قرآن کی بے حرمتی اور گناہ تو نہیں ہوگا؟ یہ نکتہ ملحوظ رہے کہ گم شدگی اور چوری کے اندیشے سے سیل فون کو اپنے ساتھ ہی رکھنا پڑتا ہے۔ بہ راہِ کرم یہ بھی بتائیے کہ کیا قرآنی آیات کو سیل فون میں رِنگ ٹون (Ring Tone) بنایا جاسکتا ہے؟

جواب: قرآن کریم مکمل ہو یا اس کا کوئی جز، ناپاکی کی حالت میں اسے ہاتھ لگانے کو فقہاء نے ناجائز قرار دیا ہے۔ اس لیے کہ اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے:

اَنْ لَا یَمُسَّ الْقُرْآنَ اِلَّا طَاهِرٌ (۱)

''قرآن کو صرف پاک شخص ہی چھوئے۔''

لیکن یہ حکم مصحف یعنی مطبوعہ کتابی شکل میں قرآن کا ہے۔ کیسٹ، MP3، موبائل یا کوئی دوسری چیز، جس میں قرآن کی ریکارڈنگ ہو، اسے ناپاکی کی حالت میں چھوا جاسکتا ہے۔

جہاں تک ایسا موبائل فون، جس میں پورا قرآن یا اس کا کچھ حصہ ریکارڈ ہو، اسے ساتھ رکھ کر بیت الخلاء جانے کا معاملہ ہے تو گھر، دفتر یا کسی ایسی جگہ جہاں بیت الخلا جاتے وقت اسے الگ رکھنا ممکن ہو، وہاں ایسا ہی کرنا چاہیے، لیکن اگر حفاظت کے نقطۂ نظر سے اسے ساتھ رکھنا ضروری ہو تو کوئی شخص اسے اپنے ساتھ رکھ کر بھی بیت الخلاء جاسکتا ہے۔ البتہ قرآنی آیات کو موبائل فون کی رنگ ٹون بنانے سے بچنا چاہیے۔ فون کی گھنٹی کسی وقت اور کسی جگہ بھی بج سکتی ہے، اس وقت بھی جب آدمی بیت الخلا میں ہو۔ بسا اوقات گھنٹی بجتے ہی فوراً آدمی فون ریسیو کرلیتا ہے، جب کہ آیت کا تھوڑا سا حصہ ہی سنائی دیا ہو، اس سے بسا اوقات آیت کا مفہوم خبط ہوتا ہے اور ایسا کرنے سے بے ادبی کا بھی اظہار ہوتا ہے۔

---

(۱) سنن الدارمی، کتاب الطلاق، باب لا طلاق قبل النکاح، ۲۲۶۶ موطا امام مالک، باب مس القرآن

محرمات سے علاج

سوال: کتابوں میں ایک روایت ملتی ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے کسی خاص مرض میں مبتلا کچھ افراد کو ہدایت فرمائی تھی کہ فلاں مقام پر جا کر رہو اور وہاں کے اونٹوں کا دودھ بہ طور غذا اور ان کا پیشاب بہ طور دوا پیو تو شفایاب ہو جاؤ گے۔''

اس ضمن میں چند امور وضاحت طلب ہیں:

(۱) کیا یہ روایت درست ہے؟ اگر ہاں تو اس واقعہ کی تفصیل کیا ہے؟

(۲) کیا رسول اللہ ﷺ نے کسی اور بیماری کے لیے کبھی اس طرح کا نسخہ تجویز فرمایا تھا؟

(۳) کچھ دواؤں کا تذکرہ 'طب نبوی' کے ذیل میں کیا جاتا ہے۔ کیا اونٹ کے پیشاب سے علاج کی یہ ہدایت بھی طب نبوی کے زمرہ میں شامل ہے؟ کیا آج بھی دواءً ایسا طریق علاج اختیار کیا جا سکتا ہے؟

(۴) کیا کوئی روایت ایسی ملتی ہے جس سے معلوم ہو کہ یہ ایک عارضی حکم تھا اور بعد میں آں حضرتؐ نے اس طریقِ علاج کو منسوخ کر دیا تھا؟

(۵) ہندوستان کے کچھ علاقوں میں گدھی کا دودھ بہ طور غذا و دوا مستعمل ہے۔ کیا کسی مسلمان کے لیے گدھی کے دودھ کا استعمال جائز ہے؟

جواب: یہ روایت حضرت انس بن مالکؓ سے مروی ہے۔ اس کا متعلقہ ٹکڑا یہ ہے:

اِنَّ نَاسًا مِنْ عُرَيْنَةَ قَدِمُوْا عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ الْمَدِيْنَةَ فَاجْتَوَوْهَا فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ''اِنْ شِئْتُمْ اَنْ تَخْرُجُوْا اِلٰى اِبِلِ الصَّدَقَةِ فَتَشْرَبُوْا مِنْ اَلْبَانِهَا وَ اَبْوَالِهَا، فَفَعَلُوْا فَصَحُّوْا (۱)

''قبیلہ عرینہ کے کچھ لوگ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں مدینہ آئے۔ وہ ایک مرض میں مبتلا ہو گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان سے فرمایا: '' چاہو تو صدقہ کے اونٹوں کے

---

(۱) مسلم، کتاب القسامۃ والمحاربین، باب حکم المحاربین والمرتدین:۱۶۷۱

درمیان چلے جاؤ اور وہاں رہ کر ان کا دودھ اور پیشاب پیو۔ انھوں نے اس پر عمل کیا تو وہ صحت یاب ہوگئے۔''

یہ حدیث امام بخاری نے اپنی صحیح میں مختلف سندوں سے چودہ مقامات پر روایت کی ہے۔(۱) صحیحین کے علاوہ یہ حدیث سنن ابی داؤد، جامع ترمذی، سنن نسائی، سنن ابن ماجہ، مسند احمد، سنن دار قطنی، صحیح ابن حبان، مصنف عبد الرزاق، سنن بیہقی، معجم اوسط طبرانی اور دیگر کتب حدیث میں بھی مروی ہے۔ اس بنا پر اس کی صحت میں کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ قبیلۂ عکل وعرینہ کے کچھ لوگ، جن کی تعداد آٹھ بیان کی گئی ہے، خدمتِ نبویؐ میں مدینہ حاضر ہوئے۔ انھیں صفۂ مسجد نبوی میں ٹھہرایا گیا۔ مدینہ کی آب و ہوا انھیں راس نہیں آئی۔ وہ بیمار پڑ گئے۔ بعض روایات میں ہے کہ ان کے بدن پہلے سے لاغر تھے اور وہ بیماری کا شکار تھے، مدینہ میں کچھ دن قیام کرنے سے ان کی بیماری میں اضافہ ہوگیا۔ رسول اللہ ﷺ نے انھیں آبادی سے باہر اس جگہ بھیج دیا جہاں بیت المال کے اونٹ رکھے جاتے تھے۔ آپؐ نے انھیں اونٹوں کا دودھ اور پیشاب استعمال کرنے کی ہدایت فرمائی۔ چند دنوں میں وہ صحت یاب ہوگئے اور ان کا مرض دور ہوگیا۔

قرآن کریم میں متعدد مقامات پر(۲) مردار، خون اور خنزیر کے گوشت وغیرہ کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ ساتھ ہی اضطرار کی حالت میں ان کے استعمال کی اجازت دی گئی ہے۔ اگر مباح چیزوں کے ذریعے کسی بیماری کا علاج نہیں ہو سکے تو اسے بھی بعض فقہاء نے اضطرار مانا ہے اور علاج کے لیے بہ طور دوا کسی حرام چیز کے استعمال کی اجازت دی ہے۔ احادیث میں اس کی بعض مثالیں موجود ہیں۔ حضرت عرفجہ بن اسعدؓ کی ناک ایک غزوہ میں کٹ گئی تو انھوں نے رسول اللہ ﷺ کی اجازت سے سونے کی ناک بنوائی(۳) حضرت عبد الرحمٰن بن عوفؓ اور حضرت زبیرؓ کو خارش ہوگئی تو آں حضرت ﷺ نے انھیں ریشم کی قمیص پہننے کی اجازت دے دی(۴) حالاں کہ سونے اور ریشم کا استعمال مردوں کے لیے حرام ہے۔

---

(۱) بخاری، کتاب الطب، باب الدواء بالبان الابل، ۵۶۸۵ و دیگر مقامات

(۲) ملاحظہ کیجیے المائدۃ: ۳، الانعام: ۱۴۵، النحل: ۱۱۵

(۳) ابو داؤد، کتاب الخاتم، باب ماجاء فی ربط الاسنان بالذھب ۴۲۳۲

(۴) بخاری، کتاب اللباس، باب ما یرخّص للرجال من الحریر للحکّۃ ۵۸۳۹، مسلم: ۲۰۷۶

حرام چیزوں کے ذریعے علاج کے سلسلے میں فقہاء نے زیرِ بحث حدیث کو بھی دلیل بنایا ہے، بلکہ امام مالکؒ اور امام احمدؒ تو اس حدیث کی بنا پر کہتے ہیں کہ اونٹ کا پیشاب پاک ہے۔ انھوں نے اونٹ ہی پر دیگر ان جانوروں کو قیاس کیا ہے، جن کا گوشت کھایا جاتا ہے اور ان کا پیشاب پاک قرار دیا ہے۔ فقہائے احناف میں امام محمدؒ کی بھی یہی رائے ہے۔ امام شافعیؒ اور فقہائے احناف میں امام ابو یوسفؒ کے نزدیک جانوروں کا پیشاب ناپاک ہے، البتہ دوا کے طور پر اس کا استعمال جائز ہے۔ امام ابوحنیفہؒ دیگر احادیث کی بنا پر اسے ناپاک قرار دیتے ہیں اور بہ طور دوا بھی اس کا استعمال جائز نہیں سمجھتے۔ البتہ متاخرین حنفیہ نے محرمات کا بہ طور دوا استعمال، ان کا بدل نہ ہونے کی صورت میں جائز قرار دیا ہے۔(۱)

طب نبوی سے مراد وہ معالجاتی تدابیر لی جاتی ہیں جو رسول اللہ ﷺ نے بتائی ہیں اور ان دواؤں پر اس کا اطلاق کیا جاتا ہے جو آپ ﷺ نے تجویز فرمائی ہیں۔ ظاہر ہے، اونٹ کے پیشاب سے علاج کی یہ ہدایت بھی طب نبوی میں شامل ہے اور وقتِ ضرورت آج بھی بہ طور دوا اس طریق علاج کو اختیار کیا جاسکتا ہے۔ چند سال قبل عربی زبان میں اس موضوع پر ایک کتاب شائع ہوئی ہے۔ اس کا نام ہے: التداوی بالبان الابل و ابوالھا: سنة نبوية و معجزة طبيبة (اونٹ کے دودھ اور پیشاب سے علاج: ایک نبوی سنت، ایک طبی معجزہ)

ذخیرۂ احادیث میں ایسی کوئی روایت نہیں ملتی ہے، جس سے معلوم ہو کہ یہ رسول اللہ ﷺ کا ایک عارضی حکم تھا، جسے بعد میں آپؐ نے منسوخ کر دیا ہو۔ علامہ ابن القیمؒ نے واقعہ کی تمام تفصیلات بیان کرنے کے بعد لکھا ہے:

وقد ظهر بهذا ان القصة محكمة ليست منسوخة(۲)

''اس تفصیل سے واضح ہوا کہ یہ واقعہ محکم ہے، منسوخ نہیں ہے۔''

---

(۴) محرمات کے ذریعے علاج کے موضوع پر مولانا سید جلال الدین عمری نے اپنی کتاب 'صحت و مرض اور اسلامی تعلیمات' میں تفصیل سے بحث کی ہے اور فقہاء کے اختلافات نقل کرتے ہوئے ان کا عمدہ تجزیہ کیا ہے۔ ملاحظہ کیجیے مذکورہ کتاب کے صفحات: ۲۸۵-۳۲۲، ناشر مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی، طبع ۲۰۰۷ء

(۱) زادالمعاد، ۳/ ۲۸۲

یہ بیان بھی دل چسپی سے خالی نہ ہوگا کہ جن لوگوں کے علاج کے لیے رسول اللہ ﷺ نے اونٹ کا دودھ اور پیشاب تجویز کیا تھا، انھیں کیا مرض تھا؟ اور اس میں بہ طور دوا اونٹ کا دودھ اور پیشاب کس حد تک کارگر ہے؟

احادیث میں ان لوگوں کے مرض کی صراحت موجود نہیں ہے، لیکن ان کی کچھ ایسی علامات مذکور ہیں، جن سے مرض کی تشخیص کی جاسکتی ہے۔ حدیث میں اِجْتَووھَا کا لفظ ہے۔ جویٰ پیٹ کے مرض کو کہتے ہیں۔ نسائی کی روایت میں صراحت ہے کہ ان کے پیٹ بڑھ گئے تھے۔ نسائی اور ابن سعد کی روایت میں یہ بھی مذکور ہے کہ ان کی رنگت زرد پڑ گئی تھی۔ ایک روایت میں ہے کہ ان کے بدن گھل گئے تھے۔ ان علامتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ غالباً انھیں استسقاء (Ascites) کا مرض تھا۔ یہ مرض جگر کی خرابی سے لاحق ہوتا ہے۔ اس میں پیٹ میں پانی جمع ہوجاتا ہے، بدن کم زور ہوجاتا ہے اور رنگت زرد پڑ جاتی ہے۔ بعض روایات میں علاج کے بعد ان لوگوں کی صحت مندی کی تفصیل بھی مذکور ہے۔ ان میں ہے کہ ان کے بدن فربہ ہوگئے تھے اور بدن کی اصل رنگت لوٹ آئی تھی۔

اطباء قدیم نے استسقاء اور امراض جگر میں اونٹ کے دودھ اور پیشاب کے فائدہ مند ہونے کی صراحت کی ہے۔ طب کی ایک مشہور کتاب اندلسی طبیب اور ماہر ادویہ ابن بیطار (م ۱۲۴۸ء) کی الجامع لمفردات الادویۃ والاغذیۃ ہے۔ اس میں ہے:

''اونٹ کا پیشاب استسقاء اور صلابتِ طحال میں مفید ہے، خاص طور پر اس وقت، جب اسے اونٹنی کے دودھ کے ساتھ استعمال کیا جائے۔'' (۱)

ایک طبیب (شریف) کے حوالے سے ابن بیطار نے لکھا ہے:

''اونٹ کا پیشاب اورامِ جگر میں مفید ہے۔'' (۲)

ایک اور طبیب (الیہودی) کے حوالے سے اس نے بیان کیا ہے:

''اونٹنی کا دودھ یرقان، دمہ اور ضیق النفس میں مفید ہے، سدّوں کو کھولتا ہے، جگر کو تروتازہ رکھتا ہے، جسم کو قوی بناتا ہے۔ بہتر ہے کہ استسقاء کے مریض کو اس کا دودھ

---

(۱) الجامع لمفردات الادویۃ والاغذیۃ، ۱/ ۳۴۴

(۲) حوالہ سابق

اور پیشاب ایک ساتھ پلایا جائے۔ اسے عورتوں کی رنگت صاف کرنے کے لیے بھی پلانا چاہیے۔'' (۱)

اس موضوع پر موجودہ دور میں بھی متعدد تحقیقات ہوئی ہیں۔ ایک خاتون ڈاکٹر احلام العوض، معلّمہ کلیۃ التربیۃ، جامعۃ ام القریٰ سعودی عرب نے التداوی بلبن و بول الناقۃ (اونٹنی کے دودھ اور پیشاب سے علاج) کے موضوع پر پی ایچ ڈی کی ہے۔ ایک تحقیقی مقالہ مجلۃ المجلس العلمی للاختصاصات الطبیۃ، ربیع الثانی ۱۴۲۱ھ (۲۰۰۰) میں شائع ہوا ہے، جس کا عنوان ہے: Clinical Trials for the Treatment of Ascites with Camel Urine

ایک کتاب ۲۰۰۳ء میں جناب شہاب البدری یٰسٓ نے عربی زبان میں التداوی بالبان الابل و ابوالھا کے نام سے مرتب کی ہے۔ ان تحریروں میں دودھ اور پیشاب کا کیمیاوی تجزیہ کر کے ان کے مشتملات مع تناسب کی نشان دہی کی گئی ہے اور استسقاء، امراض جگر اور بعض دیگر امراض میں ان کے اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ان میں اس موضوع پر بعض مغربی تحقیقات کا بھی حوالہ موجود ہے۔

گدھی کے دودھ کے بارے میں حدیث میں کوئی صراحت نہیں ملتی ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ ابن شہاب زہریؒ نے اپنے شیخ ابو ادریس خولانیؒ سے اس سلسلے میں دریافت کیا تو انھوں نے جواب دیا: ''ہم تک یہ بات پہنچی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے گدھوں کا گوشت کھانے سے صاف الفاظ میں منع فرمایا ہے۔ جہاں تک ان کے دودھ کا معاملہ ہے، اس سلسلے میں آپؐ سے نہ اجازت منقول ہے نہ ممانعت۔'' (۲) اس روایت کی شرح میں علامہ ابن حجرؒ نے لکھا ہے کہ گدھی کا دودھ جمہور فقہاء کے نزدیک حرام ہے۔(۳) لیکن الموسوعۃ الفقہیۃ میں ہے: ''پالتو گدھی کا دودھ مالکیہ، شافعیہ اور حنابلہ کے نزدیک نجس و حرام اور حنفیہ کے نزدیک مکروہ ہے۔ البتہ عطا، طاؤس اور زہری نے اس کے استعمال کی اجازت دی ہے۔'' (۴)

---

(۱) حوالہ سابق ۳۰/۲۴۱

(۲) بخاری، کتاب الطب، باب البان الاتن ۵۷۸۱ مسلم: ۱۹۳۲

(۳) فتح الباری بشرح صحیح البخاری، المکتبۃ السلفیہ، مصر، ۱۰/۲۴۹

(۴) الموسوعۃ الفقہیۃ، ناشر: وزارۃ الاوقات والشئون الاسلامیۃ، کویت، ۳۵/۱۹۷

کیا منگل کو آپریشن کروانا پسندیدہ نہیں؟

سوال: میرے ایک دوست سعودی عرب میں ملازمت کرتے ہیں۔ انھیں پیٹ میں تکلیف ہوئی۔ ڈاکٹر کو دکھایا تو اس نے جلد از جلد آپریشن کروانے کا مشورہ دیا۔ اگلا دن منگل کا تھا۔ اس دن آپریشن ہوسکتا تھا، مگر میرے دوست کو کسی نے بتا دیا کہ اللہ کے رسول ﷺ نے منگل کو خون بہانے سے منع کیا ہے؛ چنانچہ وہ رک گئے۔ اس طرح ان کے آپریشن میں، جسے جلد از جلد ہونا تھا، کئی روز کی تاخیر ہوگئی۔

بہ راہ کرم مطلع فرمائیے، کیا اس طرح کی کوئی حدیث ہے؟ اگر ہے تو کس پائے کی ہے؟

جواب: اس مضمون کی ایک حدیث سنن ابی داؤد میں مروی ہے۔ اس میں ہے کہ حضرت ابوبکرہؓ کی صاحب زادی کبشۃ (یا کیسہ) کہتی ہیں کہ ان کے والد اپنے گھر والوں کو منگل کے دن حجامۃ (پچھنا لگوانے) سے منع کیا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

یوم الثلاثاء یوم الدم، و فیہ ساعۃ لاَ یرقأ۔

”منگل کا دن خون کا دن ہے۔ اس میں ایک وقت ایسا ہے کہ اگر اس میں خون بہنے لگے تو پھر رکتا نہیں۔“

(حجامۃ ایک طریقۂ علاج ہے، جس میں بعض امراض میں جسم کے کسی حصے پر شگاف لگا کر خون کی کچھ مقدار خارج کی جاتی ہے)۔

اس روایت کو امام ابوداؤد نے اپنی سنن میں کتاب الطب، باب متی تستحب الحجامۃ میں روایت کیا ہے۔ (حدیث نمبر ۳۸۶۲)

لیکن اس روایت کی سند میں ایک راوی بکار بن عبدالعزیز ہے، جس پر محدثین نے نقد کیا ہے۔ یحیٰ بن معین فرماتے ہیں: اس کی روایت کا کوئی اعتبار نہیں۔ ابن عدی اور عقیلی نے اس کا شمار ضعیف راویوں میں کیا ہے۔ علامہ سیوطی نے اس روایت کو اپنی کتاب الموضوعات میں جگہ دی ہے۔ علامہ البانی نے بھی اسے ضعیف قرار دیا ہے۔[1]

دل چسپ بات یہ ہے کہ بعض روایات میں منگل کو پچھنا لگوانے کا حکم مذکور ہے۔ مثلاً

(۱) سلسلۃ الاحادیث الضعیفۃ والموضوعۃ، ۵/۲۷۸، حدیث نمبر: ۲۲۵۱

ایک روایت میں ہے: ''منگل کو پچھنا لگواؤ، کہ یہ خون کا دن ہے۔'' اسے ابونعیم نے اپنی کتاب الطب النبویؐ میں نقل کیا ہے، نیز اس کی روایت ابن ابی حاتم نے اپنی کتاب العلل میں کی ہے اور لکھا ہے کہ میرے والد (ابوحاتم) اسے باطل قرار دیتے تھے۔[۱] اسی طرح ایک روایت میں ہے کہ ''مہینہ کی سترہ تاریخ کو منگل کا دن ہو تو اس دن پچھنا لگوانے سے سال بھر کے امراض سے شفا مل جاتی ہے۔'' یہ روایت بھی ضعیف ہے۔[۲]

علامہ ابن الجوزیؒ نے ان روایات کو نقل کر کے لکھا ہے:

هٰذه الاُحاديث ليس فيها شئ صحيح۔

''ان روایات میں سے کوئی بھی صحیح نہیں۔''

مزید وہ عقیلیؒ کے حوالے سے فرماتے ہیں: ''کسی متعین دن پچھنا لگوانے یا نہ لگوانے کے بارے میں کوئی روایت ثابت نہیں ہے۔'' [۳]

اس تفصیل سے واضح ہوا کہ کسی حدیث کا حوالے دے کر کسی متعین دن آپریشن کروانے سے روکنا صحیح نہیں ہے، کیوں کہ وہ حدیث محدثین کے نزدیک ناقابل اعتبار ہے۔

قرآن کی قسم کھانا

سوال: کیا قرآن کی قسم کھائی جاسکتی ہے؟

جواب: ایک حدیث میں ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا:

مَنْ كَانَ حَالِفًا فَلْيَحْلِفْ بِاللّٰهِ أَوْ لِيَصْمُتْ۔[۴]

''جس کو قسم کھانی ہی ہو وہ صرف اللہ کی قسم کھائے یا خاموش رہے۔''

فقہاء نے لکھا ہے کہ ایسے الفاظ سے قسم کھائی جاسکتی ہے جو اللہ تعالیٰ کی ذات یا صفات پر دلالت کرتے ہیں۔ قرآن حکیم اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ یہ اس کی صفتِ ذاتی ہے۔ اس لیے اس کی قسم کھانا بھی معتبر ہے۔[۵]

---

(۱) حوالہ سابق، ۱۴/ ۶۲۷، حدیث: ۶۷۸۰

(۲) حوالہ سابق، ۳/ ۵۹۷، حدیث: ۱۴۱۰

(۳) الموضوعات، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، ۳/ 215

(۴) بخاری، کتاب الایمان والنذور، باب لاتحلفوا بآبائکم ۶۶۴۶، مسلم: ۱۶۴۶

(۵) الموسوعۃ الفقہیۃ، کویت، ۷/ 256

غیر مسلموں کو قرآن پاک دینے کا مسئلہ

سوال: سیرت کی کتابوں میں یہ مشہور واقعہ درج ہے کہ جب حضرت عمرؓ قبول اسلام سے قبل اپنی بہن بہنوئی کے ہاں گئے اور ان سے مار پیٹ کرنے کے بعد اپنی بہن سے صحیفہ پڑھنے کی درخواست کی تو بہن نے کہا کہ آپ شرک کی نجاست کی وجہ سے ناپاک ہیں، اس لیے غسل کرنے کے بعد ہی اس صحیفے کو ہاتھ لگا سکتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے نہا دھو کر سورۂ طٰہٰ کی تلاوت کی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غیر مسلموں کو قرآن کریم کا نسخہ نہیں دینا چاہیے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ہم قرآن پاک کسی مشرک کے ہاتھ میں دیتے ہیں تو کیا گناہ کا ارتکاب نہیں کرتے؟ اس کو اگر ہم غسل کر کے ہاتھ لگانے کی ہدایت دیں تو کیا یقینی ہے کہ وہ ہماری بات پر عمل کرے گا؟ اگر ہم انھیں قرآن پاک نہ دیں تو پھر قرآن کا پیغام ان تک کیوں کر پہنچایا جائے؟ آج کل جماعت اسلامی ہند اکثر غیر مسلموں میں قرآن کریم کے نسخے تقسیم کر رہی ہے۔ اس مسئلے کا کیا حل ہے؟ بہ راہ کرم وضاحت فرمائیں۔

جواب: غیر مسلموں تک اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچانا امت مسلمہ کی ذمے داری ہے۔ اس کے لیے ہر ممکن تدبیر اختیار کرنی چاہیے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ حالتِ جنگ میں بھی حسب موقع کوتاہی نہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے:

وَ اِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ ۟

(التوبۃ:٦)

''اور اگر مشرکین میں سے کوئی شخص پناہ مانگ کر تمھارے پاس آنا چاہے (تاکہ اللہ تعالیٰ کا کلام سنے) تو اسے پناہ دے دو، یہاں تک کہ وہ اللہ تعالیٰ کا کلام سن لے۔ پھر اسے اس کے مامن تک پہنچا دو۔ یہ اس لیے کرنا چاہیے کہ یہ لوگ علم نہیں رکھتے۔''

اس آیت کی رو سے مطلوب و مقصود یہ ہے کہ غیر مسلموں تک اللہ تعالیٰ کا کلام پہنچے، خواہ وہ اسے سنیں یا پڑھیں، دونوں تدبیریں اختیار کی جا سکتی ہیں۔ سیرت نبویؐ کے مطالعے سے

معلوم ہوتا ہے کہ صلح حدیبیہ کے بعد ۷ ھ میں اللہ کے رسول ﷺ نے مختلف سلاطین وامراء کے نام خطوط لکھے اور ان تک اسلام کا پیغام پہنچایا۔ ان خطوط میں قرآن کریم کی آیات بھی درج تھیں۔ مثلاً آپؐ نے شہنشاہِ روم ہرقل کو جو خط بھیجا تھا اس میں سورۂ آل عمران کی آیت ۶۴ درج تھی:

یَاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَاءٍۭ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ...... الآیۃ۔

آپؐ نے یہ احتیاط نہیں فرمائی کہ وہ خط غیر مسلم کے ہاتھ میں جائے گا، اس لیے اس میں قرآن حکیم کی آیت تحریر نہ کریں۔

بعض حضرات غیر مسلموں کو قرآن کریم نہ دینے پر اس سے بھی استدلال کرتے ہیں کہ قرآن حکیم میں ان کو ناپاک کہا گیا ہے:

اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ (التوبۃ:۲۸) ''مشرکین ناپاک ہیں۔''

لیکن ان کی یہ دلیل صحیح نہیں ہے۔ آیت میں نجاست سے مراد جسمانی اور مادی گندگی نہیں ہے، بلکہ عقیدہ کی خرابی اور شرک کی آلودگی ہے۔ مشہور محدث امام نوویؒ فرماتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: مشرکین نجس ہیں، اس سے مراد عقیدے کی نجاست اور گندگی ہے۔ یہ مراد نہیں ہے کہ ان کے اعضاء پیشاب پاخانہ جیسی چیزوں کی طرح نجس ہیں۔ اس پر تمام مسلمانوں کا اجماع ہے۔''(۱)

کسی غیر مسلم کو پورا قرآن دیا جائے یا کسی کاغذ پر لکھی ہوئی قرآن کی ایک آیت، دونوں کا حکم برابر ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا عمل ہمارے لیے حجت ہے۔ حضرت عمرؓ کی بہن کے عمل کے پیش نظر ہمیں چاہیے کہ غیر مسلم کو قرآن کریم دیتے وقت اس سے کہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، اس لیے اس کا تقاضا ہے کہ صفائی ستھرائی کے ساتھ اور پاکی کی حالت میں اسے پڑھا جائے۔ عموماً غیر مسلم بڑے ادب واحترام کے ساتھ اسے قبول کرتے ہیں۔ اس لیے امید رکھنی چاہیے کہ پڑھتے وقت بھی وہ اس کا ادب ملحوظ رکھیں گے۔ ویسے بھی غیر مسلم پہلے ایمان کے مکلّف ہیں، پھر جزئی احکام دین کے۔ ایمان لانے سے قبل وہ جزئی احکام کے مکلّف نہیں ہیں۔

---

(۱) شرح مسلم للنووی، باب الدلیل علی ان المسلم لاینجس

سورۂ فاتحہ میں آیتوں کی تعداد

سوال: قرآن مجید کے آغاز میں سورۂ فاتحہ میں کل کتنی آیتیں ہیں؟ اس سلسلے میں سعودی عرب سے طبع ہونے والے نسخوں اور ہندوستان میں طبع ہونے والے نسخوں میں فرق نظر آتا ہے۔ اسی کو موضوع بحث بنا کر قادیانی مبلغین مسلم نوجوانوں میں شکوک وشبہات پیدا کر رہے ہیں۔ لہٰذا آپ سے التماس ہے کہ قرآن وحدیث کی روشنی میں تشفی بخش جواب مرحمت فرمائیں۔

جواب: قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو مخاطب کر کے فرمایا ہے:

وَلَقَدْ اٰتَیْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِیْمَ ○ (الحجر:۸۷)

''ہم نے تم کو سات ایسی آیتیں دے رکھی ہیں جو بار بار دہرائی جانے کے لائق ہیں اور تمھیں قرآن عظیم عطا کیا ہے۔''

صحیح حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے سورۂ فاتحہ ہی کو 'سبع مثانی' قرار دیا ہے[۱]

اس بنا پر تمام مسلمانوں کے درمیان یہ بات متفق علیہ ہے کہ سورۂ فاتحہ میں سات آیتیں ہیں۔ اختلاف صرف اس بات میں ہے کہ سورۂ فاتحہ کے شروع میں لکھی جانے والی بسم اللہ الرحمن الرحیم اس کا جزء ہے یا نہیں؟ جمہور قراء مکہ وکوفہ اسے سورۂ فاتحہ کی ایک آیت مانتے ہیں، جب کہ قراء مدینہ کے نزدیک یہ آیت تو ہے، مگر سورۂ النمل کی آیت نمبر ۳۰ ہے، سورۂ فاتحہ کے شروع میں درج بسم اللہ الرحمن الرحیم اس کا جزء نہیں ہے[۲]

جو حضرات بسم اللہ الرحمن الرحیم کو سورۂ فاتحہ کی پہلی آیت قرار دیتے ہیں وہ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ سے وَلَا الضَّآلِّیْنَ تک ایک آیت مانتے ہوئے اسے سورہ کی ساتویں آیت کہتے ہیں، لیکن جو حضرات اسے سورۂ فاتحہ کا جزء نہیں قرار دیتے اور اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ کو پہلی آیت کہتے ہیں وہ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ کو چھٹی آیت اور بعد کے جزء کو ساتویں آیت قرار دیتے ہیں۔

---

(۱) بخاری، کتاب التفسیر، سورۃ الفاتحہ ۴۴۷۴، ترمذی: ۳۱۲۵ وغیرہ

(۲) تفسیر ابن کثیر، دار طیبۃ، ۱۰۱/۱

اس اختلاف سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس لیے کہ کوئی بھی سورۂ فاتحہ کے کسی جزء کو قرآن حکیم سے خارج نہیں کرتا، صرف نمبر شمار کا مسئلہ ہے۔

کیا غور و تدبر کا تعلق دل سے ہے؟

سوال: سورۂ محمد کی آیت نمبر ۲۴ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اَفَلاَ یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُھَا٥

''کیا یہ لوگ قرآن پر غور و تدبر نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر تالے پڑے ہوئے ہیں؟''

عام طور پر غور و فکر اور تدبر کا تعلق دماغ سے سمجھا جاتا ہے۔ لیکن اس آیت مبارکہ سے پتا چلتا ہے کہ اگر دلوں پر قفل پڑے ہوں تو انسان قرآن مجید پر غور و فکر اور تدبر نہیں کر پاتا۔ ازراہِ کرم وضاحت فرمائیں کہ قرآن مجید میں غور و فکر اور تدبر کے ضمن میں انسانی دل کس طرح اپنا کردار نبھاتا ہے؟

جواب: قرآن کریم میں کثرت سے ایسی آیتیں ہیں جن میں آخرت اور دیگر عقائد پر استدلال کرتے ہوئے انسانوں کو غور و تدبر کا حکم دیا گیا ہے اور ان لوگوں کی مذمت کی گئی ہے جو اندھے بہرے بنے رہتے ہیں اور عقل کو کام میں نہیں لاتے۔ کہا گیا ہے کہ مختلف مظاہر کائنات، خود انسان کے وجود اور تاریخ میں کثرت سے نشانیاں ہیں، ان لوگوں کے لیے جو عقل و تدبر سے کام لیتے ہیں۔ ان کے لیے قَوْمٌ یَّعْقِلُوْنَ، قَوْمٌ یَّتَفَکَّرُوْنَ، قَوْمٌ یَّفْقَھُوْنَ، قَوْمٌ یَذَّکَّرُوْنَ، اُوْلِی الْاَلْبَابِ، اُوْلِی الْاَبْصَارِ، اُوْلِی النُّھٰی اور ذِیْ حِجْرٍ کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ اسی طرح تعقل و تفکر پر ابھارنے کے لیے اَفَلاَ تُبْصِرُوْنَ، اَفَلاَ تَعْقِلُوْنَ، اَفَلاَ یَتَدَبَّرُوْنَ، اَفَلاَ تَذَکَّرُوْنَ، اور اَفَلاَ تَتَفَکَّرُوْنَ جیسے الفاظ لائے گئے ہیں۔(۱)

قرآن کریم میں آیتِ مذکور کے علاوہ متعدد آیات ایسی ہیں، جن میں علم، عقل، ذکر، فقہ اور تدبر وغیرہ کو قلب کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ مثلاً:

---

(۱) قرآن کریم میں تفکر و تدبر پر کتنا زور دیا گیا ہے اس پر تحقیقی بحث کے لیے ملاحظہ کیجیے عقلیاتِ قرآن کریم، ڈاکٹر فاطمہ اسماعیل مصری، ترجمہ ڈاکٹر عبید اللہ فہد فلاحی، ادارۂ علوم اسلامیہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ۲۰۱۰ء

اَفَلَمۡ یَسِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ فَتَکُوۡنَ لَہُمۡ قُلُوۡبٌ یَّعۡقِلُوۡنَ بِہَاۤ

(الحج:۴۶)

''کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں، جن سے ان کے دل ایسے ہو جائیں کہ ان سے سمجھنے لگیں...''

لَہُمۡ قُلُوۡبٌ لَّا یَفۡقَہُوۡنَ بِہَا (الاعراف:۱۷۹)

''ان کے پاس دل ہیں، مگر وہ اس سے سوچتے نہیں۔''

وَ طَبَعَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوۡبِہِمۡ فَہُمۡ لَا یَعۡلَمُوۡنَ ○ (التوبۃ:۹۳)

''اور اللہ نے ان کے دلوں پر ٹھپہ لگا دیا، اس لیے اب یہ کچھ نہیں جانتے۔''

اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَذِکۡرٰی لِمَنۡ کَانَ لَہٗ قَلۡبٌ اَوۡ اَلۡقَی السَّمۡعَ وَ ہُوَ شَہِیۡدٌ ○ (ق:۳۷)

''اس (تاریخ) میں عبرت کا سبق ہے ہر اس شخص کے لیے جو دل رکھتا ہو یا جو توجہ سے بات کو سنے۔''

ویسے قرآن میں قلب، قلبین اور قلوب کے الفاظ ۱۳۲ مرتبہ استعمال ہوئے ہیں اور بیش تر مقامات پر ان کی طرف علم و عقل اور غور و تدبر کی صفات کی نسبت کی گئی ہے۔ اسی وجہ سے قدیم مفسرین اس طرح کی بات لکھ گئے ہیں کہ علم و عقل کا محل قلب ہے۔ امام رازیؒ فرماتے ہیں:

''میرے نزدیک قلب خیال اور تدبر سے کنایہ ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَذِکۡرٰی لِمَنۡ کَانَ لَہٗ قَلۡبٌ (اس میں عبرت کا سبق ہے ہر اس شخص کے لیے جو دل رکھتا ہو) بعض لوگوں کے نزدیک تفکر کا محل دماغ ہے، لیکن اللہ تعالیٰ یہ واضح کر رہا ہے کہ اس کا محل سینہ ہے... کیا آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ عقل ہی علم ہے اور علم کا محل دل ہے؟ اس کا جواب ہے: ہاں، اس لیے کہ ارشاد باری تعالیٰ یَعۡقِلُوۡنَ بِہَا سے مقصود علم ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ قلب اس عقل کا آلہ ہے، اس لیے اسے عقل کا محل ماننا ضروری ہے۔'' (۱)

میڈیکل سائنس میں دل اور دماغ کا شمار اعضائے رئیسہ یعنی جسم انسانی کے انتہائی اہم

(۱) التفسیر الکبیر، دار احیاء التراث العربی، ۴۵/۱۲

کام انجام دینے والے اعضا میں ہوتا ہے۔ان سے الگ الگ کام متعلق ہیں۔دل سینے میں پایا جانے والا ایک عضو ہے، جو دورانِ خون کا نظام کنٹرول کرتا ہے۔ اس کی انقباضی و انبساطی حرکات سے خون پورے بدن میں، ہر عضو اور ہر خلیہ میں پہنچتا ہے، پھر واپس دل میں آتا ہے۔ دماغ حس وحرکات کا مبدأ ہے اور وہ تعقل وتفکر اور استنباط و استنتاج کی بھی خدمت انجام دیتا ہے۔لیکن زبان وادب کا معاملہ دوسرا ہے۔اس میں لفظ 'دل' اس معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے جس میں وہ علم تشریح (Anatomy) میں مستعمل ہے اور اس کا استعمال تعقل وادراک کی خدمت انجام دینے والے عضو کی حیثیت سے بھی ہوتا ہے۔عربی زبان میں بھی لفظ 'قلب' مذکورہ دونوں معنوں میں استعمال ہوتا تھا۔اسی لیے قرآن کریم نے بھی اسے انہی معانی میں استعمال کیا۔ماضی قریب کے مفسر شیخ طاہر بن عاشور تیونسی (م ۱۹۷۳ء) نے آیت خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ (البقرۃ:٦) کی تفسیر میں لکھا ہے:

> ''یہاں قلوب سے مراد عقول ہیں۔اہل عرب قلب کا اطلاق جسم انسانی میں پائے جانے والے صنوبری شکل کے عضو پر بھی کرتے تھے اور ادراک وعقل پر بھی۔انسانوں کے تعلق سے انھوں نے اسے صرف انہی دو معانی میں استعمال کیا ہے اور حیوانات میں بھی اس کا اکثر استعمال انہی دو معانی میں ہوا ہے۔یہاں اس سے مراد ادراک و عقل ہے۔یقیناً اس کا مرکز دماغ ہے،لیکن قلب ہی اس کو وہ قوت بہم پہنچاتا ہے جس سے ادراک کا عمل انجام پاتا ہے۔'' (۱)

ڈاکٹر محمد الشرقاوی نے قرآن میں لفظ 'قلب' کے استعمالات سے بحث کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''اس بات کی طرف اشارہ کردینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ لفظ 'قلب' کا استعمال اگرچہ قرآن کریم میں ایک سوتیس سے زائد مقامات پر ہوا ہے،لیکن کسی جگہ بھی وہ طبی تشریحی (Medical Anatomical) معنی میں نہیں آیا ہے۔ بلکہ اس سے مراد ادراک ومعرفت کا ایک ایسا انتہائی پیچیدہ نظام لیا گیا ہے جو متعدد، متنوع اور باہم مربوط افعال انجام دیتا ہے۔وہ ایسی منفرد خصوصیات رکھتا ہے،جن میں جسم انسانی کی دیگر صلاحیتیں اس کی شریک نہیں ہیں۔قرآن نے اس کے مفوضہ کاموں میں سے دو کا

---

(۱) التحریر والتنویر، طاہر بن عاشور، تیونس، ۱۹۸۴ء، ۱/۲۵۵

تذکرہ خصوصیت سے کیا ہے: ایک ادراک، معرفت اور علم ہے اور دوسرا ایمان اور اس سے متعلق جذبہ، وجدان اور ارادہ ہے۔'' (۱)

ایک دوسرے محقق ڈاکٹر محمد علی الجوزو رقم طراز ہیں:

'' قلب کا لفظ قرآن کریم میں ۱۳۲ر آیات میں استعمال ہوا ہے، جو نفس انسانی کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو کرتی ہیں۔ کبھی معلوم ہوتا ہے کہ ہم عقل کی کسی صورت کے سامنے یا خود عقل کے سامنے ہیں، کبھی جذبات و احساسات اور وجدانی شعور کے سامنے اپنے کو موجود پاتے ہیں اور کبھی ایسا نظر آتا ہے کہ عقلی و جذباتی پہلوؤں کی جامع تصویر سامنے ہے۔'' (۲)

یہ صرف عربی ہی کا معاملہ نہیں ہے، بل کہ دیگر زبانوں میں بھی یہی استعمالات ہیں۔ مثال کے طور پر اردو زبان میں لفظ 'دل' جہاں جسم انسانی میں پائے جانے والے عضو کے لیے بولا جاتا ہے وہیں ادراک، معرفت، احساس، خیال اور ارادے کے افعال بھی اس کی طرف منسوب کیے جاتے ہیں۔ مثلاً دل برداشتگی، دل بستگی، دل پزیری، دل پسندی، دل جمعی، دلچسپی، دل دہی، دل سوزی، دل شکستگی، دل فریبی، دل کشی، دل گرفتگی، دل اچاٹ ہونا، دل باغ باغ ہونا، دل بجھنا، دل بھر آنا، دل پگھلنا، دل پھسلنا، دل دہل جانا، دل مچلنا، دل موہ لینا، دل میں آنا وغیرہ۔

قرآن کریم میڈیکل سائنس کی کتاب نہیں ہے، بلکہ کتاب ہدایت ہے۔ وہ اس زبان میں کلام کرتا ہے جسے عام انسان آسانی سے سمجھ سکیں اور الفاظ کے وہی معانی مراد لیتا ہے جن کی طرف لوگوں کے ذہن فوراً منتقل ہوسکیں۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے اپنی شہرۂ آفاق تفسیر تفہیم القرآن میں آیت أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَتَكُونَ لَهُمْ قُلُوبٌ يَعْقِلُونَ بِهَا (الحج:۴۶) کی تفسیر میں لکھا ہے:

'' خیال رہے کہ قرآن سائنس کی زبان میں نہیں، بلکہ ادب کی زبان میں کلام کرتا ہے۔ یہاں خواہ مخواہ ذہن اس سوال میں نہ الجھ جائے کہ سینے والا دل کب سوچا کرتا ہے۔ ادبی زبان میں احساسات، جذبات، خیالات، بلکہ قریب قریب تمام ہی افعالِ دماغ،

(۱) تأملات حول و سائل الادراک فی القرآن الکریم، عالم الکتب، الریاض، ص ۴۳
(۲) مفهوم العقل والقلب فی القرآن والسنة، ڈاکٹر محمد علی الجوزو، دار العلم للملایین، بیروت، ۱۹۸۳ء، ص ۱۸۶

سینے اور دل ہی کی طرف منسوب کیے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ کسی چیز کے 'یاد ہونے' کو بھی یوں کہتے ہیں کہ 'وہ تو میرے سینے میں محفوظ ہے۔'' (۱)

اوپر جو سوال درج کیا گیا ہے اسی طرح کا سوال ایک صاحب نے مولانا مودودیؒ سے کیا تھا۔ وہ سوال اور مولانا کا جواب دونوں کو ذیل میں درج کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے:

سوال: خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ سے معاً یہ خیال آتا ہے کہ گویا دل خیالات کی ایک جلوہ گاہ (Agency) ہے۔ شاید اس زمانے میں جالینوس کے نظریات کے تحت 'دل' کو سرچشمۂ افکار (Originator of Thought) سمجھا جاتا تھا۔ لیکن آج کل طبی تحقیق سے ثابت ہو چکا ہے کہ دل صرف دورانِ خون کو جاری رکھنے والا ایک عضو ہے اور ہر قسم کے خیالات اور حسیات اور ارادے اور جذبات کا مرکز دماغ ہے۔ اس تحقیق کی وجہ سے ہر اس موقع پر الجھن پیدا ہوتی ہے جہاں دل سے کوئی ایسی چیز منسوب کی جاتی ہے جس کا تعلق حقیقت میں دماغ سے ہوتا ہے۔

جواب: دل کا لفظ ادب کی زبان میں کبھی اس معنی میں استعمال نہیں ہوا ہے، جس میں یہ لفظ علم تشریح اور علم وظائف الاعضاء (Physiology) میں استعمال ہوتا ہے۔ ادب میں دماغ Creation کی نمائندگی کرتا ہے اور اس کے برعکس دل جذبات وحسیات اور خواہش و ارادے کا مرکز مانا جاتا ہے۔ ہم رات دن بولتے ہیں کہ میرا دل نہیں مانتا، میرے دل میں خیال آیا، میرا دل یہ چاہتا ہے۔ انگریزی میں Qualities of head and heart کا فقرہ کثرت سے استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ الفاظ بولتے وقت کوئی شخص بھی علم تشریح والا دل مراد نہیں لیتا ہے۔ ممکن ہے کہ اس کا آغاز اسی نظریے کے تحت ہوا ہو جو جالینوس کی طرف منسوب ہے، لیکن ادب میں جو الفاظ رائج ہو جاتے ہیں، وہ بسا اوقات اپنے ابتدائی معنی کے تابع نہیں رہتے۔'' (۲)

قرآن کریم میں اس معنی کے لیے 'فؤاد' اور اس کی جمع 'افئدة' کے الفاظ کا بھی استعمال ہوا ہے:

اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا۝
(بنی اسرائیل: ۳۶)

''یقیناً کان، آنکھ اور دل سب ہی کی باز پرس ہونی ہے۔''

---

(۱) تفہیم القرآن، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی، ۳/ ۲۳۶، سورۂ الحج، حاشیہ ۹۱

(۲) رسائل ومسائل، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی، ۲۰۰۶ء، ۲/ ۲۵۸-۲۵۹

وَ جَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ ط (السجدة:۹)

''اور تم کو کان، آنکھ اور دل دیے۔''

اس کا ترجمہ بھی اردو میں 'دل' سے کیا جاتا ہے۔ لیکن اس کے طبی معنی نہیں، بلکہ ادبی معنی مراد ہوتے ہیں۔ مولانا مودودیؒ نے لکھا ہے:

''دل سے مراد وہ 'ذہن' (Mind) ہے جو حواس کے ذریعے سے حاصل شدہ معلومات کو مرتب کر کے ان سے نتائج نکالتا ہے اور عمل کی مختلف امکانی راہوں میں سے کوئی راہ منتخب کرتا اور اس پر چلنے کا فیصلہ کرتا ہے۔'' (۱)

قرآن کریم میں ایک لفظ 'صدر' (سینہ) کا بھی استعمال اسی معنی میں ہوا ہے۔ گویا قلب، فؤاد اور صدر تینوں الفاظ قرآن میں نیت و ارادہ، تعقل و تفکر، غور و تدبر، جذبہ و خواہش اور علم و ادراک کے مراکز کے طور سے استعمال ہوئے ہیں۔ اور یہ استعمال ادبی حیثیت سے بالکل درست ہے اور آج بھی دنیا کے تمام خطوں میں اور تمام زبانوں میں معروف ہے۔ یہ تشریح مولانا مودودیؒ کے مکاتیب میں بھی ایک جگہ ملتی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے:

''قرآن مجید چونکہ سائنس کی زبان میں نہیں، بلکہ ادب کی زبان میں نازل ہوا ہے، اس لیے وہ قلب، فؤاد اور صدر کے الفاظ اسی طرح ادبی طرز میں استعمال کرتا ہے، جس طرح تمام دنیا کی زبانوں میں یہ الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ مثلاً اردو میں ہم کہتے ہیں کہ 'اس بات کو میرا دل نہیں مانتا' یا 'فلاں شخص کا سینہ بے کینہ ہے' یا انگریزی میں Heart Searching اور Qualities of Head and Heart کے الفاظ بولے جاتے ہیں۔ اس سے خود بہ خود یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ قلب، فؤاد اور صدر سے مراد علم، شعور، جذبات، ارادوں، نیتوں اور خواہشات کے مراکز ہیں۔ ادب کی زبان میں اس مقصد کے لیے دماغ کا لفظ کم اور دل کا لفظ زیادہ استعمال ہوتا ہے، بلکہ دماغ کے بجائے زیادہ تر 'سر' کا لفظ بولتے ہیں، جیسے سرِ پر غرور، یا فلاں شخص سر پھرا ہے۔'' (۲)

---

(۱) تفہیم القرآن، ۴/۴۲، سورہ السجدۃ، حاشیہ ۱۷

(۲) مکاتیب سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، مکتبہ ذکریٰ رام پور، ۱۹۸۴ء جلد دوم ص ۳۶۹، مکتوب نمبر: ۲۶۰

بعثتِ انبیاء کا مقصد

سوال: سورۃ الحدید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَ اَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ (الحدید:۲۵)

''ہم نے اپنے رسولوں کو صاف صاف نشانیوں اور ہدایات کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کی، تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں۔''

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ زندگی کی حد تک قیام عدل و انصاف ہی رسولوں کی بعثت کا مقصد ہے۔ عام طور پر پایا جانے والا یہ خیال ناقص ہے کہ بعثتِ رسل کی غرض ایک اللہ کی پرستش کرنے اور دوسروں کو غیر اللہ کی پرستش سے روکنے تک محدود ہے۔ دوسری طرف قرآن حکیم کی بہت سی آیات اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ ایمان تقویٰ کی پیدائش کا ذریعہ ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایمان خود مطلوب نہیں، بلکہ بطور وسیلہ مطلوب ہے۔

بہ راہ کرم وضاحت فرمائیں۔ کیا میری یہ سوچ درست ہے؟

جواب: سورۃ الحدید کی مذکورہ بالا آیت میں انبیاء علیہم السلام کی بعثت اور کتابِ الٰہی کے نزول کا مقصد یہ بیان کیا گیا ہے کہ ''لوگ انصاف پر قائم ہوں۔'' اوپر درج شدہ سوال میں اس آیت کے حوالے سے قیامِ انصاف کو بہت سادہ مفہوم میں لیا گیا ہے۔ قیام انصاف صرف یہی نہیں ہے کہ سماج میں امن و امان ہو، لوگ ایک دوسرے پر ظلم نہ کریں اور ایک دوسرے کے حقوق غصب نہ کریں، بلکہ قیام انصاف کا تعلق انسان کی انفرادی زندگی سے بھی ہے۔ اس دنیا میں انسان سے مطلوب یہ ہے کہ وہ اللہ کی عبادت کرے:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ۝ (الذاریات:۵۶)

''میں نے جن اور انسانوں کو اس سے سوا کسی کام کے لیے پیدا نہیں کیا ہے کہ وہ میری بندگی کریں۔''

اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی انسان اللہ کی عبادت نہیں کرتا تو وہ انصاف پر عمل پیرا

نہیں ہے اور جو انسان اپنی انفرادی زندگی میں انصاف پر قائم نہیں رہ سکتا، اس سے اجتماعی زندگی میں قیام انصاف کی کیوں کر امید کی جاسکتی ہے۔ علامہ آلوسیؒ نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے:

"رسولوں کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کرنے کی علت عدل وقسط کے قیام کو قرار دیا گیا ہے۔ اس سے یہ کہنا مقصود ہے کہ میزان کے استعمال کے ذریعے انسانوں کے باہمی تعلقات اور کتاب پر عمل کے ذریعے اخروی امور دونوں کا درجہ برابر کا ہے۔ 'قسط' ایک جامع لفظ ہے۔ اس میں وہ تمام چیزیں شامل ہیں، جن سے متصف ہونا دنیا اور آخرت کے تعلق سے ضروری ہے۔" (۱)

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے اس نکتے کی بہت اچھی طرح وضاحت اور عمدہ تشریح کی ہے۔ فرماتے ہیں:

"انبیاء علیہم السلام کو جس مقصد کے لیے بھیجا گیا وہ یہ تھا کہ دنیا میں انسان کا رویہ اور انسانی زندگی کا نظام فرداً فرداً بھی اور اجتماعی طور پر بھی، عدل پر قائم ہو۔ ایک طرف ہر انسان اپنے خدا کے حقوق، اپنے نفس کے حقوق اور ان تمام بندگانِ خدا کے حقوق، جن سے اس کو کسی طور پر سابقہ پیش آتا ہے، ٹھیک ٹھیک جان لے اور پورے انصاف کے ساتھ ان کو ادا کرے۔ اور دوسری طرف اجتماعی زندگی کا نظام ایسے اصولوں پر تعمیر کیا جائے جن سے معاشرے میں کسی نوعیت کا ظلم باقی نہ رہے، تمدن وتہذیب کا ہر پہلو افراط وتفریط سے محفوظ ہو، حیاتِ اجتماعی کے تمام شعبوں میں صحیح صحیح توازن قائم ہو اور معاشرے کے تمام عناصر انصاف کے ساتھ اپنے حقوق پائیں اور اپنے فرائض ادا کریں۔ بہ الفاظ دیگر انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا مقصود عدلِ انفرادی بھی تھا اور عدلِ اجتماعی بھی۔ وہ ایک ایک فرد کی شخصی زندگی میں بھی عدل قائم کرنا چاہتے تھے، تاکہ اس کے ذہن، اس کی سیرت، اس کے کردار اور اس کے برتاؤ میں توازن پیدا ہو اور انسانی معاشرے کے پورے نظام کو بھی عدل پر قائم کرنا چاہتے تھے، تاکہ فرد اور جماعت دونوں ایک دوسرے کی روحانی، اخلاقی اور مادی فلاح میں مانع ومزاحم ہونے کے بجائے معاون ومددگار رہوں۔" (۲)

ایک چیز یہ بھی ملحوظ رکھنی ضروری ہے کہ قرآن حکیم کی کسی آیت سے ایسا مفہوم اخذ کرنا

(۱) روح المعانی، ۲۰/۴۱۳، تفسیر آیت مذکور

(۲) تفہیم القرآن، جلد پنجم، ص: ۳۲۲

درست نہ ہوگا، جو دیگر آیات اور قرآن مجید کی مجموعی تعلیمات سے ٹکراتا ہو۔ سوال میں جس چیز کو ناکافی خیال کیا گیا ہے، وہ قرآن حکیم کی بہت سی آیات سے ثابت ہے اور سورۂ حدید کی آیت سے جو یک طرفہ نتیجہ نکالا گیا ہے، قرآن حکیم کی بہت سی آیات سے اس کی تردید ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر ذیل میں صرف ایک آیت درج کی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَ لَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ج (النحل:۳۶)

''ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیج دیا (اور اس کے ذریعے سے سب کو خبردار کر دیا) کہ ''اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت کی بندگی سے بچو۔''

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو بھیجا ہی اس مقصد سے گیا ہے کہ وہ انسانوں کو صرف اللہ کی عبادت کرنے اور غیر اللہ کی عبادت سے دور رہنے کی دعوت دیں۔

سوال میں اصل مطلوب، بہ طور وسیلہ مطلوب اور اثرات کو گڈمڈ کر دیا گیا ہے۔ یہ کہنا صحیح نہیں کہ ''ایمان تقویٰ کی پیدائش کا ذریعہ ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ایمان خود مطلوب نہیں، بل کہ بہ طور وسیلہ مطلوب ہے۔'' اس کی بجائے یوں کہنا چاہیے کہ ''اصل مطلوب ایمان ہے، اس کے نتیجے میں تقویٰ پیدا ہوتا ہے۔ گویا تقویٰ ایمان کے ثمرات میں سے ہے۔'' اس کو ایک مثال سے سمجھا جاسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ط (العنکبوت:۴۵)

''یقیناً نماز فحش اور برے کاموں سے روکتی ہے۔''

اس آیت کی روشنی میں یہ بات کہنی صحیح نہ ہوگی کہ نماز فحش اور برے کاموں سے روکنے کا ذریعہ ہے، اس لیے ان کاموں سے رکنا اصل مطلوب ہے اور نماز بہ طور وسیلہ مطلوب۔ بلکہ اس کا صحیح مطلب یہ ہے کہ نماز مطلوب ہے۔ صحیح طریقے سے نماز پڑھی جائے تو اس کے اثرات یہ ظاہر ہوں گے کہ انسان فحش اور برے کاموں سے رک جائے گا۔ یہی بات زیر بحث مسئلہ میں کہی جائے گی۔ اصل مطلوب یہ ہے کہ انسان صرف اللہ کی عبادت کرے اور غیر اللہ کی پرستش سے رک جائے۔ جو شخص ایسا کرے گا وہ لازماً قیام انصاف پر بھی عمل پیرا ہوگا۔

ایک آیت کا مفہوم

سوال: سورۂ الدہر کی ایک آیت ہے:

نَحۡنُ خَلَقۡنٰهُمۡ وَ شَدَدۡنَاۤ اَسۡرَهُمۡ ۚ وَ اِذَا شِئۡنَا بَدَّلۡنَاۤ اَمۡثَالَهُمۡ تَبۡدِيۡلًا ۝ (آیت:۲۸)

''ہم نے ہی ان کو پیدا کیا ہے اور ان کے جوڑ بند مضبوط کیے ہیں، اور ہم جب چاہیں ان کی شکلوں کو بدل کر رکھ دیں۔''

اس آیت کی تشریح میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے لکھا ہے:

''اصل الفاظ ہیں: اِذَا شِئۡنَا بَدَّلۡنَاۤ اَمۡثَالَهُمۡ تَبۡدِيۡلًا۔ اس فقرے کے کئی معنیٰ ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ ہم جب چاہیں انھیں ہلاک کر کے انہی کی جنس کے دوسرے لوگ ان کی جگہ لا سکتے ہیں، جو اپنے کردار میں ان سے مختلف ہوں۔ دوسرے یہ کہ ہم جب چاہیں ان کی شکلیں تبدیل کر سکتے ہیں، یعنی جس طرح ہم کسی کو تندرست اور سلیم الاعضاء بنا سکتے ہیں اسی طرح ہم اس پر بھی قادر ہیں کہ کسی کو مفلوج کر دیں، کسی کو لقوہ مار جائے اور کوئی کسی بیماری یا حادثے کا شکار ہو کر اپاہج ہو جائے۔ تیسرے یہ کہ ہم جب چاہیں موت کے بعد ان کو دوبارہ کسی اور شکل میں پیدا کر سکتے ہیں۔'' (۱)

مولانا مودودیؒ نے اپنی تشریح میں آیت کے جو تیسرے معنیٰ بتائے ہیں، کیا اس سے برادرانِ وطن کے 'پنر جنم' کے عقیدے کا اثبات نہیں ہوتا؟

جواب: اس آیت میں آخرت کا انکار کرنے والوں کو دھمکی دی گئی ہے اور اس سے اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کا بھرپور اظہار ہوتا ہے۔ مفسرینِ کرام نے اس کی تشریح کرتے ہوئے توضیحِ مدّعا کے لیے دیگر آیات بھی پیش کی ہیں۔

اس آیت کے ایک معنیٰ یہ ہو سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوقات میں سے کسی کا محتاج نہیں ہے، وہ چاہے تو کسی کو ہلاک کر کے اس کی جگہ دوسرے کو لے آئے۔ اس مضمون کی قرآن میں متعدد آیات ہیں۔ مثلاً:

---

(۱) تفہیم القرآن، ۶/ ۲۰۳-۲۰۴

اِنۡ یَّشَاۡ یُذۡهِبۡكُمۡ اَیُّهَا النَّاسُ وَ یَاۡتِ بِاٰخَرِیۡنَ ؕ وَ کَانَ اللّٰهُ عَلٰی ذٰلِكَ قَدِیۡرًا ○ (النساء:۱۳۳)

''اگر وہ چاہے تو تم لوگوں کو ہٹا کر تمھاری جگہ دوسروں کو لے آئے اور وہ اس کی پوری قدرت رکھتا ہے۔''

وَ اِنۡ تَتَوَلَّوۡا یَسۡتَبۡدِلۡ قَوۡمًا غَیۡرَکُمۡ ۙ ثُمَّ لَا یَکُوۡنُوۡۤا اَمۡثَالَکُمۡ ○ (محمد:۳۸)

''اگر منہ موڑو گے تو اللہ تمھاری جگہ کسی اور قوم کو لے آئے گا اور وہ تم جیسے نہ ہوں گے۔''

اِنۡ یَّشَاۡ یُذۡهِبۡكُمۡ وَ یَسۡتَخۡلِفۡ مِنۡۢ بَعۡدِكُمۡ مَّا یَشَآءُ كَمَاۤ اَنۡشَاَكُمۡ مِّنۡ ذُرِّیَّةِ قَوۡمٍ اٰخَرِیۡنَ ○ؕ (الانعام:۱۳۳)

''اگر وہ چاہے تو تم لوگوں کو لے جائے اور تمھاری جگہ دوسرے جن لوگوں کو چاہے لے آئے، جس طرح اس نے تمھیں کچھ اور لوگوں کی نسل سے اٹھایا ہے۔''

اِنۡ یَّشَاۡ یُذۡهِبۡكُمۡ وَیَاۡتِ بِخَلۡقٍ جَدِیۡدٍ ○ۙ وَّمَا ذٰلِكَ عَلَی اللّٰهِ بِعَزِیۡزٍ ○ (ابراہیم:۱۹-۲۰)

''وہ چاہے تو تم لوگوں کو لے جائے اور ایک نئی خلقت تمھاری جگہ لے آئے۔ ایسا کرنا اس پر کچھ دشوار نہیں ہے۔''

فَلَاۤ اُقۡسِمُ بِرَبِّ الۡمَشٰرِقِ وَالۡمَغٰرِبِ اِنَّا لَقٰدِرُوۡنَ ○ۙ عَلٰۤی اَنۡ نُّبَدِّلَ خَیۡرًا مِّنۡهُمۡ ۙ وَمَا نَحۡنُ بِمَسۡبُوۡقِیۡنَ ○ (المعارج:۴۰-۴۱)

''پس نہیں، میں قسم کھاتا ہوں مشرقوں اور مغربوں کے مالک کی، ہم اس پر قادر ہیں کہ ان کی جگہ ان سے بہتر لوگ لے آئیں اور کوئی ہم سے بازی لے جانے والا نہیں ہے۔''

اس آیت کے دوسرے معنیٰ یہ ہو سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر ہے کہ ان کی صورتیں بدل دے۔ وہ جب اس بات پر قادر تھا کہ ان کو عدم سے وجود بخشے تو ایک صورت سے دوسری صورت میں ڈھال دینا اس کے لیے کیا مشکل ہے؟ اس مضمون کی بھی قرآن میں متعدد آیتیں ہیں۔ مثلاً:

وَمَا نَحۡنُ بِمَسۡبُوۡقِيۡنَۙ عَلٰٓى اَنۡ نُّبَدِّلَ اَمۡثَالَكُمۡ وَنُنۡشِئَكُمۡ فِىۡ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ ۝ وَلَقَدۡ عَلِمۡتُمُ النَّشۡاَةَ الۡاُوۡلٰى فَلَوۡلَا تَذَكَّرُوۡنَ ۝

(الواقعۃ: ٦٠-٦٢)

''اور ہم اس سے عاجز نہیں ہیں کہ تمھاری شکلیں بدل دیں اور کسی ایسی شکل میں تمھیں پیدا کر دیں جس کو تم نہیں جانتے۔ اپنی پہلی پیدائش کو تو تم جانتے ہی ہو، پھر کیوں سبق نہیں لیتے۔''

وَلَوۡ نَشَآءُ لَمَسَخۡنٰهُمۡ عَلٰى مَكَانَتِهِمۡ فَمَا اسۡتَطَاعُوۡا مُضِيًّا وَّلَا يَرۡجِعُوۡنَ ۝

(یٰسٓ: ٦٧)

''ہم چاہیں تو انھیں ان کی جگہ ہی پر اس طرح مسخ کر کے رکھ دیں کہ یہ نہ آگے چل سکیں نہ پیچھے پلٹ سکیں۔''

صورتوں کی یہ تبدیلی مرنے سے پہلے اس دنیا میں بھی ممکن ہے اور مرنے کے بعد دوبارہ پیدا کیے جانے کے وقت بھی۔ اسی مؤخر الذکر معنیٰ کو مولانا مودودی نے آیت سے مستنبط ہونے والا تیسرا معنیٰ قرار دیا ہے۔ دیگر مفسرین نے بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے، مثلاً ملاحظہ کیجیے علامہ آلوسی کی تفسیر روح المعانی۔

اس تیسرے معنیٰ کو لیں تو بھی اس سے برادرانِ وطن کے عقیدۂ پنر جنم یا آواگمن کا اثبات نہیں ہوتا۔ پنر جنم کا عقیدہ تو یہ ہے کہ انسان مرنے کے بعد پھر اسی دنیا میں دوبارہ پیدا ہوتا ہے اور اس کے اعمال اور کرموں کے مطابق اس کا ظہور دوسری صورت میں ہوتا ہے۔ جب تک انسان کو موکش (نجات) نہیں مل جاتی اس وقت تک وہ اپنے اعمال کے مطابق دنیا میں آتا رہے گا۔ یہ آواگمن چوراسی لاکھ یونیوں میں ہوتا ہے، یعنی یہ ایسا چکر ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتا۔ جب کہ زیر بحث آیت میں عقیدۂ آخرت کا اثبات کیا گیا ہے۔ اس سے پہلے کی آیت میں ان لوگوں کو سخت الفاظ میں تنبیہ کی گئی ہے جو دنیاوی زندگی میں مگن ہیں، اسی کو سب کچھ سمجھ رہے ہیں اور آخرت کی زندگی کو فراموش کیے بیٹھے ہیں۔ اس کے بعد اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کے حوالے سے کہا گیا ہے کہ جب اس نے پہلی بار انھیں اس دنیا میں وجود بخشا ہے اور ان کی

صورت گری کی ہے تو مرنے کے بعد دوبارہ آخرت میں انھیں پیدا کرنا اور دوسری شکل وصورت دینا اس کے لیے کیوں کر مشکل ہے؟! مولانا امین احسن اصلاحیؒ نے اس آیت کی تشریح میں اسی پہلو کو نمایاں کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

> ''یہ ان مخالفین کے لیے دھمکی بھی ہے اور اس میں قیامت پر ان کے سب سے بڑے شبہ کا جواب بھی ہے۔ ان کا سب سے بڑا شبہ، جو قرآن میں بار بار نقل ہوا ہے، یہی تھا کہ مرنے اور مٹی میں رَل مِل جانے کے بعد یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ دوبارہ اٹھائے جائیں! فرمایا کہ ہم ہی نے ان کو پیدا کیا اور ہم نے ہی ان کے جوڑ بند اور رگ پٹھے مضبوط کیے تو جب ہم ہی نے یہ سب کچھ کیا ہے اور اس سے وہ انکار نہیں کر سکتے تو ہم جب چاہیں گے پھر ان کے رگ پٹھے از سر نو مضبوط کر کے ان کو اٹھا کھڑا کریں گے۔ جب پہلی بار ہم کو اس کام میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی تو وہی کام ہمارے لیے دوبارہ کیوں مشکل ہو جائے گا۔'' (۱)

رسول اکرم ﷺ کی تشریعی حیثیت

سوال: قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے رسول حضرت محمد ﷺ کو بہ حیثیت رسول جو ذمہ داری دی گئی تھی، وہ کتاب اللہ کی تشریح ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''اور (اے نبی) یہ ذکر ہم نے تمھاری طرف اس لیے نازل کیا ہے کہ تم لوگوں کے لیے واضح کردو اس تعلیم کو جو ان کی طرف اتاری گئی ہے۔ (النحل: ۴۴) اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ نبیؐ کو اللہ تعالیٰ نے ذمہ داری دی تھی کہ قرآن میں جو احکام وہدایات دیے جا رہے ہیں، ان کی آپؐ وضاحت اور تشریح فرمادیں، تاکہ لوگوں کو کلام اللہ کے سمجھنے میں دشواری نہ پیش آئے۔

یہ فریضہ منصبِ رسالت کا ایک اہم جزء ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سی ذمہ داریاں آپؐ کے سپرد کی گئی تھیں اور سبھی معاملات میں آپؐ کی اتباع کو لازمی قرار دیا گیا ہے۔ بلکہ یہاں تک فرمایا گیا ہے کہ رسول کی اطاعت دراصل اللہ کی اطاعت ہے (النساء: ۶۴، ۸۰، محمد: ۳۳) اس کے ساتھ آپ کو کچھ اختیارات بھی عطا کیے تھے۔ فرمایا: ''جو کچھ رسول تمھیں دے اسے لے لو اور جس سے منع کرے اس سے رک جاؤ۔'' (الحشر: ۷) یہ نکتہ بھی ذہن میں رہے کہ فرائض نبوت کی

---

(۱) تدبر قرآن، تاج کمپنی دہلی، ۱۹۸۹ء، ۹/ ۱۲۰

ادائی کے لیے اللہ تعالیٰ نے آپ کو وہی بصیرت اور حکمت عطا فرمائی تھی، جس کی بنیاد پر آپ مقاصد قرآن کی گہرائیوں تک پہنچتے تھے۔ یہ بصیرت اور حکمت لازمۂ نبوت تھی، جو کتاب کے ساتھ آپ کو عطا کی گئی تھی اور اسی کی بدولت آپؐ لوگوں کو تعلیم خداوندی کے مطابق عمل کرنے کی تلقین فرماتے تھے۔ قرآن میں اس کا بہ کثرت تذکرہ ملتا ہے۔ (ملاحظہ کیجئے البقرۃ: ۱۲۷، ۱۲۹، ۱۵۱، آل عمران: ۱۶۴، الجمعۃ: ۲) علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''پھر اس کا مطلب سمجھا دینا بھی ہمارے ہی ذمہ ہے۔ (القیامۃ: ۱۹) اس سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآنی تعلیمات واحکام کی جو تشریح وتعبیر آپؐ اپنے قول وعمل سے کرتے تھے وہ آپؐ کے ذہن کی پیداوار نہ تھی، بلکہ اللہ تعالیٰ کی ذاتِ مبارک ہی آپ پر قرآن نازل کرتی تھی اور وہی آپؐ کو اس کا مطلب بھی سمجھاتی اور اس کے وضاحت طلب امور کی تشریح بھی کرتی تھی۔ یہاں یہ بات بھی اہمیت کی حامل ہے کہ آپؐ کے ذرائع معلومات کتاب اللہ کے علاوہ بھی ہیں، جو قرآن سے ثابت ہیں۔ سورۂ بقرہ میں ہے: ''اور وہ قبلہ جس کی طرف تم پہلے رُخ کرتے تھے، اس کو تو ہم نے صرف یہ دیکھنے کے لیے مقرر کیا تھا کہ کون رسول کی پیروی کرتا ہے اور کون الٹا پھر جاتا ہے۔'' (آیت ۱۴۳) چونکہ قبلۂ اول کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھنے کا حکم قرآن میں کہیں نہیں پایا جاتا، اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو قرآن کے علاوہ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایات ملتی تھیں۔ لہٰذا حضور کی زندگی کا وہ کارنامہ جو آپؐ نے بعثت کے بعد اپنی ۲۳ سالہ پیغمبرانہ زندگی میں انجام دیا وہ قرآن کے منشا کی توضیح و تشریح کے علاوہ اللہ تعالیٰ کی نگرانی میں منصب رسالت کے دیگر کاموں کی ادائی ہے۔ اس تفصیل سے بہ خوبی واضح ہوجاتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا منصب شارح کا تھا، نہ کہ 'شارع' کا۔ لیکن بعض علماء آپؐ کے لیے شارع کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کا نام پیش کیا جاسکتا ہے۔ ان کا مسلک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو تشریعی اختیارات (Legislative Powers) عطا کیے تھے۔ اس بات کا تذکرہ انھوں نے اپنی تصانیف، خاص کر 'سنت کی آئینی حیثیت' میں زور وشور سے کیا ہے اور ایک دو جگہ آپؐ کو 'شارع علیہ السلام' کے لقب سے نوازا ہے۔ مولانا مرحوم کی علمی صلاحیتوں کا قائل ہونے کے باوجود ان کا یہ نظریہ ناچیز کی عقل وفہم سے پرے ہے۔ کیوں کہ شارع تو صرف اللہ تعالیٰ کی ذات پاک ہے، جس کا قرآن میں صراحت سے ذکر کیا گیا ہے۔ نبی ﷺ کی حیثیت تو صرف شارح کی تھی۔

مولانا مودودیؒ نے نبی ﷺ کو تشریعی اختیارات حاصل ہونے کی جتنی بھی دلیلیں دی ہیں وہ سب دراصل تشریح کے زمرے میں آتی ہیں۔ مثال کے طور پر قرآن میں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ ’’اگر تم کو جنابت لاحق ہوگئی ہو تو پاک ہوئے بغیر نماز نہ پڑھو۔‘‘ (النساء: ۴۳) اس کی وضاحت کرتے ہوئے آپؐ نے بتایا کہ جنابت کیا ہے اور اس سے پاک ہونے کا طریقہ کیا ہے؟ یعنی غسل کیسے کیا جائے گا؟ یہ سب اضافی باتیں تشریح وتفسیر کے زمرے میں ہی آئیں گی۔ اسی طرح قرآن میں اللہ تعالیٰ نے دو سگی بہنوں کو بہ یک وقت ایک مرد سے نکاح کرنے سے منع فرمایا۔ (النساء ۲۳) اس کی تشریح وتوضیح آپؐ نے یوں کی کہ جس طرح دو سگی بہنیں ایک جگہ جمع نہیں کی جاسکتیں اسی طرح خالہ اور بھانجی یا پھوپھی اور بھتیجی کو بھی ایک جگہ جمع نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح وراثت کا قانون بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ’’اگر (میت کی وارث) دو سے زائد لڑکیاں ہوں تو انھیں ترکے کا دو تہائی دیا جائے۔ (النساء: ۱۱) یہاں یہ نہیں بتایا گیا کہ اگر صرف دو لڑکیاں ہوں تو ان کو کتنا حصہ ملے گا؟ اس کی وضاحت آپؐ نے یوں فرمائی کہ دو لڑکیاں ہونے کی صورت میں بھی دونوں کو ترکہ میں سے دو تہائی دیا جائے گا۔

یہاں یہ بات بھی اہمیت رکھتی ہے کہ سورۂ النحل آیت ۴۴ میں جس طرح حضورؐ کو قرآنی آیات کی تشریح وتوضیح کا حکم دیا گیا ہے اس طرح قرآن میں تشریعی اختیارات عطا کرنے کا کہیں ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ اس لیے آپؐ کے تشریعی اختیارات کے حق میں مولانا مودودیؒ نے جو دلائل دیئے ہیں اور جو مثالیں پیش کی ہیں وہ ناکافی معلوم ہوتی ہیں۔

یہاں یہ بات توجہ طلب ہے کہ یہ دین کی کوئی فروعی بحث نہیں ہے، بلکہ اس کا تعلق بنیادی عقائد سے ہے۔ مولانا مودودیؒ کی رائے مان لینے سے اوّل تو عقیدۂ توحید پر زد پڑتی ہے، دوسرے حضورؐ کے اختیارات میں غلو کے باعث فرقہ واریت کو تقویت پہنچتی ہے، جس سے ملت اسلامیہ کے مزید کمزور ہونے کا اندیشہ ہے۔ امید کہ تشفی بخش جواب سے نوازیں گے۔

جواب: اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کے واسطے سے اپنا جو کلام آخری رسول حضرت محمد ﷺ پر نازل فرمایا اسے قرآن کہا جاتا ہے اور آں حضرت ﷺ کے اقوال وافعال وغیرہ کو، خواہ ان کا تعلق قرآن کی تشریح وتبیین سے ہو یا وہ دیگر معاملات سے متعلق ہوں، ان کے لیے

حدیث کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ ایک مسئلہ ابتدا سے یہ زیر بحث رہا ہے کہ دین کے معاملے میں احادیث حجت ہیں یا نہیں؟ بعض گروہ اور افراد ایسے پائے گئے ہیں، جو ان کی حجیت کا انکار کرتے ہیں۔ اس معاملہ میں ماضی بعید میں 'خوارج' نامی گروہ کو شہرت ملی اور ماضی قریب میں اس قسم کے افکار رکھنے والے 'اہل قرآن' کہلائے۔ ان حضرات کا کہنا ہے کہ دین کے معاملے میں صرف 'قرآن' حجت ہے۔ وہی احکام قابل قبول اور لائق نفاذ ہیں جو قرآن سے ثابت ہیں۔ اللہ کے رسول دوسرے انسانوں کی طرح ایک انسان تھے۔ آپ کا اصل کام صرف قرآن کو اللہ کے بندوں تک بے کم و کاست پہنچا دینا تھا۔ اس کی تعبیر و تشریح کے طور پر آپ نے جو کچھ ارشاد فرمایا وہ اپنی بشری حیثیت میں کیا، جسے قبول کرنے کے ہم پابند نہیں ہیں۔ آپؐ نے احکام قرآن کی اپنے عہد کے اعتبار سے تعبیر و تشریح فرمائی اور ہمیں بھی حق حاصل ہے کہ ان کی تعبیر و تشریح اپنے زمانے کے اعتبار سے کریں۔

جمہورِ امت نے اس فکر کو قبول نہیں کیا ہے اور اسے گم راہی قرار دیا ہے، چنانچہ خوارج اور اہل قرآن دونوں کا شمار 'فرق ضالّہ' (گم راہ فرقوں) میں ہوتا ہے۔ جمہور کے نزدیک رسول اللہ ﷺ کے صحیح اور ثابت شدہ اقوال و افعال دین میں اسی طرح حجت ہیں جس طرح قرآن حجت ہے، اگرچہ ان کا درجہ قرآن کے بعد آتا ہے۔ ان کی حجیت کے دلائل خود قرآن کریم میں موجود ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے رسول کی اطاعت کا حکم دیا ہے، ان کے فیصلوں اور احکام کو واجب التعمیل قرار دیا ہے اور ان کی مخالفت سے ڈرایا ہے۔ چند آیات درج ذیل ہیں:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ (النساء:۵۹)

"اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور ان لوگوں کو جو تم میں سے صاحب امر ہوں، پھر اگر تمھارے درمیان کسی معاملے میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی طرف پھیر دو، اگر واقعی اللہ اور روز آخر پر ایمان رکھتے ہو۔"

فَلَا وَ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ

لاَ یَجِدُوْا فِیْٓ اَنْفُسِھِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیْتَ وَیُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا۝

(النساء:٦٥)

''(اے محمدؐ) تمھارے رب کی قسم، یہ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنے باہمی اختلافات میں یہ تم کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں، پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو اس پر اپنے دلوں میں بھی کوئی تنگی نہ محسوس کریں۔''

وَمَآ اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ ج وَمَا نَھٰکُمْ عَنْہُ فَانْتَھُوْا ج

(الحشر:٧)

''جو کچھ رسول تمھیں دے وہ لے لو اور جس چیز سے وہ تم کو روک دے اس سے رک جاؤ۔''

فَلْیَحْذَرِ الَّذِیْنَ یُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِہٖٓ اَنْ تُصِیْبَھُمْ فِتْنَۃٌ اَوْ یُصِیْبَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ۝ (النور:٦٣)

''رسول کے حکم کی خلاف ورزی کرنے والوں کو ڈرنا چاہیے کہ وہ کسی فتنے میں گرفتار نہ ہو جائیں یا ان پر دردناک عذاب نہ آ جائے۔''

قرآن سے حدیث کے تعلق کے تین پہلو ہیں:

(۱) کچھ احادیث ایسی ہیں جن میں قرآن میں مذکور احکام ہی کا تذکرہ بطور تاکید و تائید آیا ہے۔ مثلاً نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج کی ادائی کا حکم اور شرک، جھوٹی گواہی، والدین کی نافرمانی اور ناحق قتل نفس کی ممانعت وغیرہ۔

(۲) بہت سی احادیث قرآن کی تفسیر و تشریح کرتی ہیں۔ چنانچہ قرآن میں کوئی حکم مجمل بیان ہوا ہے، احادیث میں اس کی تفصیل موجود ہے۔ کوئی حکم قرآن میں مطلق مذکور ہے احادیث میں اس کے سلسلے میں بعض قیود عائد کر دی گئی ہیں۔ کسی حکم کا تذکرہ قرآن میں عمومی صیغے میں ہے، احادیث میں اس کی تخصیص کر دی گئی ہے۔ مثلاً قرآن میں نماز قائم کرنے، زکوٰۃ ادا کرنے اور حج کرنے کے احکام ہیں، احادیث میں نمازوں کے اوقات، رکعتوں کی تعداد، ادائی نماز کا طریقہ، زکوٰۃ کی مقدار اور حج کے مناسک وغیرہ بیان کر دیے گئے ہیں۔ قرآن میں خرید و فروخت کو حلال اور سود کو حرام قرار دیا

گیا ہے۔ احادیث میں خرید وفروخت کی جائز اور ناجائز صورتیں اور سود کی تفصیلات مذکور ہیں۔

(۳) کچھ احادیث ایسی ہیں جن میں ایسے احکام بیان کیے گئے ہیں جو قرآن میں مذکور نہیں ہیں۔ یہ بھی واجب الاتباع ہیں۔ مثلاً نکاح میں دو ایسی عورتوں کو جمع کرنے کی حرمت جن کے درمیان پھوپھی بھتیجی یا خالہ بھانجی کا رشتہ ہو، یا شکاری درندوں اور پرندوں اور گھریلو گدھوں کی حرمت، یا مردوں کے لیے ریشم اور سونا پہننے کی حرمت، یا میراث میں دادی کا حصہ، یا شادی شدہ زانی کو رجم کی سزا، یا دیت کے احکام وغیرہ[1]

یہ تقسیم جمہور کے نقطۂ نظر سے ہے۔ بعض علماء، جن میں علامہ شاطبیؒ صاحب الموافقات خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، حدیث کی صرف اوّل الذکر دو قسمیں قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک جملہ احادیث قرآن کی تشریح وتبیین کے قبیل سے ہیں۔ کوئی حدیث ایسی نہیں جس کی اصل قرآن میں موجود نہ ہو۔ مثال کے طور پر حدیث میں درندوں اور شکاری پرندوں کی حرمت کا تذکرہ ہے۔ اس کی اصل آیتِ قرآنی: وَ يُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَ يُحَرِّمُ عَلَيهِمُ الْخَبٰئِثَ۔ (الاعراف: ۱۵۷) میں موجود ہے۔ حدیث میں مذکور احکام دیت کی اصل آیت فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰى اَهْلِهٖ (النساء: ۹۲) میں پائی جاتی ہے[2]

موجودہ دور میں عالم اسلام کے مشہور فقیہ شیخ ابوزہرہ نے بھی اس موضوع پر لکھا ہے۔ انھوں نے حدیث کی مذکورہ بالا تینوں قسمیں بیان کرتے ہوئے ہر قسم کی مثالیں دی ہیں۔ پھر تیسری قسم کی مثالوں کے ضمن میں لکھا ہے:

> ”حقیقت یہ ہے کہ ان تمام مثالوں کی اصل کتاب الٰہی میں موجود ہے... ہم سنت میں مذکور ایک حکم بھی ایسا نہ پائیں گے جس کی اصل قریب یا دور سے قرآن میں موجود نہ ہو۔ اسی لیے بعض علماء نے فرمایا ہے: سنت میں جو حکم بھی مذکور ہے اس کی اصل اللہ کی کتاب میں ضرور پائی جاتی ہے۔ اس رائے کو امام شافعیؒ نے الرسالہ میں نقل کیا ہے۔

---

(۱) اصول الفقہ، محمد ابوزہرۃ، دار الفکر العربی القاہرۃ، ۱۹۵۸ء ص: ۱۱۲، علم اصول الفقه، عبدالوہاب خلاف، مکتبة الدعوة الاسلامية، قاہرہ، ص: ۳۹-۴۰، السنة و مكانتها فی التشريع الاسلامی، ڈاکٹر مصطفیٰ السباعی، المکتب الاسلامی بیروت، ص: ۴۱۴-۴۱۶

(۲) تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجیے الموافقات فی اصول الشریعۃ، ابواسحاق الشاطبی، المکتبۃ التجاریۃ الکبریٰ، مصر، ۴/۱۲-۱۷

ان کے بعد شاطبیؒ نے بھی اپنی کتاب الموافقات میں اس کا اثبات کیا ہے...تم سنت میں کوئی ایک حکم بھی ایسا نہ پاؤ گے جس کے مفہوم پر قرآن اجمالی یا تفصیلی انداز سے دلالت نہ کرتا ہو۔'' (۱)

حقیقت یہ ہے کہ احادیث کی تقسیم کے سلسلے میں علماء کا یہ اختلاف کچھ اہمیت نہیں رکھتا۔اس لیے کہ جمہور امت کا اس پر اتفاق ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے مروی اور ثابت شدہ تمام احادیث اور احکام، خواہ انھیں مستقل حیثیت دی جائے یا قرآن کی تشریح و تبیین کے قبیل سے مانا جائے، واجب التعمیل ہیں۔ جو علماء تمام تر احادیث کو قرآن کی شارح و مبین قرار دیتے ہیں وہ بھی اس سے اختلاف نہیں کرتے۔ اسی بنا پر موجودہ دور کے مشہور شامی عالم ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی نے اس اختلاف کو لفظی قرار دیا ہے۔فرماتے ہیں:

''خلاصہ یہ کہ دونوں فریق اس بات پر متفق ہیں کہ سنت میں کچھ ایسے نئے احکام پائے جاتے ہیں جو قرآن میں منصوص اور صراحت سے مذکور نہیں ہیں۔ پہلا فریق کہتا ہے کہ اس سے اسلامی قانون سازی میں سنت کی مستقل حیثیت ثابت ہوتی ہے۔ اس لیے کہ سنت سے ایسے احکام ثابت ہیں جو اللہ کی کتاب میں مذکور نہیں ہیں۔ دوسرا فریق تسلیم کرتا ہے کہ وہ احکام قرآن میں صراحت سے مذکور نہیں ہیں، لیکن ساتھ ہی وہ یہ بھی کہتا ہے کہ وہ احکام کسی نہ کسی پہلو سے نصوصِ قرآن کے تحت آجاتے ہیں۔اس بنا پر وہ کہتا ہے کہ کوئی بھی صحیح حدیث، جس سے ایسا حکم ثابت ہوتا ہو جو قرآن میں مذکور نہیں ہے، وہ ضرور قرآن کے کسی نص یا اس کے کسی اصول کے تحت داخل ہے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو یہ دلیل ہے اس بات کی کہ وہ حدیث صحیح نہیں ہے، اس لیے اس پر عمل درست نہیں۔ اس سے واضح ہوا کہ یہ اختلاف محض لفظی ہے۔ دونوں فریق اس بات کے قائل ہیں کہ سنت میں ایسے احکام پائے جاتے ہیں جو قرآن میں مذکور نہیں ہیں۔ ایک فریق سنت کو مستقل تشریعی حیثیت دیتا ہے۔ دوسرا فریق اسے مستقل حیثیت نہیں دیتا، لیکن دونوں کا نتیجہ ایک ہی ہے۔'' (۲)

گزشتہ صدی میں انکارِ سنت کا فتنہ ہندوستان میں زور وشور سے اٹھا۔ اس کے علَم برداروں کا کہنا تھا کہ رسول اللہ ﷺ کا منصب صرف اللہ کا پیغام قرآن کی شکل میں انسانوں

(۱) اصول الفقہ ،ابو زہرہ،ص: ۱۱۳، ۱۱۴

(۲) السنۃ و مکانتها فی التشریع الاسلامی، مصطفیٰ السباعی،ص: ۴۲۰

تک پہنچا دینا تھا۔ وہ کام آپ نے کر دیا۔ اس کی تعبیر وتشریح کا جو کام آپؐ نے انجام دیا وہ آپؐ کی شخصی حیثیت میں تھا۔ ہم صرف احکامِ قرآن پر عمل و نفاذ کے مکلّف ہیں، ارشادات رسول ہمارے لیے حجت نہیں ہیں۔ اسلامی قانون کا ماخذ صرف قرآن ہے، سنت کو بھی ماخذ قانون قرار دینا درست نہیں۔ اس فتنہ کی سرکوبی کے لیے جو علماء میدان میں آئے ان میں سے ایک مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ بھی تھے۔ انھوں نے ان منکرین سنت سے لوہا لیا اور ان کے افکار و نظریات کے تار و پود بکھیر کر رکھ دیے۔ اپنی تحریروں میں مولانا مودودیؒ نے پورے زور و قوت کے ساتھ ثابت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا منصب محض ایک 'نامہ بر' کا نہیں تھا، بلکہ آپ کو معلم و مربیّ، رہ نما و پیشوا، حاکم و فرماں روا، قاضی، کتاب اللہ کا شارح و مفسر اور شارعِ قانون بھی بنا کر بھیجا گیا تھا۔ آپ کی اطاعت و پیروی اور آپ کے دیے ہوئے احکام پر عمل مسلمانوں پر فرض ہے اور سنت کے ماخذِ قانون ہونے پر پوری امت کا اجماع ہے۔ جو شخص سنت سے آزاد ہو کر قرآن کی پیروی کا دعویٰ کرتا ہے وہ حقیقت میں قرآن کا پیرو نہیں ہے۔ مولانا کی یہ تمام تحریریں پہلے ماہ نامہ ترجمان القرآن لاہور کے 'منصب رسالت نمبر' میں شائع ہوئیں، بعد میں 'سنت کی آئینی حیثیت' کے نام سے کتابی صورت میں ان کی اشاعت ہوئی۔ یہ مولانا کی بہترین کتابوں میں سے ہے۔ اس کے ذریعہ انھوں نے پوری امت کی طرف سے دفاعِ سنت کا فرض کفایہ ادا کر دیا ہے۔

قرآن سے ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے جملہ اقوال وارشادات وحی الٰہی پر مبنی تھے:

وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوٰىۗ ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی ۝ (النجم:۳)

''وہ اپنی خواہش نفس سے نہیں بولتا۔ یہ تو ایک وحی ہے جو اس پر نازل کی جاتی ہے۔''

آپؐ کے تمام اجتہادات کی بنیاد قرآن یا اللہ تعالیٰ کی بہ راہ راست رہ نمائی ہوتی تھی۔

شیخ ابو زہرہؒ نے لکھا ہے:

> ''اس چیز کو ملحوظ رکھنا چاہیے کہ قانون سازی میں رسول کے اجتہاد کی بنیاد قرآن اور ان کے اندروں میں ودیعت شدہ قانون سازی کی روح اور اس کے اصول و مبادی پر تھی۔ آپؐ جو احکام و قوانین وضع کرتے تھے ان کے معاملے میں قرآنی بیانات پر قیاس کرتے تھے یا قرآنی قانون سازی کے عام اصولوں کو تطبیق دیتے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ سنت میں مذکورہ احکام کا مرجع و ماخذ قرآن کے احکام ہیں۔'' (۱)

(۱) اصول الفقہ، ابوزہرہ، ص: ۴۰

اسی بنا پر علماء نے سنت کو اسلامی قانون کا دوسرا بنیادی ماخذ قرار دیا ہے اور اس سے ثابت شدہ احکام کو مسلمانوں کے لیے حجت اور واجب التعمیل مانا ہے۔ شیخ عبدالوہاب خلاّف فرماتے ہیں:

''تمام مسلمانوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی سے جن اقوال، افعال اور 'تقریرات' کا صدور ہوا ہے اور ان کا مقصود قانون سازی اور اقتداء ہے اور وہ ہم تک صحیح سندوں سے، جن سے قطعیت یا ظنِ غالب کا فائدہ حاصل ہوتا ہے، پہنچے ہیں، وہ مسلمانوں کے لیے حجت اور قانون سازی کا سرچشمہ ہیں، جن سے اجتہاد کرنے والوں کو شرعی احکام کا استنباط کرنا ہے، یعنی احادیث میں وارد ہونے والے احکام سے قرآن میں مذکور احکام کے ساتھ ایک ایسا قانون تشکیل پاتا ہے جس کی اتباع مسلمانوں کے لیے ضروری ہے... اگر یہ توضیح وتشریح کرنے والی احادیث مسلمانوں کے لیے حجت نہ ہوتیں اور ان کی حیثیت واجب الاتباع قانون کی نہ ہوتی تو قرآن کے فرائض کا نفاذ اور اس کے احکام پر عمل ممکن نہ ہوتا۔ ان توضیحی احادیث کی اتباع اسی پہلو سے واجب ہے کہ ان کا صدور رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی سے ہوا ہے۔ اور وہ ایسی سندوں سے مروی ہیں جو قطعیت یا ظن غالب کا فائدہ دیتی ہیں۔ معلوم ہوا کہ ہر حدیث جس میں کوئی حکم یا قانون مذکور ہو اور رسول ﷺ کی طرف اس کی نسبت صحیح ہو وہ حجت اور واجب الاتباع ہے، خواہ اس کے ذریعے قرآن میں مذکور کسی حکم کی تشریح وتبیین ہو رہی ہو یا اس میں کوئی ایسا حکم بیان کیا گیا ہو جس کے بارے میں قرآن خاموش ہو، اس لیے کہ ان تمام احادیث کا سرچشمہ وہ معصوم ذات گرامی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے تبیین کی ذمہ داری دی تھی اور قانون سازی کی بھی۔''(۱)

موجودہ دور کے مشہور فقیہ شیخ وہبہ زحیلیؒ نے لکھا ہے:

''علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ سنتِ نبوی شرعی احکام کے استنباط کے معاملے میں قرآن کی طرح واجب الاتباع ہے اور یہ کہ وہ قانون سازی کا دوسرا سرچشمہ ہے۔ ثابت شدہ سنت اپنے تمام مشتملات میں واجب الاتباع ہے، خواہ وہ قرآن کے مجمل احکام کی توضیح کر رہی ہو، یا اس کے مطلق احکام پر کچھ قیود عائد کر رہی ہو، یا کوئی ایسا نیا حکم بیان کر رہی ہو، جس کے بارے میں قرآن خاموش ہو، اس لیے کہ آخر کار اس

(۱) علم اصول الفقہ، عبدالوہاب، خلاّف، ص: ۳۸-۳۹

کا خاتمہ وحی الٰہی پر ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے صراحت سے اس کا اعلان کیا ہے۔ فرمایا:
وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى (النجم: ۳، ۴) (۱)

گزشتہ بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلامی شریعت کے بنیادی مصادر دو ہیں: ایک قرآن، دوسرا حدیث۔ جناب مستفسر کو بھی اس سے اختلاف نہیں ہے۔ وہ جہاں یہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے یہ ذمہ داری دی تھی کہ قرآن میں مذکور احکام کی توضیح و تشریح فرمادیں، وہیں یہ بھی فرماتے ہیں کہ آپؐ کو دوسری بہت سی ذمہ داریاں بھی سپرد کی گئی تھیں اور سبھی معاملات میں آپؐ کی اتباع کو لازمی قرار دیا گیا ہے۔ وہ یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ آپؐ کو قرآن کے علاوہ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے بہ راہ راست ہدایات ملتی تھیں اور آپ کے تمام اقوال و افعال اللہ تعالیٰ کی راست نگرانی میں اور اس کی عطا کردہ بصیرت و حکمت کی روشنی میں انجام پائے تھے۔ ان کا کہنا صرف ہے کہ رسول کو 'شارع' قرار دینا صحیح نہیں ہے۔ اس لیے کہ آپؐ کا کام صرف اللہ کی شریعت کو اس کے بندوں تک پہنچا دینا تھا۔ شارع حقیقت میں صرف اللہ تعالیٰ کی ذاتِ پاک ہے۔

یہ بات بالکل صحیح ہے کہ شارع حقیقی صرف اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہے۔ وہی حاکم ہے اور تمام شرعی احکام اسی کے دیے ہوئے ہیں، خواہ اس نے ان کا تذکرہ اپنی کتاب قرآن میں کر دیا ہو، یا اس کی ہدایت کے مطابق اس کے رسول نے انھیں بیان کیا ہو۔ اس بات پر تمام علماء کا اتفاق ہے۔ شیخ عبدالوہاب خلّاف نے لکھا ہے:

> ''علماء کے درمیان اس بات میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ مکلفین کے تمام افعال کے لیے شرعی احکام کا سرچشمہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات ہے، خواہ اس کے حکم کا اظہار بہ راہ راست ان نصوص سے ہو جن کی اس نے اپنے رسول کی طرف وحی کی تھی، یا اجتہاد کرنے والے استنباطِ احکام کے شرعی دلائل کے واسطے سے اس تک رسائی حاصل کریں۔ اسی لیے وہ متفقہ طور پر 'حکم شرعی' کی یہ تعریف کرتے ہیں کہ اس سے مراد مکلفین کے افعال سے متعلق اللہ تعالیٰ کا خطاب ہے۔ اس کے لیے ان کے درمیان یہ اصول مشہور ہے: ''لا حکم الا اللّٰہ'' ''حکم کا اختیار صرف اللہ کو ہے۔'' یہ اصول اللہ کے اس ارشاد سے ماخوذ ہے: ''اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ۔ (الانعام: ۵۷) (فیصلے کا سارا اختیار اللہ کو ہے)۔ (۲)

---

(۱) الوجیز فی اصول الفقہ، وھبۃ الزحیلی، دار الفکر دمشق، ص: ۳۹-۴۱

(۲) علم اصول الفقہ، عبدالوہاب، خلّاف، ص: ۹۶۔

اسی لیے اصطلاحی طور پر لفظ 'شارع' کا اطلاق اللہ تعالیٰ کی ذات پر کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر خالد رمضان حسن لکھتے ہیں:

''شارع احکام دینے اور قوانین وضع کرنے والے کو کہا جاتا ہے۔ شارع اور حاکم صرف اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہے۔ اس کا ارشاد ہے: شَرَعَ لَکُمۡ مِّنَ الدِّیۡنِ... (الشوریٰ: ۱۳) (اس نے تمھارے لیے دین کا طریقہ مقرر کیا ہے...)'' (۱)

لیکن بعض علماء، لفظ 'شارع' کا استعمال رسول اللہ ﷺ کے لیے بھی کرتے ہیں۔ ایسا وہ مجازاً کرتے ہیں۔ زبان و بیان اور بلاغت کے پہلوؤں سے اس کی گنجائش موجود ہے۔ اس لیے اسے بھی غلط نہیں قرار دیا جاسکتا۔ شرعی احکام کے بنیادی سرچشمے دو ہیں: ایک قرآن، دوسرا حدیث۔ قرآن اللہ کا کلام ہے اور رسول اللہ ﷺ کے ارشادات کو حدیث کہتے ہیں۔ جب دونوں سے شرعی احکام حاصل ہوتے ہیں تو دونوں کو شارع کہا جاسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو حقیقتاً اور اس کے رسول ﷺ کو مجازاً۔ بعض علمائے اصول نے اس کی رعایت سے لفظ شارع کا یہ مطلب بتایا ہے۔

الشارع هو مبيّن الاحكام۔ (۲)

''شارع احکام بیان کرنے والے کو کہا جاتا ہے۔''

اس کی تائید و تصویب قرآن کریم سے بھی ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے:

یَاۡمُرُهُمۡ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَ یَنۡهٰهُمۡ عَنِ الۡمُنۡكَرِ وَ یُحِلُّ لَهُمُ الطَّیِّبٰتِ وَ یُحَرِّمُ عَلَیۡهِمُ الۡخَبٰٓئِثَ وَ یَضَعُ عَنۡهُمۡ اِصۡرَهُمۡ وَالۡاَغۡلٰلَ الَّتِیۡ كَانَتۡ عَلَیۡهِمۡ ؕ (الاعراف: ۱۵۷)

''وہ انھیں نیکی کا حکم دیتا ہے، بدی سے روکتا ہے، ان کے لیے پاک چیزیں حلال اور ناپاک چیزیں حرام کرتا ہے اور ان پر سے وہ بوجھ اتارتا ہے جو ان پر لدے ہوئے تھے اور وہ بندشیں کھولتا ہے جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے۔''

---

(۱) معجم اصول الفقہ، خالد رمضان حسن، الطرابیشی للدراسات الانسانیۃ، مصر، ۱۹۹۸ء، ص: ۱۵۵

(۲) القاموس المبين فی اصطلاحات الاصوليين، ڈاکٹر محمود حامد عثمان، دار الزاحم الرياض، ۲۰۰۲، ص ۱۸۵

اس آیت میں تحلیل وتحریم کی نسبت صراحت سے رسول اللہ ﷺ کی جانب کی گئی ہے۔ حالانکہ یہ اللہ تعالیٰ کے کام ہیں۔ اس سے اشارہ ملتا ہے کہ تحریم وتحلیل کے جو کام آپؐ نے کیے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے اختیارات کی بنا پر کیے ہیں، اس لیے وہ بھی قرآنی احکامِ تحلیل وتحریم کی طرح واجب الاتباع ہیں۔ یہی مضمون بعض احادیث میں بھی مذکور ہے۔ ایک حدیث حضرت ابورافعؓ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا:

لَا اُلْفِيَنَّ اَحَدَكُمْ مُتَّكِئًا عَلٰى اَرِيْكَتِهٖ يَاتِيْهِ الْاَمْرُ مِنْ اَمْرِیْ مِمَّا اَمَرْتُ بِهٖ اَوْ نَهَيْتُ عَنْهُ فَيَقُوْلُ: لَا نَدْرِیْ مَا وَجَدْنَا فِیْ كِتَابِ اللّٰهِ اتَّبَعْنَاهُ (۱)

''میں ہرگز تم میں سے کسی کو اس حال میں نہ پاؤں کہ وہ اپنی مسند پر ٹیک لگائے ہو اور اس کے پاس میرے اوامر ونواہی میں سے کوئی بات پہنچے تو وہ یہ کہنے لگے: ہم نہیں جانتے۔ ہم جو کچھ اللہ کی کتاب میں پائیں گے صرف اسی کی اتباع کریں گے۔''

اس مضمون کی اور بھی متعدد احادیث مروی ہیں۔'' (۲)

اگر کوئی شخص یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ شرعی احکام وقوانین دینے کے معاملے میں اللہ کے رسول ﷺ اللہ تعالیٰ کی طرح مختار مطلق تھے اور آپؐ کو کلی اختیار حاصل تھا کہ اللہ کی رہ نمائی اور بصیرت کے بغیر جو چاہیں قوانین وضع کریں تو یقیناً اس کی زد عقیدۂ توحید پر پڑتی ہے اور اس سے آپؐ کے اختیارات کے معاملے میں غلو ہو جاتا ہے، لیکن اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ آپؐ کو اللہ تعالیٰ کی مکمل ہدایت، وحی اور راست نگرانی میں تشریعی اختیارات (Legislative Powers) حاصل تھے۔ اس بنا پر وہ آپ کے لیے بھی 'شارع' کا لفظ استعمال کرتا ہے تو ایسا کرنا غلط نہیں ہے۔ اس سے نہ عقیدۂ توحید پر زد پڑتی ہے نہ آپؐ کے اختیارات میں غلو ثابت ہوتا ہے۔

اسماء حسنیٰ

سوال: ایک حدیث میں ہے کہ ''اللہ کے ننانوے نام ہیں۔ وہ طاق ہے اور طاق کو پسند کرتا ہے۔'' اس کی روشنی میں دو سوالات پیدا ہوتے ہیں:

---

(۱) سنن ابی داؤد، کتاب السنة، باب فی لزوم السنة ۴۶۰۵

(۲) ملاحظہ کیجیے ابوداؤد: ۳۰۵۰، ۴۶۰۴، ترمذی: ۲۶۶۳، ۲۶۶۴، ابن ماجہ: ۱۲، ۱۳

(۱) کیا رسول اللہ ﷺ نے ان ناموں کی تعیین کی ہے؟ اگر ہاں تو وہ کیا ہیں؟

(۲) ترمذی، ابن ماجہ اور عسقلانی نے جو نام بیان کیے ہیں وہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ان میں سے کس کی فہرست مستند ہے؟ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ ایک شخص قرآن سے اللہ کے ننانوے سے زائد نام نکال سکتا ہے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ امام احمد بن حنبلؒ کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کے ننانوے سے زائد نام ہیں۔ بہ راہِ کرم ان سوالات کے جوابات مرحمت فرمائیں۔

جواب: قرآن کریم میں ہے:

وَ لِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا (الاعراف:۱۸۰)

''اللہ کے اچھے نام ہیں۔ اس کو اچھے ہی ناموں سے پکارو۔''

ایک حدیث حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا:

لِلّٰهِ تِسْعَةٌ وَّ تِسْعُوْنَ اِسْمًا، مَنْ حَفِظَهَا دَخَلَ الْجَنَّةَ، وَ اِنَّ اللّٰهَ وِتْرٌ يُحِبُّ الْوِتْرَ(۱)

''اللہ کے ننانوے نام ہیں۔ جو شخص ان کو یاد کرلے گا وہ جنت میں جائے گا۔ اللہ طاق ہے اور طاق کو پسند کرتا ہے۔''

دوسری روایت میں ''مَنْ اَحْصَاهَا'' (جو ان کو شمار کرلے گا...) کے الفاظ ہیں۔

اس حدیث کا مطلب یہ نہیں ہے کہ متعین طور پر اللہ تعالیٰ کے صرف ننانوے نام ہیں۔ اس لیے کہ بعض دیگر احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے بے شمار نام ہیں، ان کا احاطہ کرنا کسی شخص کے بس میں نہیں ہے۔ مسند احمد میں ایک دعا سکھائی گئی ہے، جس کا ایک ٹکڑا یہ ہے:

اَسْأَلُكَ بِكُلِّ اِسْمٍ هُوَ لَكَ، سَمَّيْتَ بِهِ نَفْسَكَ اَوْ اَنْزَلْتَهُ فِيْ كِتَابِكَ اَوْ عَلَّمْتَهُ اَحَدًا مِّنْ خَلْقِكَ اَوِ اسْتَأْثَرْتَ بِهِ فِيْ عِلْمِ الْغَيْبِ عِنْدَكَ(۲)

---

(۱) بخاری، کتاب الدعوات، باب للّٰه مائة اسم غير واحدة، ۶۴۱۰، ۷۳۹۲، مسلم: ۲۶۷۷

(۲) مسند احمد، ۱/۳۹۱، مسند عبد الله بن مسعود

''اے اللہ! میں تیرے سامنے دستِ سوال دراز کرتا ہوں، تیرے ہر اس نام کے واسطے سے، جس سے تونے خود کو موسوم کیا ہے، یا اسے اپنی کتاب میں بیان کیا ہے، یا اسے اپنی کسی مخلوق کو سکھایا ہے، یا تونے اسے اپنے پاس محفوظ رکھا ہے اور کسی کو نہیں بتایا ہے...''

اسی طرح ایک دوسری دعا کا ایک ٹکڑا یہ ہے:

لاَ اُحصِیُ ثَنَاءً ا عَلَیْكَ، اَنْتَ كَمَا اَثْنَیْتَ عَلٰی نَفْسِكَ(۱)

''اے اللہ! تیری ثنا کا شمار کرنا میرے بس میں نہیں۔ تو ویسا ہی ہے جیسا تونے خود اپنی ثنا کی ہے۔''

اللہ کی کامل ثنا اسی وقت کی جاسکتی ہے، جب اس کے تمام اسماء وصفات کا احاطہ ممکن ہو۔ اور اس پر کوئی انسان قادر نہیں ہے۔

بخاری و مسلم کی مذکورہ بالا حدیث (جس میں اللہ کے ننانوے نام قرار دیے گئے ہیں) میں یہ بات کہی گئی ہے کہ جو شخص اللہ کے ننانوے ناموں کو یاد رکھے گا اسے جنت میں داخلہ نصیب ہوگا۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں:

''علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اس حدیث میں حصر نہیں ہے اور اس میں یہ بات نہیں کہی گئی ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے صرف ننانوے نام ہیں۔ بلکہ حدیث کا مقصد یہ ہے کہ جو شخص اللہ کے ننانوے ناموں کا احاطہ کرلے گا وہ جنت میں جائے گا۔ دوسری حدیث سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ اسی لیے حافظ ابن العربی مالکیؒ نے بعض اہل علم کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اللہ کے ایک ہزار نام ہیں۔ ابن العربیؒ فرماتے ہیں: یہ تعداد بھی کم ہے۔'' (۲)

یہی بات شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہؒ نے بھی اپنی متعدد تصانیف میں ارشاد فرمائی ہے(۳)

حافظ ابن حجرؒ، علامہ خطابیؒ، امام قرطبیؒ، حافظ ابن کثیرؒ اور امام فخر الدین رازیؒ کا رجحان

---

(۱) مسلم، کتاب الصلاۃ، باب مایقال فی الرکوع والسجود، ۴۸۶

(۲) شرح صحیح مسلم، ۵/۱۷

(۳) ملاحظہ کیجیے درء تعارض العقل والنقل، ۳/ ۳۳۲-۳۳۳، مجموع فتاویٰ شیخ الاسلام، ۲۲/ ۴۸۲

بھی اسی طرف ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات غیر محصور ہیں۔ ننانوے کا ذکر محض کثرتِ تعداد بیان کرنے کے لیے ہے اور طاق عدد رمزِ توحید ہے۔ یعنی رب العزت واحد ہے، حتی کہ اس کے اسماء سے بھی اس کی وحدت کا ہی اشارہ ملنا چاہیے، جوڑے کا نہیں۔(۱)

اسماء حسنیٰ سے متعلق بعض روایات میں اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام بھی گنائے گئے ہیں۔ ان میں سے تین روایات قابل ذکر ہیں۔ ایک امام حاکم کی کتاب المستدرک علی الصحیحین (۱/۱۷) میں ہے، دوسری جامع ترمذی (۳۵۰۷) میں اور تیسری سنن ابن ماجہ (۳۸۶۱) میں۔ لیکن یہ تمام روایات ضعیف ہیں۔ محدثین نے ان کے ضعف کی صراحت کی ہے۔(۲)

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے لکھا ہے:

> ’’علم حدیث سے واقف اصحاب کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ دونوں روایتیں (یعنی ترمذی اور ابن ماجہ کی) نبی ﷺ کا کلام نہیں ہیں، بلکہ اصلاً یہ بعض علمائے سلف کے کلام پر مشتمل ہیں۔ اس لیے دونوں روایتوں میں جو اسمائے الٰہی مذکور ہیں، ان میں فرق پایا جاتا ہے۔ اس سے بھی واضح ہوتا ہے کہ یہ نبی ﷺ کا کلام نہیں ہے، بلکہ حدیث نبوی میں یہ نام داخل کردیے گئے ہیں، اسی وجہ سے بعض دیگر حضرات مثلاً سفیان بن عیینہؒ اور امام احمدؒ وغیرہ نے اللہ تعالیٰ کے کچھ دیگر نام جمع کیے ہیں اور ان کا قرآن سے استخراج کیا ہے۔‘‘ (۳)

ترمذی، ابن ماجہ اور مستدرک حاکم کی روایات میں اسماء حسنیٰ کی جو فہرستیں ہیں ان میں باہم فرق ہے۔ ان سب کو جمع کرنے سے اسماء حسنیٰ کی تعداد ایک سو بیالیس (۱۴۲) تک پہنچ جاتی ہے۔ ان کے علاوہ قرآن کریم سے کچھ اور بھی اسماء الٰہی کا استخراج کیا جاسکتا ہے۔

ایک بات یہ بھی یاد رکھنے کی ہے کہ حدیث صحیح میں اسماء حسنیٰ کو یاد کرنے یا ان کا شمار کرنے پر استحقاق جنت کی جو بشارت دی گئی ہے، اس کا مطلب ان کو محض رَٹ لینا اور ان کا ورد

---

(۱) ڈاکٹر محمد مشتاق تجاروی، مقالہ ’اسماء حسنیٰ‘، شائع شدہ در مجلّہ ’نقوش‘ لاہور قرآن نمبر جلد دوم (شمارہ نمبر ۱۴۴، ۱۹۹۸ء) ص ۵۰۲، بہ حوالہ لوامع البینات، ص ۵۳۔

(۲) تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجیے: عبد الرزاق بن عبد المحسن البدر، فقه الاسماء الحسنی، دار التوحید للنشر الریاض، ۲۰۰۸ء۔

(۳) مجموع فتاویٰ شیخ الاسلام، ۶/۳۷۹، ۳۸۰، ۲۲/ ۴۸۳۔

کرنا نہیں ہے، بلکہ اس کا مطلب ان کے معانی کو سمجھنا، ان میں تدبر کرنا اور ان کے تقاضوں پر عمل کرنا ہے۔ علامہ ابن قیمؒ نے اپنی کتاب 'بدائع الفوائد' میں اس کے تین درجے قرار دیے ہیں۔ پہلا درجہ یہ ہے کہ ان اسماء الٰہی کو یاد کیا جائے۔ دوسرا درجہ یہ ہے کہ ان کے معانی کو سمجھا جائے اور ان کا استحضار ہو اور تیسرا درجہ یہ ہے کہ ان کے واسطے سے اللہ تعالیٰ سے دعا کی جائے، اس کی عبادت کی جائے اور اس کے سامنے دست سوال دراز کیا جائے۔" (۱)

ایک حدیث کا صحیح مفہوم

سوال: صحیح مسلم کی ایک حدیث ہے:

> "اگر تم گناہ نہیں کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمھیں ختم کردے گا اور تمھاری جگہ ایسے لوگوں کو لے آئے گا جو گناہ کریں گے، پھر اللہ سے استغفار کریں گے تو اللہ ان کی مغفرت فرمائے گا۔"

اس حدیث کو سمجھنے میں دشواری پیش آرہی ہے۔ اس سے تو لگتا ہے کہ گناہ کرنے پر ابھارا جارہا ہے، گناہ سے بچے رہنا کوئی خوبی نہیں ہے، بل کہ گناہ کا ارتکاب کرنا پسندیدہ ہے۔ بہ راہ کرم اس حدیث کا صحیح مفہوم واضح فرمادیں۔

جواب: صحیح مسلم کی یہ حدیث حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

> وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ لَوْلَمْ تُذْنِبُوْا لَذَھَبَ اللّٰہُ بِکُمْ وَ لَجَاءَ بِقَوْمٍ یُذْنِبُوْنَ، فَیَسْتَغْفِرُوْنَ اللّٰہَ فَیَغْفِرُ لَھُمْ۔(۲)

> "اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے۔ اگر تم نے گناہ نہ کیا تو اللہ تمھیں فنا کردے گا اور ایسے لوگوں کو لائے گا جن سے گناہ سرزد ہوں گے تو وہ اللہ سے مغفرت طلب کریں گے اور اللہ ان کی مغفرت قبول کرلے گا۔"

امام مسلمؒ نے اس مضمون کی کئی احادیث روایت کی ہیں۔ کسی حدیث کا مفہوم متعین کرنے کے لیے صرف اس کے ظاہری معنی پر اکتفا کرنا مناسب نہیں ہے، بلکہ پورے ذخیرۂ احادیث

---

(۱) بدائع الفوائد، ۱/ ۱۶۴

(۲) صحیح مسلم، کتاب التوبة، باب سقوط الذنوب بالاستغفار توبةً، ۲۷۴۹

اور دین کی مجموعی تعلیمات کو بھی پیش نظر رکھنا ہوگا۔ زیر بحث موضوع پر دو پہلوؤں سے غور کرنے کی ضرورت ہے:

۱- قرآن وحدیث میں گناہ کو حرام قرار دیا گیا ہے اور اس سے بچنے کی تاکید کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں بے شمار نصوص ہیں۔ اس لیے کوئی ایسا مفہوم قابل قبول نہیں ہوسکتا، جس سے گناہ کا ارتکاب کرنے کی ترغیب کا پہلو نکلتا ہو۔

۲- انسان کے اندر فطری طور پر خیر اور شر دونوں کی صلاحیتیں ودیعت کی گئی ہیں۔ اسی میں اس کا امتحان ہے۔ اگر اس سے گناہ کا صدور ہونے کا امکان ہی نہ ہوتا تب تو وہ فرشتہ بن جاتا۔ انسان کی خوبی اور اس کا امتیاز اس بات میں ہے کہ اگر اس سے کبھی شیطان یا نفس کے بہکاوے میں آکر کسی گناہ کا صدور ہوجائے تو وہ فوراً اللہ تعالیٰ کی طرف پلٹے اور اس سے معافی مانگے۔

ان دونوں باتوں کی روشنی میں مذکورہ بالا حدیث کا یہ مفہوم متعین ہوتا ہے کہ اس میں گناہ کا ارتکاب کرنے کی صورت میں توبہ واستغفار پر زور دیا گیا ہے۔ اس میں گناہ گار بندوں کے لیے تسلی کا سامان ہے کہ وہ اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہوں۔ ان سے خواہ بڑے سے بڑے گناہ کا صدور ہوگیا ہو، لیکن اگر وہ بارگاہِ الٰہی میں سر بہ سجود ہوکر اس سے مغفرت طلب کریں گے تو وہ ضرور انھیں معاف کردے گا۔

قرآن مجید کی ایک آیت سے بھی اس حدیث کا مفہوم متعین کرنے میں مدد ملتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝ (الزمر: ۵۳)

”(اے نبیؐ) کہہ دو کہ اے میرے بندو، جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے، اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہوجاؤ۔ یقیناً اللہ سارے گناہ معاف کردیتا ہے، وہ تو غفور رحیم ہے۔“

محدثین کرام نے اس حدیث کا یہی مفہوم بیان کیا ہے۔ مولانا محمد تقی عثمانیؒ نے اس حدیث کی شرح میں لکھا ہے:

> ''اس حدیث میں اپنے گناہوں پر شرمندہ ہونے والے لوگوں کے لیے تسلی ہے کہ ان کے توبہ واستغفار کرنے سے ان کے گناہ دھل جائیں گے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انسان بے خوف وخطر گناہوں کا ارتکاب کرنے لگے۔ اس لیے کہ اللہ سبحانہ تعالیٰ نے انھیں حرام قرار دیا ہے۔ بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر کبھی اس سے کوئی گناہ سرزد ہوجائے تو وہ اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو، بلکہ اس سے مغفرت طلب کرے۔ اس کا استغفار اس کے گناہ کے لیے کفارہ بن جائے گا۔'' (۱)

ایک حدیث کی تحقیق

سوال: میں جس مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھتا ہوں اس میں خطبہ میں یہ حدیث پڑھی جاتی ہے: السُّلْطَانُ ظِلُّ اللّٰهِ فِي اَرْضِه، مَنْ نَصَحه هَدَى وَ مَنْ غَشَّه ضَلَّ۔ (حکمراں اللہ کی زمین میں اس کا سایہ ہے۔ جس نے اس سے خیر خواہی کی وہ راہ یاب ہوا اور جس نے اُس کی بدخواہی کی وہ گم راہ ہوا)۔ جس مسجد میں یہ حدیث پڑھی جاتی ہے وہ ایک معروف مدرسے کی بڑی مسجد ہے۔

براہ کرم اس حدیث کے متعلق تفصیل سے تحریر فرمائیں۔ جواب پاکر ممنوں ہوں گا۔

جواب: یہ روایت علامہ جلال الدین سیوطی (م۹۱۱ھ) کی کتاب الجامع الصغیر من احادیث البشیر النذیر میں موجود ہے (روایت نمبر ۴۸۱۸) اس مضمون کی اور بھی کئی روایتیں مذکورہ کتاب میں ہیں۔ یہ روایتیں اس کے علاوہ بیہقی کی کتابوں السنن الکبریٰ اور شعب الایمان، دیلمی کی مسند الفردوس اور دیگر کتابوں میں بھی مروی ہیں، لیکن یہ سب ضعیف ہیں۔ آپ نے جو روایت درج کی ہے اس کی سند میں ایک راوی محمد بن یونس القرشی ہے۔ اس کے بارے میں ناقد حدیث ابن عدیؒ نے لکھا ہے کہ وہ حدیثیں گھڑ کر پیش کیا کرتا تھا۔ ابن حبانؒ کہتے ہیں: وہ حدیثیں گھڑ کر ثقہ لوگوں کی جانب منسوب کر دیتا تھا۔ علامہ ذہبی نے اس کا تذکرہ اپنی کتاب الضعفاء میں کیا ہے(۲) علامہ البانیؒ نے الجامع الصغیر کی صحیح اور غیر صحیح (ضعیف وموضوع وغیرہ)

---

(۱) تکملۃ فتح الملہم شرح صحیح مسلم، داراحیاء التراث العربی، بیروت، لبنان، ۲۰۰۶ء، ۹/۶

(۲) محمد عبدالرؤف، فیض القدیر شرح الجامع الصغیر، دارالکتب العلمیۃ، بیروت ۱۹۹۴ء

احادیث کو الگ الگ چھانٹ دیا ہے۔ انھوں نے اس روایت کو ضعیف الجامع الصغیر میں جگہ دی ہے اور اسے موضوع قرار دیا ہے۔

فاقہ کشی کے دوران پیٹ پر پتھر باندھنے کی روایت

سوال: جنگ احزاب کے وقت اسلامی حکومت قائم ہوئے پانچ سال کا عرصہ ہو گیا تھا۔ ایک بڑا معرکہ درپیش تھا۔ مقابلے کی تیاری کے آغاز ہی میں خندق کی کھدائی کے دوران تین تین دن سے متواتر فاقے کاٹے گئے۔ کچھ صحابہ کرامؓ نے اگر بیان کیا کہ ان کے پچکے ہوئے پیٹوں پر پتھر بندھے ہوئے ہیں تو نبی ﷺ نے اپنا کپڑا اٹھا کر دکھایا کہ یہاں دو پتھر بندھے ہوئے ہیں۔

برسر اقتدار ہونے کے باوجود، بہت بڑی جنگ کی تیاری کا آغاز اس طرح کے حالات میں ہوا، یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی عقل میں نہیں آتی کہ فاقہ کشی کے دوران پیٹ پر پتھر باندھے گئے۔ اس سے تو تکلیف میں اور اضافہ ہی ہوگا۔ براہ کرم وضاحت فرمائیں۔

جواب: غزوۂ احزاب ہجرت مدینہ کے پانچویں سال ہوا تھا۔ پورا عرب مدینہ پر چڑھ آیا تھا۔ یہود، مشرکین مکہ اور دیگر بہت سے قبائل اسلام اور مسلمانوں کو صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کرنے کا تہیہ کیے ہوئے تھے۔ اس جنگ کی منصوبہ بندی مسلمانوں نے نہیں کی تھی کہ انھوں نے پہلے اس کے لیے پوری تیاری کر لی ہو، تمام وسائل فراہم کر لیے ہوں، نفع و نقصان کا تخمینہ کر لیا ہو، سامانِ رسد اور غذائی اشیاء کا ذخیرہ کر لیا ہو، اس کے بعد جنگ چھیڑی ہو، بلکہ جنگ ان پر مسلط کی گئی تھی۔

رسول اللہ ﷺ کو دشمنوں کے لشکر عظیم کی خبر ملی تو آپؐ نے صحابہ کرامؓ سے مشورہ کیا۔ اس موقع پر حضرت سلمان فارسیؓ نے، جو کچھ عرصہ پہلے ہی ایمان لائے تھے، یہ تجویز پیش کی کہ فارس میں جب ہم اس طرح کے محاصرے کی صورتِ حال سے دوچار ہوتے ہیں تو اپنے گرد خندق کھود لیتے ہیں۔ یہ تجویز آپؐ کو بہت پسند آئی۔ آپؐ نے فوراً اس پر عمل درآمد کا حکم دے دیا۔ مدینہ کے بعض اطراف میں پہاڑیاں، پتھریلی زمین اور کھجور کے باغات تھے۔ ادھر سے حملے کا اندیشہ نہ تھا۔ جو حصہ کھلا ہوا تھا ادھر خندق کھودنے کا حکم دیا گیا۔ تقریباً تین ہفتوں کی مسلسل جدوجہد کے بعد خندق تیار ہو گئی۔ رسول اللہ ﷺ بہ نفس نفیس صحابہ کرامؓ کے ساتھ خندق کی کھدائی میں شریک رہے۔ بعض مواقع پر، جب زیر زمین کوئی چٹان کھدائی میں رکاوٹ ڈالتی تھی اور

صحابہ کرامؓ اسے توڑ نہیں پاتے تھے تو آپؐ آگے بڑھتے تھے اور آپؐ کی ایک ضرب سے چٹان پاش پاش ہو جاتی تھی۔

صحیح احادیث میں ہے کہ اس زمانے میں مدینہ میں خورد و نوش کی اشیاء کی شدید قلت تھی(۱) تھوڑا سا جو مل جاتا تو صحابہ کرامؓ اسے پرانے تیل میں پکا کر کھا لیتے تھے(۲) کبھی انھیں صرف کھجوروں پر گزارا کرنا پڑتا تھا(۳) بسا اوقات تین تین دن تک کھانے کی کوئی چیز ان کے منھ کو نہ لگتی تھی(۴) اس دوران آں حضرتؐ کے دست مبارک سے متعدد معجزات کا ظہور ہوا۔ تھوڑا سا کھانا، جو گنتی کے چند افراد کے لیے کفایت کر سکتا تھا، اس میں اتنی برکت ہوئی کہ سیکڑوں افراد اس سے شکم سیر ہوئے۔

اسی موقع کی ایک روایت حضرت ابو طلحہؓ سے مروی ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں:

شَكَوْنَا اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ الْجُوْعَ وَ رَفَعْنَا عَنْ بُطُوْنِنَا عَنْ حَجَرٍ حَجَرٍ، فَرَفَعَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَنْ حَجَرَيْنِ(۵)

''ہم نے رسول اللہ ﷺ سے بھوک کی شکایت کی اور اپنے پیٹ کھول کر دکھائے، جن پر ایک ایک پتھر بندھا ہوا تھا۔ یہ سن کر آپؐ نے اپنا شکم مبارک کھول کر دکھایا۔ اس پر دو پتھر بندھے ہوئے تھے۔''

امام ترمذیؒ نے اس روایت کے بارے میں لکھا ہے: هذا حديث غريب لا نعرفه الا من هذا الوجه (یہ حدیث غریب ہے، جو صرف اسی سند سے مروی ہے) علامہ البانی نے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔ لیکن غزوۂ خندق کے موقع پر بھوک کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ کا پیٹ پر باندھنا صحیح روایات سے ثابت ہے۔ حضرت جابر بن عبد اللہؓ سے مروی ایک طویل روایت میں ہے:

ثُمَّ قَامَ وَ بَطْنُهٗ مَعْصُوْبٌ بِحَجَرٍ(۶)

''پھر آپؐ کھڑے ہوئے۔ اس وقت آپؐ کے پیٹ پر ایک پتھر بندھا ہوا تھا۔''

---

(۱) بخاری، کتاب المغازی، باب غزوۃ الخندق و هی الاحزاب، ۴۱۰۱

(۲) فتح الباری بشرح صحیح البخاری، ۷/ ۳۹۲

(۳) البدایۃ والنہایۃ، ابن کثیر ۴/ ۹۹

(۴) بخاری، کتاب المغازی، ۴۱۰۱

(۵) ترمذی، کتاب الزهد، باب ماجاء فی معیشۃ اصحاب النبی، ۲۳۷۱

(۶) بخاری، کتاب المغازی، باب غزوۃ الخندق ۴۱۰۱

عربوں میں اس زمانے میں ایک چلن یہ تھا کہ وہ شدت بھوک کے احساس کو دبانے کے لیے پیٹ پر پتھر باندھ لیا کرتے تھے۔ اسے پتھر کو مشبعۃ کہا جاتا تھا، یعنی بھوک کا احساس ختم کرنے والا اور آسودگی کا احساس دلانے والا۔ علامہ ابن حجرؒ نے بخاری کی مذکورہ بالا روایت کی شرح میں لکھا ہے:

> ''پیٹ پر پتھر باندھنے کا فائدہ یہ ہے کہ پیٹ جب بھوک کی وجہ سے سکڑ جاتا ہے تو کمر جھک جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اس صورت میں اگر پیٹ پر پتھر رکھ کر اوپر سے کپڑا باندھ لیا جائے تو پیٹھ سیدھی رہتی ہے۔'' (۱)

کسی واقعے پر غور کرنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ اسے زمانۂ وقوع اور اس جیسے حالات میں لے جاکر اس پر غور کیا جائے۔ ہم آج بھی دیکھتے ہیں کہ کھیتوں میں کام کرنے والے یا محنت مزدوری کرنے والے اپنے پیٹ پر انگوچھا کس کر باندھ لیتے ہیں، اس کے بعد کام کرتے ہیں تو انھیں تکان کا احساس کم ہوتا ہے۔ ایئر کنڈیشن کمروں میں بیٹھنے اور مرغن غذائیں آسودہ ہوکر کھانے والوں کی عقل میں اس عمل کی افادیت نہیں آسکتی۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ بہتر (۷۲) گھنٹے بھوکے رہیں، پھر پانچ چھ گھنٹے سخت زمین پر پھاوڑا چلائیں، تب انھیں بہ خوبی اندازہ ہوجائے گا کہ پیٹ پر کپڑا باندھ کر پھاوڑا چلانے سے تکلیف میں اضافہ ہوتا ہے یا کچھ راحت محسوس ہوتی ہے۔

فضیلتِ رمضان پر مروی ایک حدیث کی تحقیق

سوال: رمضان کی فضیلت پر ایک حدیث عموماً بیان کی جاتی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: ''اوله رحمة و اوسطه مغفرة و آخره عتق من النار'' (اس کا ابتدائی حصہ رحمت، درمیانی حصہ مغفرت اور آخری حصہ جہنم سے نجات ہے)

ہمارے یہاں ایک اہلِ حدیث عالم نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ یہ حدیث ضعیف ہے، اس لیے اس کو رمضان کی فضیلت میں نہیں بیان کرنا چاہیے۔ اس حدیث کو ہم عرصہ سے سنتے اور کتابوں میں پڑھتے آئے ہیں، اس لیے ان کی بات عجیب سی لگی۔ بہ راہ کرم تحقیق کرکے بتائیں، کیا ان کی بات صحیح ہے؟

---

(۱) فتح الباری بشرح صحیح البخاری، ۷/۳۹۶

جواب: یہ حدیث احادیثِ نبوی کے مشہور مجموعہ مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الصوم میں شامل ہے۔ صاحبِ مشکوٰۃ نے اس کے سلسلے میں امام بیہقی کی شعب الایمان کا حوالہ دیا ہے۔ اس کے علاوہ یہ ابن خزیمہ کی صحیح، ابن حبان کی کتاب الثواب، سیوطی کی تفسیر الدر المنثور اور متقی ہندی کی کتاب کنز العمال اور دیگر کتابوں میں بھی مروی ہے۔ لیکن یہ حدیث ضعیف ہے۔ اس میں دو اعتبار سے ضعف پایا جاتا ہے۔

۱۔ یہ روایت حضرت سلمان فارسیؓ سے منسوب ہے۔ ان سے اس کی روایت مشہور تابعی حضرت سعید بن المسیبؒ نے کی ہے، جب کہ حضرت سلمان فارسیؓ سے حضرت سعید بن المسیب کی ملاقات ثابت نہیں ہے، اس بنا پر یہ روایت منقطع ہے۔

۲۔ اس کی سند میں ایک راوی علی بن زید بن جدعان ہے، جسے تمام مشہور ناقدین حدیث مثلاً حافظ ابن حجر، احمد، یحییٰ بن معین، نسائی، ابن خزیمہ جوز جانی، دار قطنی، ابوزرعہ، عقیلی، ذہبی وغیرہ نے ضعیف قرار دیا ہے۔ علامہ شیخ محمد ناصر الدین الالبانی نے اس روایت کو اپنی کتاب سلسلۃ الاحادیث الضعیفۃ والموضوعۃ میں درج کیا ہے اور اسے 'منکر' قرار دیا ہے۔ قدیم محدثین میں امام ابو حاتم رازی اور امام عینی نے بھی اس روایت کو منکر کہا ہے۔

علمائے کرام کا نقطۂ نظر یہ رہا ہے کہ فضائل کے باب میں ضعیف احادیث قابلِ استدلال ہیں، لیکن یہ بات معقول معلوم ہوتی ہے کہ کسی عمل کی فضیلت بیان کرنے کے لیے جب قرآن کریم کی آیات اور صحیح احادیث موجود ہوں تو ضعیف احادیث کو کیوں پیش کیا جائے؟ اس صورت میں تو ان سے اجتناب ہی اولیٰ ہے۔

ظہور مہدی کی حقیقت

سوال: میں گزشتہ آٹھ ماہ سے دہلی کی تہاڑ جیل نمبر ۴ میں پابند سلاسل ہوں اور ایک پیچیدہ مسئلے کا شکار ہوں۔ کسی بھی دینی حلقے سے کوئی رابطہ نہیں ہے۔ ہماری جیل میں ۶۵ آدمیوں پر مشتمل پاکستانی بھائیوں کی ایک جماعت ہے، جو خود کو امام مہدی کا پیروکار بتاتے ہیں۔ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ امام مہدی، جن کا اصلی نام ریاض احمد گوہر شاہی ہے، پاکستان میں پیدا ہوئے۔ جب

انھوں نے اپنے دعوے کا اعلان کیا تو پاکستانی علماء اور حکومت کے افراد ان کے دشمن بن گئے، چنانچہ انھوں نے مجبور ہو کر لندن میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ ان لوگوں کے بہ قول ریاض احمد گوہر شاہی (امام مہدی) کے پاس بہ راہ راست اللہ کی طرف سے تعلیمات آتی ہیں۔ یہ لوگ خود کو طریقت کا پیرو بتاتے ہیں، شریعت کا ان کی زندگیوں میں شائبہ تک نہیں ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ اللہ کا ذکر عام کر رہے ہیں۔ اس کے ذریعہ لوگوں کے دلوں میں اللہ کا نور آتا ہے اور باطن پاک ہو جاتا ہے۔ دل میں نور آنے کے لیے ایمان لانا شرط نہیں ہے۔ نور کسی کے دل میں بھی آ سکتا ہے، چاہے وہ ہندو ہو، سکھ ہو، یہودی ہو یا عیسائی ہو۔ ان کے بہ قول اللہ نے ازل سے ہی مومن روحیں پیدا کی ہیں، جو ہر قوم وملت میں ہیں۔ یہ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ دنیا میں حضرت آدم اوّلین انسان نہیں تھے، بلکہ ہر قوم کا اپنا اپنا آدم ہے۔ مختلف رنگوں اور نسلوں کے لوگ اس وجہ سے الگ الگ ہیں کہ ہر قوم کا آدم الگ ہے۔ یہ لوگ خود کو ذکر والے بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ریاض احمد گوہر شاہی (امام مہدی) دین الٰہی کے علم بردار ہیں۔ ان کے بہ قول اللہ تعالیٰ نے نبوت ختم کی ہے، خلافت نہیں اور امام مہدی آخری خلیفہ ہیں۔

گزارش ہے کہ قرآن وسنت کی روشنی میں امام مہدی کے ظہور کے سلسلے میں ہماری رہ نمائی فرمائیں۔ موجودہ دور میں یہ بہت بڑے مسئلہ کی صورت اختیار کرتا جا رہا ہے۔

جواب: قرب قیامت کی علامات میں سے ایک مہدی کا ظہور بھی ہے۔ قرآن کریم میں اس کا کوئی ذکر یا اشارہ نہیں ہے، لیکن اس سلسلے میں احادیث کثرت سے مروی ہیں۔ ان احادیث کا خلاصہ یہ ہے کہ آخری زمانے میں اللہ تعالیٰ ایک حکم راں کو پیدا کرے گا جو بڑا انصاف پرور ہوگا۔ وہ اس امت کی سربراہی کرے گا۔ اس کے عہد حکم رانی میں روئے زمین پر عدل وانصاف کا بول بالا ہوگا، جب کہ اس سے پہلے ظلم وجور عام ہوگا۔ مہدی کی اور بھی بہت سی صفات احادیث میں مذکور ہیں۔

ظہور مہدی کی یہ احادیث اگرچہ صحیحین (بخاری ومسلم) میں مروی نہیں ہیں، لیکن حدیث کی دیگر بہت سی کتابوں میں ان کی تخریج کی گئی ہے، مثلاً سنن اربعہ (ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ) مسند احمد، صحیح ابن حبان، مستدرک حاکم، معجم طبرانی وغیرہ۔ متعدد علماء نے ان احادیث کو مستقل کتابوں میں جمع کر دیا ہے۔ اس سلسلے میں حافظ ابونعیم کی کتاب العرف الوردی فی اخبار

المھدی، ابن حجر مکی کی کتاب القول المختصر فی علامات المھدی المنتظر، ملا علی قاری کی کتاب المشرب الوردی فی مذھب المھدی قابل ذکر ہیں۔ حافظ ابن کثیرؒ نے اس موضوع پر ایک مستقل رسالہ لکھا ہے اور اپنی کتاب الفتن والملاحم میں بھی اس کا تذکرہ کیا ہے۔ ان کے علاوہ متقی ہندی صاحب کنز العمال، مرعی بن یوسف حنبلی، صنعانی اور دیگر اہل علم نے بھی مستقل کتابیں تصنیف کی ہیں۔ حال ہی میں شیخ عبدالمحسن بن حمد العباد کی ایک کتاب اس موضوع پر شائع ہوئی ہے، جس کا نام ہے: عقیدہ اھل السنۃ والاثر فی المھدی المنتظر۔

بعض حضرات ظہور مہدی کا بالکلیہ انکار کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اس موضوع پر جتنی بھی احادیث مروی ہیں سب ضعیف اور موضوع ہیں۔ ان کی یہ بات علی الاطلاق درست نہیں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس موضوع کی بہت سی احادیث ضعیف اور من گھڑت ہیں، لیکن بہت سی احادیث صحیح یا حسن بھی ہیں، ناقدینِ حدیث اور ائمہ اسلام نے ان کی صحت تسلیم کی ہے اور ظہور مہدی کا اثبات کیا ہے۔ ان میں شیخ ابن العربی مالکی، علامہ قرطبی، شیخ الاسلام ابن تیمیہ، علامہ ابن قیم الجوزیہ، حافظ ابن حجر عسقلانی اور حافظ سیوطی رحمہم اللہ قابل ذکر ہیں۔ موجودہ دور کے عظیم محدث علامہ محمد ناصر الدین الالبانیؒ نے بھی اس موضوع کی بہت سی احادیث کو صحیح قرار دیا ہے[1] بعض اہل علم نے ایسی صحیح احادیث کو جمع کر دیا ہے، مثلاً ملاحظہ کیجئے شیخ عبدالمحسن بن حمد العباد کی کتاب الردّ علی من کذب بالاحادیث الصحیحۃ الواردۃ فی المھدی اور شیخ حمود بن عبداللہ بن حمد التویجری کی کتاب الاحتجاج بالأثر علی من انکر المھدی المنتظر۔

مہدی کے بارے میں شیعہ امامیہ کا عقیدہ اہل سنت سے کچھ مختلف ہے۔ ان کے نزدیک یہ ان کے بارہویں امام ہیں، جو اپنے بچپن میں سامرّاء کے غار میں روپوش ہوگئے تھے۔ آخری زمانے میں وہ پھر ظاہر ہوں گے۔ یہ لوگ ان کی واپسی کا انتظار کر رہے ہیں۔

مہدی کے بارے میں صحیح نقطۂ نظر کیا ہے؟ اس کی وضاحت علامہ عبدالعزیز بن عبداللہ بن بازؒ کے اس بیان سے ہوتی ہے:

> ”مہدی کا معاملہ معروف ہے۔ اس کے بارے میں کثرت سے احادیث آئی ہیں، بلکہ وہ تواتر کی حد تک پہنچی ہوئی ہیں اور مضبوط ہیں۔ متعدد اہل علم نے ان احادیث کا

---

(۱) ملاحظہ کیجئے: سلسلۃ الاحادیث الصحیحۃ، ۳۳۶/۲، حدیث: ۷۱۱، ۳۸/۴، حدیث: ۱۵۲۹، صحیح الجامع الصغیر، حدیث: ۵۱۸۰، ۵۱۸۱، مشکوۃ المصابیح بتحقیق الالبانی، ۲۴/۳ وغیرہ

متواتر ہونا بیان کیا ہے۔ ان کا تواتر معنوی ہے، اس لیے کہ وہ بہت سی سندوں سے مروی ہیں، مختلف کتب حدیث میں ان کی تخریج کی گئی ہے، مختلف صحابہ سے مختلف راویوں کے واسطے سے، مختلف الفاظ میں مروی ہیں۔ یہ امام آخری زمانے میں امت پر اللہ تعالیٰ کے رحم و کرم کی نشانی ہوگی۔ یہ ظاہر ہوگا تو عدل و انصاف قائم کرے گا، ظلم و جور کا خاتمہ کرے گا۔ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ اس امت پر خیر کا علم بلند کرے گا، عدل و انصاف کی حکم رانی ہوگی اور لوگوں کو ہدایت کی توفیق ہوگی۔ میں نے اس کے بارے میں بہت سی احادیث سے آگاہی حاصل کی ہے۔ میں نے پایا ہے، جیسا کہ شوکانیؒ اور ابن قیمؒ وغیرہ نے فرمایا ہے کہ ان میں صحیح احادیث بھی ہیں، حسن بھی ہیں، ایسی ضعیف بھی ہیں جن کا ضعف دوسری احادیث سے دور ہو جاتا ہے، اور موضوع روایات بھی ہیں۔ اس سلسلے میں ہمارے لیے صرف وہ روایات کافی ہیں جن کی سندیں درست ہوں، خواہ وہ صحیح لذاتہ ہوں یا صحیح لغیرہ، حسن لذاتہ ہوں یا حسن لغیرہ۔ اسی طرح اگر ضعیف احادیث کا ضعف دور ہو جائے اور ایک دوسرے کی انھیں تقویت مل جائے تو وہ بھی اہل علم کے نزدیک حجت ہیں۔ صحیح بات یہ ہے کہ جمہور اہل علم کا اس بات پر اتفاق ہے کہ مہدی کا معاملہ ثابت شدہ ہے، اس کا آنا برحق ہے، وہ آخری زمانے میں ظاہر ہوگا۔'' (۱)

تاریخ اسلام میں متعدد افراد ایسے گزرے ہیں جنھوں نے مہدی ہونے کا دعویٰ کیا ہے، یا دوسروں نے انھیں مہدی قرار دیا ہے، لیکن وہ جھوٹے ثابت ہوئے ہیں۔ درج بالا سوال میں ایک پاکستانی گروہ کے حوالے سے جس نام نہاد مہدی کا تذکرہ کیا گیا ہے وہ بھی بہروپیا معلوم ہوتا ہے، اس لیے کہ اس کے اور اس کے پیروکاروں کے عقائد و نظریات عقل و شریعت کی میزان پر پورے نہیں اترتے:

(۱) اس گروہ کے افراد کا کہنا ہے کہ ان کے مہدی پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بہ راہ راست تعلیمات آتی ہیں۔ یہ کہہ کر درحقیقت یہ لوگ مغالطہ دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بہ راہ راست تعلیمات پہلے وحی کی شکل میں حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ذریعہ آتی تھیں۔ حضرت محمد ﷺ پر نبوت ختم ہو جانے کے بعد اب یہ سلسلہ بند ہو گیا ہے۔ جہاں تک الہام یا القاء کا تعلق ہے یہ کسی بھی فرد پر ہو سکتا ہے، لیکن دین

---

(۱) بہ حوالہ الرّد علی من کذب بالاحادیث الصحیحۃ الواردۃ فی المہدی، شیخ عبد المحسن بن حمد، ص: ۱۵۷

میں یہ حجت نہیں ہے اور یہ چیز کسی شخص کو شریعت کی پابندی سے آزاد نہیں کرسکتی۔

(۲) دین کو شریعت اور طریقت کے خانوں میں تقسیم کرنا، خود کو طریقت کا پیرو بتانا اور شرعی پابندیوں سے آزاد رہنا، یہ بہت بڑا فتنہ ہے۔ پہلے نام نہاد صوفیہ اس قسم کی باتیں کہتے رہے ہیں، لیکن معتبر صوفیہ نے اس گم راہ کن خیال کی سختی سے تردید کی ہے اور شریعت کی پابندی کو ہر مسلمان کے لیے لازمی قرار دیا ہے۔

(۳) یہ بات بھی صحیح نہیں ہے کہ مومن روحیں ہر مذہب میں پائی جاتی ہیں اور صرف اسلام کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں۔ یہ بات وحدت ادیان کے علم بردار کہتے ہیں، جن کا خیال ہے کہ تمام مذاہب برحق ہیں، کسی مذہب سے بھی وابستگی انسان کی نجات کے لیے کافی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ اور برحق دین صرف اسلام ہے۔ انسان کی اخروی نجات و فلاح کے لیے اسے قبول کرنا ضروری ہے۔ دیگر تمام مذاہب، چاہے اپنی ابتداء میں برحق رہے ہیں، لیکن زمانہ گزرنے کے ساتھ وہ مسخ ہوتے گئے اور خود ان کے ماننے والوں نے ان میں بہت سی تحریفات کر ڈالیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے سب سے آخر میں حضرت محمد ﷺ کو مبعوث فرمایا۔ آپ نے سابقہ مذاہب کی تحریفات کی نشان دہی کی اور اللہ کا حقیقی دین پیش کیا۔ یہ دین اپنی حقیقی شکل وصورت میں آج بھی موجود ہے۔ اس لیے حقیقی ایمان اسی صورت میں معتبر ہے، جب اسلام کی تعلیمات پر بے کم و کاست عمل کیا جائے۔

(۴) یہ کہنا کہ ہر قوم کا اپنا اپنا آدم ہے، اسی بنا پر انسانوں کے رنگوں اور نسلوں کا اختلاف وجود میں آیا ہے، ایک بے بنیاد بات ہے۔ اس کے پیچھے کوئی دلیل نہیں ہے۔

مذکورہ گروہ نے اپنے نام نہاد مہدی کے بارے میں اور بھی جو باتیں بتائی ہیں، سب غلط ہیں۔ احادیث میں مہدی کے جو اوصاف مذکور ہیں ان میں یہ بھی ہے کہ وہ شریعت کا پابند ہوگا، نمازوں میں لوگوں کی امامت کرے گا، خوب مال لٹائے گا، گن گن کر خزانے نہیں بھرے گا وغیرہ۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو فکری گم راہیوں سے محفوظ رکھے اور زندگی کے تمام پہلوؤں میں شریعت کی پابندی کی توفیق عطا فرمائے۔

خودنمائی اور خودستائی کا مظاہرہ

سوال: میرے لیے جو بات انتہائی تشویش ناک اور ناقابل فہم ہے وہ یہ ہے کہ دوسرے دنیا پرست مصنفین کی اتباع میں ہمارے تحریکی مصنفین نے بھی اپنی ذاتی شہرت کو لازم قرار دے رکھا ہے۔ اور تو اور، نوبت بایں جا رسید کہ انھیں توجہ دلایئے اور کل آخرت میں خداوند قدوس کے حضور جواب دہی کی بات کیجیے تو ارشاد ہوتا ہے کہ ’آپ ہی کو خدا کا خوف اور آخرت کا احساس ہے، کیا ہمیں نہیں ہے؟‘

ان کی کتابوں پر ان کے تعارف میں جو کچھ لکھا جاتا ہے اس میں مبالغہ آمیزی کی جاتی ہے اور تعریف و توصیف میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے جاتے ہیں۔ بعض کتابوں پر ان کے فوٹو بھی چھاپ دیے جاتے ہیں۔

آپ فرما سکتے ہیں کہ خودستائی اور خودنمائی کی یہ تحریریں، جن کا تم حوالہ دے رہے ہو، مصنف کے علم میں لائے بغیر شائع کر دی گئی ہیں۔ یہ کام ناشر کا ہو سکتا ہے، وہی مبالغہ آمیز طور پر اس طرح کی تحریریں شائع کر سکتا ہے۔ فوٹو شائع کرنے کا بھی ناشر ہی مجرم ہے۔ مصنف تو بے قصور اور لاعلم رہتا ہے۔‘ میں تھوڑی دیر کے لیے فرض کیے لیتا ہوں کہ مصنف خود اپنے منہ میاں مٹھو نہیں بنا۔ یہ کیا دھرا ’ناشر‘ کا ہے۔ یہاں اصل سوال یہ ہے کہ کیا واقعی آپ پسند نہیں کرتے کہ آپ کا کوئی رفیق آپ کی تعریف و تحسین اور قصیدہ خوانی میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے۔ اگر پسند کرتے ہیں تو معلوم یہی کرنا ہے کہ کیا قرآن وسنت میں اس کی گنجائش نکلتی ہے؟ اور دوسری اہم بات یہ کہ آپ کے نزدیک اس کی افادیت کیا ہے؟ کیا آپ کی کسی تحریر، کتاب اور تقریر کی اہمیت آپ کی اسناد اور بایوڈاٹا کی وجہ سے ہے؟ اور اگر آپ اس رجحان اور بدعت کو غلط اور آخرت فراموشی کی علامت تصور کرتے ہیں تو کیا کسی ’ناشر‘ کی یہ جسارت اور جرأت ہو سکتی ہے کہ آپ کی مرضی کے خلاف کوئی قدم اٹھا سکے؟

جواب: مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز سے شائع ہونے والی کتابوں پر ان کے مصنفین کا جو تعارف شائع ہوتا ہے وہ خود ان کا تیار کیا ہوا نہیں ہوتا، بلکہ اسے مکتبہ کا شعبۂ ادارت تیار کرتا ہے اور مصنفین کو دکھائے بغیر ان کی کتابوں پر شائع کر دیتا ہے۔ یہ موجودہ اشاعتی دنیا کا ٹرینڈ ہے۔ اس میں سیکولر، دینی اور تحریکی تمام حلقے شامل ہیں۔ پاکستان میں بھی تحریکِ اسلامی سے وابستہ

اشاعتی اداروں سے جو کتابیں شائع ہو رہی ہیں ان پر ان کے مصنفین کا تعارف شائع ہوتا ہے۔ بہ ہر حال اس معاملے میں تعارف اور تعریف کے فرق کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔ البتہ اگر کوئی شخص اپنی تعریف و توصیف خود اپنی زبان یا قلم سے کرے اور اپنے منہ میاں مٹھو بنے اور اس سے اس کا مقصد دوسروں پر اپنی بڑائی جتانا ہو، یا وہ خواہش رکھے کہ دوسرے اس کے سامنے یا اس کے پیٹھ پیچھے اس کی خوب تعریف اور قصیدہ خوانی کریں تو یہ شریعت اسلامی میں سخت ناپسندیدہ ہے۔ احادیث میں اس پر سخت وعید سنائی گئی ہے۔

ایک صحیح حدیث مروی ہے۔ مدینے سے باہر رہنے والے ایک تابعی - شفی اصبحی - بیان کرتے ہیں کہ میں مدینہ آیا اور مسجد نبویؐ میں نماز پڑھنے گیا تو دیکھا کہ لوگ بڑی تعداد میں ایک بزرگ کو گھیرے ہوئے ہیں اور ان سے استفادہ کر رہے ہیں۔ دریافت کرنے پر پتا چلا کہ وہ صحابیِ رسولؐ حضرت ابو ہریرہؓ ہیں۔ میں نے تھوڑی دیر انتظار کیا۔ جب تمام لوگ چلے گئے اور وہ تنہا رہ گئے تو میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی: مجھے کوئی ایک حدیث سنا دیجیے جو آپ نے رسول اللہ ﷺ سے سنی ہو اور وہ آپ کو اچھی طرح یاد ہو۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا: ٹھیک ہے، سناتا ہوں، لیکن قبل اس کے کہ وہ حدیث بیان کرتے، اچانک بے ہوش ہو گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد انھیں ہوش آیا تو بولے: میں اس وقت ایک ایسی حدیث سناؤں گا جو رسول اللہ ﷺ نے اس وقت بیان کی تھی جب آپؐ کی خدمت میں میرے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ لیکن قبل اس کے کہ وہ حدیث سنانا شروع کرتے پھر غش کھا کر گر پڑے۔ تھوڑی دیر کے بعد ہوش میں آئے تو بولے: اس حدیث کو میں نے رسول اللہ ﷺ سے اسی مسجد میں سنا ہے۔ اتنا ہی بول پائے تھے کہ پھر ان پر غشی طاری ہو گئی۔ راوی کہتے ہیں کہ اسی طرح وہ چار مرتبہ بے ہوش ہوئے۔ چوتھی مرتبہ ان کی بے ہوشی شدید تھی۔ وہ اوندھے منہ گر گئے تھے۔ میں نے انھیں اٹھایا اور دیر تک سہارا دیے رہا۔ جب انھیں ہوش آیا اور ان کے حواس بحال ہوئے تب انھوں نے حدیث بیان کی۔ یہ وہی مشہور حدیث ہے جس میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے تین طرح کے لوگوں کو حاضر کیا جائے گا: عالم، مال دار اور شہید۔ اللہ تعالیٰ عالم سے پوچھے گا: کیا میں نے تجھے علم دین سے نہیں نوازا تھا؟ وہ جواب دے گا: ہاں کیوں نہیں، اے میرے رب۔ اللہ کہے گا: پھر تو نے کیا کیا؟ وہ جواب دے گا: میں نے دن رات اس کی اشاعت کی۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تو جھوٹ بولتا ہے۔ تیری خواہش تھی

کہ لوگ تجھے عالم کہیں اور لوگوں نے کہا۔ حدیث میں تفصیل ہے کہ اسی طرح مال دار اور شہید سے بھی پوچھا جائے گا۔ آخر میں حضرت ابو ہریرہؓ نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے گھٹنے پر ہاتھ مارا اور فرمایا: اے ابو ہریرہؓ قیامت کے دن جہنم میں سب سے پہلے انھی تین طرح کے لوگوں کو ڈالا جائے گا۔ اسی روایت میں آگے ایک دوسرے راوی بیان کرتے ہیں کہ یہی صاحب حضرت معاویہ بن ابی سفیانؓ کی خدمت میں پہنچے اور ان کے سامنے پوری تفصیل بیان کی کہ کس طرح وہ مدینہ گئے اور مسجد نبویؐ میں حضرت ابو ہریرہؓ سے ان کی ملاقات ہوئی تو ان سے حدیث سنانے کی خواہش کی اور کس طرح حضرت ابو ہریرہؓ حدیث سنانے سے پہلے چار مرتبہ بے ہوش ہوئے اور وہ کیا حدیث تھی؟ حدیث سن کر حضرت معاویہؓ پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہوئی۔ انھوں نے فرمایا: جب ایسے ایسے لوگوں کے ساتھ قیامت میں یہ معاملہ ہوگا تو دیگر لوگوں کا کیا حال ہوگا۔ راوی بیان کرتے ہیں کہ پھر حضرت معاویہؓ اتنا روئے، اتنا روئے کہ ہم گمان کرنے لگے کہ اسی حالت میں ان کی جان نکل جائے گی۔ ہم اس آدمی کو ملامت کرنے لگے جس نے وہ حدیث سنائی تھی اور جسے سن کر ان کی یہ حالت ہوئی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد جب ان کی طبیعت سنبھلی تو انھوں نے چہرہ صاف کیا اور فرمایا: 'اللہ اور اس کے رسولؐ نے سچ کہا ہے۔' پھر انھوں نے قرآن کی یہ آیت تلاوت فرمائی:

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَ زِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ○ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ ۖ وَ حَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا وَ بٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ○ (ہود: ۱۵، ۱۶)

''جو لوگ بس اس دنیا کی زندگی اور اس کی خوش نمائیوں کے طالب ہوتے ہیں ان کی کارگزاری کا سارا پھل ہم یہیں ان کو دے دیتے ہیں اور اس میں ان کے ساتھ کوئی کمی نہیں کی جاتی۔ مگر آخرت میں ایسے لوگوں کے لیے آگ کے سوا کچھ نہیں ہے۔ (وہاں معلوم ہوجائے گا کہ) جو کچھ انھوں نے دنیا میں بنایا وہ سب ملیا میٹ ہوگیا اور اب ان کا سارا کیا دھرا محض باطل ہے۔'' (۱)

(۱) ترمذی، کتاب الزهد، باب ماجاء فی الریاء والسمعة۔ ۲۳۸۲۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی یہ حدیث صحیح مسلم، کتاب الامارة، باب من قاتل لتكون كلمة الله هی العلیا... ۱۹۰۵ میں بھی مروی ہے، لیکن پس منظر کے بغیر۔

رہی یہ بات کہ کیا تعریف و تحسین کی قرآن وسنت میں کوئی گنجائش نکلتی ہے؟ اس کے جواب میں عرض ہے کہ اس موضوع پر دینی لٹریچر میں بہت مواد موجود ہے، لیکن اس وقت تفصیل میں جانے کا موقع نہیں ہے۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر صرف مشہور محدث، صحیح مسلم کے شارح اور منتخب احادیث کی مشہور کتاب ریاض الصالحین کے مرتب امام نوویؒ (م۶۷۶ھ) کی کتاب الاذکار کا ایک اقتباس نقل کردوں کہ وہ اس موضوع پر کافی وشافی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے:

''کسی انسان کے اچھے اوصاف پر اس کی مدح وثنا اس کے منہ پر بھی کی جاتی ہے اور اس کے غائبانہ میں بھی۔ جہاں تک غائبانہ میں مدح وثنا کا معاملہ ہے تو اس کی ممانعت نہیں ہے، الاّ یہ کہ مدح کرنے والا اوٹ پٹانگ باتیں کرنے لگے اور غلط باتیں اپنے منہ سے نکالنے لگے۔ اس وقت ایسا کرنا حرام ہوگا۔ مدح کی وجہ سے نہیں، بلکہ جھوٹ کی وجہ سے۔ یہ مدح، جس میں کوئی جھوٹ نہ ہو، اس وقت مستحب ہے، جب اس میں کوئی مصلحت ہو یا اس سے کوئی فساد لازم نہ آئے کہ تعریف کرنے والے کی باتیں اس شخص تک پہنچ جائیں جس کی وہ تعریف کر رہا ہے اور وہ فتنے میں پڑ جائے۔ جہاں تک کسی شخص کے منہ پر اس کی تعریف کرنے کا سوال ہے تو اس سلسلے میں ایسی احادیث بھی مروی ہیں جن سے اس کی اباحت یا استحباب کا حکم معلوم ہوتا ہے اور ایسی احادیث بھی ہیں جن سے اس کی ممانعت ثابت ہوتی ہے۔ علماء کہتے ہیں: ان بہ ظاہر متضاد احادیث کے درمیان جمع وتطبیق یوں دی جاسکتی ہے کہ کہا جائے: اگر ممدوح کمالِ ایمان، حسنِ یقین، ریاضتِ نفس اور معرفتِ تام سے اس حد تک بہرہ ور ہو کہ اپنی تعریف کی باتیں سن کر وہ کسی فتنے میں مبتلا نہ ہو، اپنے بارے میں دھوکے کا شکار نہ ہو اور اس کا نفس اسے کھلونا نہ بنالے تو اس کے منہ پر اس کی تعریف کرنا حرام ہے نہ مکروہ، لیکن اگر اس کے سلسلے میں ان میں سے کسی بات کا خوف ہو تو اس کی مدح کرنا شدید مکروہ ہے۔

کسی کے منہ پر اس کی تعریف کی ممانعت کے سلسلے میں جو احادیث مروی ہیں ان میں سے چند یہ ہیں:

۱- روایت میں ہے کہ حضرت عثمان بن عفانؓ کے سامنے ایک شخص ان کی تعریف کرنے لگا۔ وہاں حضرت مقدادؓ بھی موجود تھے۔ انھوں نے جھک کر زمین سے ایک مٹھی ریت

اٹھائی اور اس کے منہ پر دے ماری۔ حضرت عثمانؓ نے فرمایا: ارے، یہ کیا کر رہے ہو؟ انھوں نے جواب دیا کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا ہے:

اِذَا رَاَیْتُمُ الْمَدَّاحِیْنَ فَاحْثُوا فِیْ وُجُوْهِهِمِ التُّرَابَ(۱)

''جب تم دیکھو کہ لوگ مبالغہ آمیز تعریف کر رہے ہیں تو ان کے منہ پر مٹی ڈال دو۔''

۲- حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ کی مجلس میں ایک شخص دوسرے شخص کی خوب مبالغہ آمیز مدح وستائش کرنے لگا۔ آپؐ نے اس کی باتیں سنیں تو فرمایا:

اَهْلَکْتُمْ اَوْ قَطَعْتُمْ ظَهْرَ الرَّجُلِ(۲)

''تم لوگوں نے اس شخص کو ہلاک کر دیا (یا فرمایا) تم لوگوں نے اس شخص کی کمر توڑ دی۔''

۳- حضرت ابو بکرۃؓ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ کی مجلس میں ایک شخص کا تذکرہ آیا تو ایک شخص نے اس کی خوب تعریف کی۔ اس پر آپؐ نے فرمایا:

وَیْحَکَ، قَطَعْتَ عُنُقَ صَاحِبِکَ ''تمھارا برا ہو، تم نے اپنے ساتھی کا سر قلم کر دیا۔''

یہ جملہ آپؐ نے کئی بار دہرایا۔ پھر فرمایا:

مَنْ کَانَ مِنْکُمْ مَادِحًا اَخَاهُ فَلْیَقُلْ اَحْسِبُ فُلَانًا وَاللّٰهُ حَسِیْبُهٗ وَلَا اُزَکِّیْ عَلَی اللّٰهِ اَحَدًا، اَحْسِبُهٗ کَذَا وَ کَذَا اِنْ کَانَ یَعْلَمُ ذٰلِکَ مِنْهُ(۳)

''تم میں سے جو شخص اپنے بھائی کے اندر کوئی خوبی پاتا ہو اور وہ اس کی تعریف کرنا چاہے تو یوں کہے: میں فلاں شخص کو ایسا سمجھتا ہوں، حقیقت حال سے تو اللہ باخبر ہے۔ میں اللہ کے سامنے کسی کو بے عیب نہیں کہہ سکتا۔ اگر اسے واقعی معلوم ہو تو کہے کہ میرا خیال ہے کہ اس کے اندر فلاں فلاں خوبیاں ہیں۔''

جن احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی شخص کی تعریف اس کے منہ پر کرنا جائز ہے وہ بے شمار ہیں۔ ان میں سے چند کی طرف ہم ذیل میں اشارہ کرتے ہیں:

---

(۱) مسلم، کتاب الزهد والرقائق، باب النهی عن المدح اذا کان فیه افراط، ۳۰۰۲

(۲) بخاری، کتاب الشهادات، باب ما یکره من الاطناب فی المدح ۲۶۶۳، مسلم: ۳۰۰۱

(۳) بخاری کتاب الشهادات، باب اذا زکّی رجل رجلا کفاه، ۲۶۶۲، ۶۰۶۱، ۶۱۶۲، مسلم: ۳۰۰۰

۱- غارِ ثور میں اللہ کے رسول ﷺ نے حضرت ابوبکرؓ کو مخاطب کر کے فرمایا: ان دو کے بارے میں تمھارا کیا خیال ہے جن کے ساتھ تیسرا اللہ ہے۔(۱)

۲- ایک موقع پر جب اللہ کے رسول ﷺ نے ان لوگوں کو وعید سنائی جو گھمنڈ کی وجہ سے اپنا ازار ٹخنوں سے نیچا رکھتے ہیں تو حضرت ابوبکرؓ نے عرض کی: میرا ازار بھی نیچے کھسک جاتا ہے۔ اس پر آپؐ نے فرمایا: تم ان لوگوں میں سے نہیں ہو۔(۲)

۳- ایک موقع پر اللہ کے رسول ﷺ نے حضرت ابوبکرؓ کے سامنے فرمایا: ''اپنی رفاقت اور مال کے ذریعے میرے اوپر سب سے زیادہ احسان کرنے والے ابوبکر ہیں۔'' (۳)

۴- ایک مرتبہ آں حضرت ﷺ نے فرمایا: ''قیامت میں کچھ لوگ ایسے ہوں گے جنھیں جنت میں داخلے کے لیے اس کے تمام دروازوں سے پکارا جائے گا۔'' حضرت ابوبکرؓ نے دریافت کیا: اے اللہ کے رسول ﷺ وہ کون لوگ ہوں گے؟ فرمایا: ''مجھے امید ہے کہ ان میں سے تم بھی ہوگے۔'' (۴)

۵- ایک مرتبہ حضرت ابوبکرؓ آں حضرت ﷺ سے شرفِ ملاقات حاصل کرنے کے لیے گئے اور اجازت طلب کی۔ آپؐ نے فرمایا: ''انھیں آنے دو اور انھیں جنت کی بشارت دے دو۔'' (۵)

۶- ایک مرتبہ احد پہاڑ پر رسول اللہ ﷺ کے ساتھ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ موجود تھے۔ زلزلے کے ہلکے جھٹکوں کا احساس ہوا تو آپؐ نے فرمایا: ''احد ٹھہر جا، اس وقت تیرے اوپر ایک نبی، ایک صدیق اور دو شہید ہیں۔'' (۶)

۷- ایک موقع پر رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمرؓ کو مخاطب کر کے فرمایا: ''میں نے جنت کی سیر کی تو اس میں ایک محل دیکھا۔ میں نے دریافت کیا: یہ کس کا ہے؟ مجھے بتایا گیا کہ عمر کا ہے۔ میں نے اسے اندر سے دیکھنے کا ارادہ کیا، لیکن مجھے تمھاری غیرت کا خیال

---

(۱) بخاری: ۳۶۵۳، مسلم: ۲۳۸۱

(۲) بخاری: ۵۷۸۴، مسلم ۲۰۸۵

(۳) بخاری: ۳۶۵۴، مسلم: ۲۳۸۲

(۴) بخاری: ۱۸۹۷، مسلم: ۱۰۲۷

(۵) بخاری: ۳۶۷۴، مسلم: ۲۳۹۳

(۶) بخاری: ۳۶۷۵

آ گیا، اس لیے نہیں گیا۔'' حضرت عمرؓ نے جواب دیا: ''اے اللہ کے رسولؐ! کیا میں آپ کے مقابلے میں غیرت کا مظاہرہ کروں گا۔'' (۱)

۸- ایک مرتبہ آپؐ نے فرمایا: ''اے عمر! تم جس راستے پر چلتے ہو، اگر ادھر سے شیطان گزرے تو وہ اپنا راستہ بدل دیتا ہے۔'' (۲)

۹- ایک بار حضرت عثمانؓ نے خدمت نبویؐ میں باز یابی چاہی تو آپؐ نے فرمایا: ''عثمان کے لیے دروازہ کھولو اور انھیں جنت کی بشارت دے دو۔'' (۳)

۱۰- ایک موقع پر آپؐ نے حضرت علیؓ سے فرمایا: ''تم مجھ سے ہو اور میں تم سے ہوں۔'' (۴)

۱۱- ایک مرتبہ آپؐ نے حضرت علیؓ سے ارشاد فرمایا: ''کیا تم اس بات سے خوش نہیں ہو کہ مجھ سے تمھارا ویسا ہی تعلق ہے جیسا کہ ہارونؑ کا موسیٰؑ سے تھا۔'' (۵)

۱۲- ایک موقع پر آپؐ نے حضرت بلالؓ سے فرمایا: ''میں نے جنت میں تمھارے جوتوں کی آواز اپنے آگے آگے سنی ہے۔'' (۶)

۱۳- ایک مرتبہ آپؐ نے حضرت ابی بن کعبؓ سے فرمایا: ''اے ابو منذر، تمھیں علم مبارک ہو۔'' (۷)

۱۴- ایک بار آپؐ نے حضرت عبداللہ بن سلامؓ سے فرمایا: ''تم زندگی کی آخری سانس تک اسلام پر قائم رہو گے۔'' (۸)

۱۵- ایک مرتبہ حضرت ابوطلحہؓ اور ان کی زوجہ محترمہ نے اپنے گھر ایک مہمان کو رکھا۔ اسے کھانا کھلایا اور خود بھوکے سو رہے۔ اگلے دن وہ خدمتِ نبویؐ میں حاضر ہوئے تو آپؐ نے فرمایا: ''اللہ کو تم دونوں کا عمل بہت پسند آیا۔'' (۹)

---

(۱) بخاری: ۳۲۴۲، مسلم: ۲۳۹۵
(۲) بخاری: ۳۲۹۴، مسلم: ۲۳۹۶
(۳) بخاری: ۳۶۹۵، مسلم: ۲۴۰۳
(۴) بخاری: ۲۶۹۹، مسلم: ۱۷۸۳
(۵) بخاری: ۳۷۰۶، مسلم: ۲۴۰۴
(۶) بخاری: ۱۱۴۹
(۷) مسلم: ۸۱۰، ابوداؤد: ۱۴۶۰
(۸) بخاری: ۳۸۱۳، مسلم: ۲۴۸۴
(۹) بخاری: ۳۷۹۸، مسلم: ۲۰۵۴

۱۶- ایک موقع پر آپؐ نے انصار کی کچھ عورتوں اور بچوں کو دیکھا تو فرمایا: ''تم لوگ میرے نزدیک بہت محبوب ہو۔'' (۱)

۱۷- قبیلۂ عبد القیس کا ایک وفد آپؐ سے ملنے آیا تو اس میں شامل ایک نوجوان سے، جس کا نام اشج تھا، آپؐ نے فرمایا: ''تمھارے اندر دو خصلتیں ایسی ہیں جو اللہ کو بہت محبوب ہیں: بردباری اور سنجیدگی۔'' (۲)

یہ تمام احادیث صحیح اور مشہور ہیں۔ اس طرح کی دیگر حدیثیں، جن میں آں حضرت ﷺ نے کسی شخص کے منہ پر اس کی تعریف کی ہے، بہت ہیں۔ جہاں تک ان روایات کا تعلق ہے، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ وتابعین اور بعد کے علماء وائمہ نے دوسروں کے منہ پر ان کی تعریف کی ہیں، وہ تو اتنی زیادہ ہیں کہ ان کا شمار ممکن نہیں۔

امام غزالیؒ نے احیاء علوم الدین کی کتاب الزکوٰۃ کے آخر میں لکھا ہے: ''اگر کوئی شخص کسی کو صدقہ دے تو صدقہ لینے والے کو دیکھنا چاہیے۔ اگر صدقہ دینے والا ان لوگوں میں سے ہو جو پسند کرتے ہیں کہ ان کا شکریہ ادا کیا جائے اور دوسروں میں ان کا چرچا ہو تو صدقہ لینے والے کو چاہیے کہ اس صدقے کا کسی سے ذکر نہ کرے۔ اس لیے کہ اس پر اس کا حق ہے کہ ظلم کے معاملے میں اس کی مدد نہ کرے اور شکر گزاری چاہنا ظلم ہے۔ لیکن اگر اس کے حال سے ظاہر ہو کہ وہ شکر وسپاس پسند نہیں کرتا اور اس کا خواہاں نہیں ہے تو صدقہ قبول کرنے والے کو چاہیے کہ اس کا شکریہ ادا کرے اور دوسروں میں بھی اس کا چرچا کرے۔ امام سفیان ثوریؒ فرماتے ہیں: 'جس شخص کو اپنی ذات کی معرفت حاصل ہوگی، اگر دوسرے لوگ اس کی تعریف وتوصیف کریں گے تو اسے کچھ نقصان نہ پہنچے گا۔''

کیا کوئی شخص اپنے منہ سے اپنی تعریف ومدح کر سکتا ہے اور اپنے محاسن گنا سکتا ہے؟

اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ (النجم:۳۲)

''پس تم اپنے نفس کی پاکی کے دعوے نہ کرو۔''

اپنے محاسن بیان کرنے کی دو صورتیں ہیں: ایک مذموم، دوسری پسندیدہ۔ مذموم صورت یہ ہے کہ آدمی اپنے محاسن فخر، گھمنڈ اور دوسروں پر برتری ظاہر کرنے کے لیے بیان کرے۔ اور پسندیدہ صورت یہ ہے کہ ان محاسن کے بیان کرنے میں کوئی دینی مصلحت ہو۔ مثلاً یہ کہ وہ کسی معروف کا حکم

---

(۱) بخاری: ۵۱۸۰، مسلم: ۲۵۰۸

(۲) مسلم: ۱۷

دے رہا ہو، کسی منکر سے روک رہا ہو، کوئی نصیحت کر رہا ہو، کسی اچھے کام کا مشورہ دے رہا ہو، تعلیم، تربیت، وعظ یا تذکیر کررہا ہو، لوگوں کے درمیان صلح صفائی کرا رہا ہو، اپنی ذات سے کسی شر کو دفع کر رہا ہو وغیرہ۔ اس وقت وہ اپنے محاسن بیان کرسکتا ہے اگر اس کی نیت یہ ہو کہ ایسا کرنے سے اس کے مخاطبین اس کی بات کو آسانی سے قبول کرلیں گے یا وہ جو کچھ کہہ رہا ہے اس پر اعتماد کریں گے، یا وہ کہہ سکتا ہے کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اسے میرے سوا کوئی دوسرا نہیں بیان کرسکتا، اس لیے اس بات کو مضبوطی سے پکڑ لو۔ اس مضمون کی بے شمار نصوص مروی ہیں۔ چند مثالیں ذیل میں پیش کی جاتی ہیں:

۱- غزوۂ حنین کے موقع پر اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: ''میں پیغمبر ہوں، اس میں کوئی شک نہیں ہے۔'' (۱)

۲- ایک موقع پر آپؐ نے فرمایا: ''میں تمام اولاد آدم کا سردار ہوں۔'' (۲)

۳- ایک مرتبہ آپؐ نے فرمایا: ''قیامت برپا ہوگی تو سب سے پہلے زمین سے مجھے نکالا جائے گا۔'' (۳)

۴- ایک موقع پر آپؐ نے صحابہ کرامؓ کو مخاطب کر کے فرمایا: ''اللہ کی قسم، میں تم میں سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا اور سب سے زیادہ متقی ہوں۔'' (۴)

۵- ایک مرتبہ آپؐ نے فرمایا: ''میری راتیں تو اس طرح گزرتی ہیں کہ میرا رب مجھے کھلاتا پلاتا ہے۔'' (۵)

۶- قرآن کریم میں ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے عزیز مصر سے فرمایا تھا:

اجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَآئِنِ الْاَرْضِ اِنِّیْ حَفِیْظٌ عَلِیْمٌ ○ (یوسف:۵۵)

''ملک کے خزانے میرے سپرد کردیجیے، میں حفاظت کرنے والا بھی ہوں اور علم بھی رکھتا ہوں۔''

۷- قرآن میں ہے کہ حضرت موسیٰؑ علیہ السلام کے خسر نے ان سے اپنے بارے میں فرمایا تھا:

سَتَجِدُنِیْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ ○ (القصص:۲۷)

''تم ان شاء اللہ مجھے نیک آدمی پاؤ گے۔''

---

(۱) بخاری: ۲۸۶۴، مسلم: ۱۷۷۶

(۲) مسلم: ۲۲۷۸

(۳) بخاری: ۲۴۱۲

(۴) بخاری: ۵۰۶۳

(۵) بخاری: ۱۹۶۵، ۱۹۶۶

۸- بلوائیوں نے جب حضرت عثمانؓ کے گھر کا محاصرہ کرلیا تو انھوں نے ان کے سامنے آکر فرمایا: ''کیا تمھیں معلوم نہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے جب غزوۂ تبوک کے موقع پر ارشاد فرمایا تھا کہ ''جو شخص جیش العسرۃ کو سامانِ جنگ فراہم کرے گا اس کے لیے جنت ہے''، تب میں نے لشکر اسلام کے لیے سامانِ جنگ فراہم کیے تھے؟ کیا تمھیں معلوم نہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے جب ایک موقع پر فرمایا تھا کہ ''جو شخص رومہ نامی کنویں کو خرید کر عام لوگوں کے لیے وقف کردے گا اس کے لیے جنت ہے،'' تب میں نے اسے خرید کر وقف کردیا تھا؟'' لوگوں نے جواب دیا: ''ہاں''۔ (۱)

۹- اہلِ کوفہ نے جب حضرت عمرؓ کی خدمت میں پہنچ کر حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کی شکایت کی کہ وہ ٹھیک سے نماز نہیں پڑھاتے ہیں تو عمرؓ نے تحقیقِ حال کے لیے انھیں طلب کیا۔ حضرت سعدؓ نے اس موقع پر فرمایا: ''مسلمانوں میں وہ پہلا شخص میں ہوں جس نے اللہ کے راستے میں تیر چلایا تھا۔ ہمیں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ غزوات میں بھی شرکت کرنے کا شرف حاصل رہا ہے۔'' (۲)

۱۰- حضرت علیؓ نے ایک موقع پر فرمایا: ''اللہ کی قسم! نبی ﷺ نے ایک بار مجھ سے فرمایا تھا کہ مجھ سے وہی شخص محبت کرے گا جو مومن ہوگا اور وہی شخص نفرت کرے گا جو منافق ہوگا۔'' (۳)

۱۱- حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے ایک موقع پر فرمایا: ''اللہ کی قسم! میں نے رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے سن کر ستّر (۷۰) سے زائد سورتیں یاد کی ہیں۔ اصحابِ رسول جانتے ہیں کہ میں کتاب اللہ کا سب سے زیادہ علم رکھنے والا ہوں، حالاں کہ میں ان میں بہتر نہیں ہوں۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ کسی شخص کے پاس مجھ سے زیادہ کتاب اللہ کا علم ہے تو میں ضرور اس کی خدمت میں حاضر ہوتا۔'' (۴)

۱۲- حضرت ابن عباسؓ سے کسی نے ایک مسئلہ پوچھا تو انھوں نے فرمایا: ''تم ایک واقف شخص کے پاس آئے ہو۔'' (ان کی مراد اپنی ذات تھی) (۵)

اس طرح کی احادیث و روایات بے شمار ہیں۔ انھیں اسی پر محمول کیا جائے گا جس کا تذکرہ اوپر آچکا ہے۔ (۶)

---

(۱) بخاری: ۲۷۷۸
(۲) بخاری: ۳۷۲۸، مسلم: ۲۹۶۶
(۳) مسلم: ۷۸
(۴) بخاری: ۵۰۰۰، مسلم: ۲۴۶۲
(۵) مسلم: ۱۳۲۵
(۶) الاذکار النوویۃ، دار الفکر للطباعۃ والنشر والتوزیع، بیروت ۱۹۹۴ء، جلد۲، ص ۸۹-۹۶